

چوناوے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

# ڈاٹجسٹ

کراچی

May 2018

قیمت - 70/- روپے



مئی 2018

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ  
ڈائجسٹ  
کراچی

جلد نمبر 19 شمارہ نمبر 8 مئی 2018ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینیجر ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت - 70/- روپے

سالانہ قیمت - 1500/- روپے



ادارہ کا کسی بھی راز کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات فیک نیٹ کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

## گھر بیٹھے ڈر ڈائجسٹ حاصل کریں

قارئین کرام! کیا آپ کو ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کہیں سے بھی نہیں مل رہا؟

اگر ایسا ہے تو ہم آپ کی سہولت کے لئے ان کو چند ضروری ہدایت بتاتے ہیں جن پر

عمل پیرا ہو کر آپ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ با آسانی خرید، یا منگوا سکتے ہیں۔

آپ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ بذریعہ وی، پی منگوا سکتے ہیں، وی پی منگوانے کا طریقہ کار آپ

کو فون پر بتا دیا جائے گا۔

آپ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بھی بن سکتے ہیں، ڈر ڈائجسٹ کی سالانہ

قیمت - 1500/- روپے ہے جسے آپ، ایزی پیس، یا پوسٹ آفس سے مٹی آرڈر کے ذریعے

ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ جس سے آپ کو ایک سال تک گھر بیٹھے ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ موصول ہوتا

رہے گا۔

ویسے تو ڈر ڈائجسٹ پاکستان کے ہر شہر میں جاتا ہے مگر پھر بھی اتنے بڑے ملک میں کوئی نہ

کوئی شہر چھوٹ جاتا ہے، اگر آپ کو اپنے شہر میں ڈر ڈائجسٹ موصول نہیں ہو رہا تو اپنے شہر کا

نام، اور اپنے قریبی بک اسٹال، یا ایجنٹ کا نام ہمارے دیئے گئے نمبر پر، یا بذریعہ خط ہمیں لکھ

کر بھیجیں ہم ان سے رابطہ کر کے انشاء اللہ آپ کی پریشانی کا ازالہ کریں گے۔

قارئین کرام ڈر ڈائجسٹ نہ ملنے کی صورت میں ہمارے نمبر پر رابطہ کریں۔

021-32744391

آپ ہمیں ای میل بھی کر سکتے ہیں — dardigest01@gmail.com

مٹی آرڈر بھیجنے کا پتہ:- ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ میزاناٹن فلور اردو بازار کراچی۔



147 مریم فاطمہ

آسیبی گھر

دل پر بستہ طاری کرتی اور خوف کے ہلنے میں  
بیکڑی حل میں نہ آنے والی ڈراؤنی کہانی

133 ڈاکٹر رانا ناصر شہزاد

آسیب کا سایہ

خوف و دہشت کے سمندر میں غوطہ زن  
نا قابل فراموش دہشت ناک کہانی

175 ناصر محمود فرہاد

صحرا گرد

لفظ لفظ اور سطر سطر... خوف و ہراس کے  
کریب میں... ٹوٹنے والی کہانی

152 محمد خالد شاہان

اسرار

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چمکناڑی  
گہ ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

203 رابعہ عباس

خونی درندہ

جنم و جاں پر بستہ طاری کرتی عجیب و  
غریب دل دہلائی ادا خبیثے میں ڈاؤنی کہانی

187 عمران قریشی

سویلی کی چمکا دڑیں

قسمت کا مارا اگر سات سمندر پار بھی جلا  
جائے تو سکون نہیں ملتا ایک سبق آموز کہانی

211 محمد رضوان قیوم

پراسرار کہانی

حرم و لاج کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل  
فراموش... دل گزرتے اور دل ہلکتے کہانی

207 صفدر علی

خون آشام

خوف کے افق پر چمکناڑی ہوئی... عجیب  
الغلت حلقوں کی ناقابل یقین کہانی

225 شانزہ اعوان

چڑیل کا بسیرا

ایک سرکش چڑیل کی سرکشی جس نے گھر  
والوں کو تک کر رکھا تھا... خیر الخیر کہانی

220 ادارہ

قوس قزح

قارئین کے پیسے گئے اشعار جنہیں قارئین  
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں...

234 شہنشاہ ادیان

بلیک آئی لینڈ

جنم و جاں پر چمکی طاری کرتی اور گلوں میں  
خون چھڑکتی خوفناک اور ہولناک کہانی

39 نینا خان

ناویدہ مخلوق

خودکوب سے زیادہ جلد بگنے والا اکثر  
باتھ مارا جاتا ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

18 ایس حبیب خان

پرانی شود

ایک معرور اور ناک پر چمکی نہ بیٹھے واسے  
خس کی جھرت ناک اور زبرد پر انعام کہانی

54 راشد نذیر طاہر

جان لیوا

ایک ناویدہ اور پراسرار سستی کی ہولناک  
رودادوں کی دھڑکنیں جھڑکنے والا سلسلہ

45 طارق محمود

سایہ

ایک روح کی چاہت غلوں اور دالہاں سے بھری  
کہانی جو کر پڑھنے والوں کو تک کر دے گی

89 مہر پرویز احمد دولو

آخری وقت

اچھائی بھلائی اور سستی بھی رانیاں نہیں  
جانی... حقیقت کہانی میں یہاں ہے

83 ایس امتیاز احمد

نیم شب

دوروں کو بے وقوف بگنے والا... خود پیدا  
بے وقوف ہوتا ہے... ایک حقیقی کہانی

107 احسان الحق

قاتل

ایک روح کی دیدہ دلیری کے اس نے اپنا  
انتقام لے کر چھوڑا... ایک حقیقی کہانی

95 فلک زاہد

شیطانی روح

حقیقت سے چشم پوشی کرنے والا... نہ مگر  
کارہا ہے... نہ لکھا کا سبق آموز کہانی

125 گلاب خان سولنگی

بھلائی کا صلہ

رات کے گہ ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے  
والی عجیب و غریب خیر الخیر اور جھرت الخیر کہانی

110 ملک حمید ارشد

اندھیرے اجالا

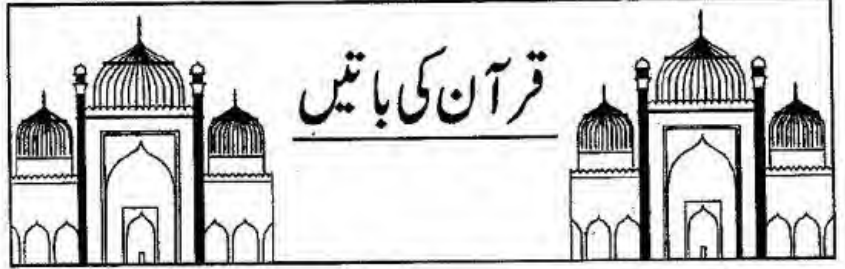
حقیقت سے روٹناں کرتی اپنی قومیت کی  
عجیب و غریب دل سے جھنڈے والی روداد

129 رشک نور

آسیبی پارلر

باتھ کو جھڑکتی نہ دے والے اندھیرے  
میں جنم لینے والی ڈراؤنی خوفناک کہانی

## قرآن کی باتیں



☆ اللہ نے کسی آدمی کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے اور نہ تمہاری عورتوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھے ہو تمہاری ماں بنایا اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمہارے من کی باتیں ہیں اور اللہ تو سچی بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا سادہ دکھاتا ہے مومنوں! لے پالکوں کو ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارا کرو کہ اللہ کے نزدیک یہی بات درست ہے۔ اگر تم کو ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو دین میں وہ تمہارے بھائی اور دوست ہیں اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو قصد دل سے کرو اس پر مواخذہ ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 4 سے 5)

☆ اگر تم عجیب بات سنی جا ہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں جو اپنے رب سے منکر ہوئے ہیں۔ اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور اہل دوزخ ہیں کہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ (سورۃ نعرہ 13 آیت 5)

☆ تمہارے لئے دریا کی چیزوں کا شکار اور ان کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے یعنی تمہارے اور مسافروں کے فائدے کے لئے اور جنگل کی چیزوں کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں تم پر حرام ہے اور اللہ جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے ڈرتے رہو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 96)

☆ یہ بات تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت حال تو معلوم ہو ہی چلی ہے تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ۔ پھر دونوں فریق اللہ سے دعا و التجا کریں اور جموں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ یہ تمام بیانات صحیح ہیں اور اللہ کی سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 60 سے 62)

☆ اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ، اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس نصرت پر ایمان رکھتے ہو جو حق و باطل میں فرق کرنے کے دن یعنی جنگ بدر میں جس دن دونوں فوجوں میں مد بھیڑ ہوئی، اپنے بندے محمد پر نازل فرمائی۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ انفال 8 آیت 41)

☆ اس دن کفر کے پیشوا اپنے پیروں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور دونوں عذاب الہی دیکھ لیں گے اور ان کے

آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے یہ حال دیکھ کر پیروی کرنے والے حسرت سے کہیں گے کہ اے کاش ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے بیزار ہوں۔ اس طرح اللہ ان کے اعمال حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 166 سے 167)

☆ ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینے سے بہت رہے اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لئے اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں یہ رات طلع صبح تک امان اور سلامتی ہے۔ (سورۃ قدر 97 آیت 1 سے 5)

☆ اور ہم نے لقمان کو داناتی بخشی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بھی بے نیاز ہے۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ شکر نہ کرنا شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔ (سورۃ لقمان 31 آیت 12 سے 13)

☆ اور جو لوگ اپنی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں، تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک وہ سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک یہ جھوٹا ہے اور پانچویں دفعہ یوں کہے کہ اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتیں مگر وہ صاحب کرم ہے اور یہ کہ اللہ تو بہ قول کرنے والا اور حکیم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 6 سے 10)

☆ مومنوں! اپنے گھروں کے سوا دوسرے لوگوں کے گھروں میں مکر والوں سے اجازت لئے اور ان کو سلام کے بغیر داخل نہ ہوا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور ہم یہ نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تم یاد رکھو اگر تم گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے اس وقت لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو۔ یہ تمہارے لئے بڑی پائیزی کی بات ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے ہاں اگر تم کسی ایسے مکان میں جاؤ جس میں کوئی بستا ہو اور اس میں تمہارا اسباب رکھا ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 27 سے 29)

☆ بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو دونوں میں سے ہر ایک کو سورے مارو۔ اور اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو شرع اللہ سے حکم میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔ اور چاہئے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو۔ (سورۃ نور 24 آیت 2)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکرِ شیعہ بک انجینی کراچی)



\_\_\_\_\_

☆ نیت صلیبہ یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ فوت کرا لیا ایک اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکامات کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ ہمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فکر نہیں بلکہ صرف اپنے منہ میں ایاں مٹھونے کی فکر ہے۔..... نیت صلیبہ تحریر ہے بی والا میرا گراف نکال دیا گیا ہے اس کے لئے معذرت۔ کیونکہ وطن عزیز میں تنقید برائے تنقید اور اختلاف برائے اختلاف کے لوگ ہیں اور ہر آدمی کی سوچ الگ الگ ہے۔.....

**E** **U** **S** **A** **N** **O** **V** **E** **R** **I** **T** **I** **O** **N**

\_\_\_\_\_

اپریل کو ساگر ہے میری کہانی شائع کر کے مجھے دو ہری خوشی دیں۔ آخر میں پاکستان زندہ باد۔

☆ ہر شک نور صبا: ساگر بہت بہت مبارک ہو اور اس خوشی میں کہانی "آسی پازل" شامل اشاعت ہے۔ آئندہ ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ کہانی لکھ کر پڑھایا کریں اور اس طرح کہانی کی تصحیح ہو جائے گی۔ امید ہے اس بات پر غور کریں گی ضرور۔

**مسز سندس اقبال** راولپنڈی سے، اپریل 2018 کا ڈر پڑھ کر ایک خاص خوشی کا احساس ہوا۔ خوشی کی وجہ یہ ہے کہ ایک جانب سرورق انجمنی معیاری اور شاعرانہ قوت ساتھ میں فورٹ رائٹر احسان الحق صاحب کی کہانی بھی شائع ہوئی۔ المیہ ایک ایسی کہانی ہے جسے میں نے نین مرتبہ پڑھا۔ کہانی میں ایک خاص کشش تھی۔ ایک خاص کششانی انداز میں لکھی یہ کہانی بہت کچھ کہانی ہے۔ بہت ہی زبردست۔ شاید بھائی اہمارا سب سے بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے من میں مقبوضہ رہتے ہیں۔ سیاستدان سے لے کر عام آدمی تک سب کا یہی عالم ہے۔ اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا ہی نہیں چاہتے۔ خوب سے خوب تر کھانا ہی نہیں چاہتے۔ عوامی رائے سب سے بڑی ہوتی ہے۔ کوئی بھی کردہ اپنی جماعت کی تحریف کرے تو یہ تحریف نہیں ہوتی۔ محض پردہ چھیننے کا ہوتا ہے۔ اس وقت وطن عزیز میں ہر شعبہ میں یہی روش ہے۔ Improvement کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ آئیں کی بددعا باث جاری ہے۔ شاید بھائی ایہ بات نہیں یہاں اس لئے عرض کر رہی ہوں کہ اپنے من میں مقبوضہ بذات خود ناکامی کی واضح دلیل ہے۔ احوال انسانی کی پسند کی کوئی پروردہ اترنے کی دلیل ہے اور اوپر سے شکوہ بھی ہے کہ جی میں کسی خاطر میں نہیں لاتے۔ کام کوئی بھی ہو، سیاست اور ریاستی امور سے لے کر ایک عام طالب علم کے پڑھنے تک۔ سب کام محنت کے منتقاض ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں وطن عزیز کا ہر رائے بھی شامل ہے۔ اپنی محنت اور کام سے ثابت کریں کہ آپ بحیثیت رائٹر اپنی کہانی کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم قارئین، عام لوگ یعنی پڑھنے والے، خود ہی سمجھ جائیں گے کہ رائٹر نے کیا لکھا ہے، کن الفاظ کے ساتھ اور کیا لکھا ہے۔ آپ کا کام ہی آپ کا نام بن جائے گا۔ پھر آپ ہمیں سے کسی کو بھی خود سانس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہی بات حکیم محمد سعید شید صاحب نے بھی اپنی زندگی میں کہی تھی۔ مٹی میں دو خوشیاں اور میٹیں گی۔ ایس حبیب خان صاحب اور فلک زاہد کی کہانیاں آ رہی ہیں۔ بس تیار ہو جائیں کہ درمیں خوب رونق پڑے والی ہے۔ سب کا کہناں لکھنے کا بہت شکر یہ اور سب کے لئے دعا میں کہ ساتھ۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔

☆ ہر شک نور صبا: آپ کی باتیں حقیقت پر ہیں، واقعی، مجھ سمیت ہر آدمی اپنے من میں مقبوضہ بناتا ہے۔ میں خود سے اونٹنی وطن عزیز سے تکی لگاؤ ہو گیا ہے اور غور طلب بات ہے کہ عمل سے زندگی جتنی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں بندوبست ہے نہ تباری ہے۔

**مسز فرحین حامد** رحیم یار خان سے، السلام علیکم ایلٹریٹر صاحب، ڈرڈائجٹ کا شمار اپریل 2018ء اس وقت ذریعہ ہے۔ ڈرڈائجٹ بہت خوش نما تھا۔ شہزاد احمد صاحب (ایبٹ آباد) کی بات کو کچھ آگے بڑھاتے ہوئے یہ انتہاء کروں گی کہ ڈرڈائجٹ سرورق کو مزید خوفناک بنائیں۔ کیونکہ یہ کوئی غیر معیاری انتہاء بھی نہیں ہے۔ خوفناک رسالے کا سرورق دیکھ کر خوف آنا چاہئے۔ چھٹکس۔ اس مرتبہ اپنے فورٹ رائٹر احسان الحق صاحب کی کہانی کو پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ سر احسان الحق ڈرڈائجٹ کے توسط سے میں ایک طویل عرصے سے آپ کے در پر دستک دے رہی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ کہانی کیوں نہیں لکھ رہے؟ پھر آپ کی محنت کی خرابی کا معلوم ہوا۔ دعاؤں کا ایک سمندر اپنے آنسوؤں کے ساتھ رعب کا نکت تک پہنچایا، آخر کار آپ کی جانب سے کہانی آگئی اور پڑھ کر جہاں دل خوش ہوا تو دوسری جانب المیہ عوم سے بھی آگئی ہوئی۔ ایک ایک سطر ملک کی صورت حال کی بالکل صحیح موکاسی کر رہی ہے اور جس انداز میں آپ نے کہانی کی صورت میں المیہ بیان کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اسے کہانی کے طور پر پیش کیا ہے، ایک تقریر بیٹے نہیں دیا۔ یہ آپ کا ہی خاصہ ہے، سر۔ ایسی دلچسپ، المیہ سے بھرپور، خواہ صورت، حقیقت پسندانہ کہانی لکھتے پر آپ کا بہت بہت شکر ہے۔ اور ڈرڈائجٹ کی مینٹنس کی بھی میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ دوسری کہانی جان لیوا پڑی جو کہ حسب معمول ایک بہترین اور لا جواب کہانی ہے۔ آخری کہانی بھی پڑھی جو کہ ختم کہانی تھی۔ پسند آئی، مزید کوشش کریں، آپ بہت اچھا لکھ سکتے ہیں۔ فلک زاہد اور ایس حبیب خان کی کہانیاں اس مرتبہ درمیں شائع ہو رہی ہیں۔ دل اور بھی خوشی سے سرشار ہے۔ اس مرتبہ کے لئے انتہائی۔ والسلام۔

☆ فرحین صاحب: بھتے فلک زاہد اور ایس حبیب صاحب کی کہانیاں شامل اشاعت ہیں خوش ہو جائیے، ناٹکل اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے بہت بہت شکر ہے۔ آئندہ مابقی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

**محمد اسلم جاوید** فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر دعائیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، جو نئی کام سے فارغ ہوا

اور شہر جانے کا اتفاق ہوا۔ جب بکشل پر پہنچا تو ماہ اپریل کے ڈرڈائجٹ سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ سرورق بڑے کمال کا تھا۔ پرچہ ملنے ہی دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ مثلاً خطوط قرآن کی باتیں، بوس قزح کے اشعار، غزلیں اور کہانیاں وغیرہ خوب سے خوب تر ہوتی ہیں۔ ہر ماہ مقررہ تاریخ پر ڈرڈائجٹ کا مجسٹ کا نہیں بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے خط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے سرشار ہو کے ہم آپ کو خط تحریر کرتے ہیں، اس بارغزلوں کا سلسلہ مختصر ساتھ جن کہانیوں نے متاثر کیا طوفانی رات، نیا گھر، اندھیرے سے اچالے تک، مجسٹ شاعر کا، اندھیرے کا سا فر و غیرہ ہے۔ تمام احباب کے خطوط پڑھ کے ڈرڈائجٹ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرچے کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ نئے نئے قلم کاروں کو اپنے پرچے میں جگہ دیتے ہیں بڑی مسرت کی بات ہے۔ میں شب و روز پرچے کی ترقی کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ اسلم صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، زندگی کوشش اور مسلسل کوشش کا نام ہے، یعنی دنیا ہے سکھ سے خالی، دکھ چاروں بھرا ہے، غم کے سوا یہاں پر سوچو کیا صرا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

**ایس امتیاز احمد** کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! اپریل کا شمار وقت سے پہلے مارکٹ میں آ گیا۔ جو کہ ایک اچھا اقدام اور آپ سب کی پر خلوص محنت کے باعث ممکن ہوا۔ دلفریب ناٹکل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ Stroy's اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا۔ لکھاریوں کے قلم نکھرتے جا رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ ذرا ایک خوب صورت میگزین ہوتا جا رہا ہے جو کہ قارئین اور لکھاری اور ریٹینجٹ کا خوب صورت اشتراک ہے۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ ڈرڈائجٹ تمام اسٹاف اور ڈرڈائجٹ کے خوب صورت لکھنے والے رائٹر اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دو پورڈ کو دعا سلام اپنا خیال رکھئے گا۔

☆ امتیاز صاحب: ارسال کردہ تحریریں شامل اشاعت ہیں اور مزید تحریریں موجود ہیں جو کہ آنے والے شمارے میں شامل اشاعت ہوں گی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ شکریہ۔

**محمد دانیال جونہ** روڈہ قتل سے، السلام علیکم! جناب انگل، جی آپ کیسے ہیں، امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش رکھے۔ سلامت رکھے اور لمبی عمر دے۔ ڈرڈائجٹ کے تمام قارئین رائٹر کو یہ رابر احمد اسلام قبول ہوا۔ اپریل کا شمار ایک خوفناک اور بھیا نک ناٹکل کے ساتھ 25 اپریل کو مل گیا۔ ناٹکل بہت ہی خوفناک اور بھیا نک تھا اور ساتھ ساتھ خوب صورت بھی تھا اس نے پورے شمار کو آٹھ جا لگا دیا ہے۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ ہر لحاظ سے اچھا اور سپر ہٹ تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت خوفناک اور بھیا نک تھیں۔ مجھے 5 دن رات کو سوتے وقت ڈرڈائجٹ رہا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور ہر لحاظ سے سپر ہٹ تھیں۔ اگر یہ کہوں کہ فلاں اچھی تھی فلاں بری تھی تو یہ بالکل نا انصافی اور زیادتی ہوگی۔ قوس قزح میں گیا تو دل خوشی سے دوبالا ہو گیا۔ سب غزلیں بہت بہت بہت سپر ہٹ تھیں۔ اپنی غزل دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں مزید ایک غزل اور شعر بھیج رہا ہوں۔ پلیز مٹی کے شمارے میں ضرور لگا دیے گا۔ اب تک کے لئے انتہائی زندگی نے وفا کی تو ابھی صفحات کے ساتھ آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈائجٹ کی دگر اور رات چوٹی ترقی کرے۔ آمین۔

☆ دانیال صاحب: خط لکھتے اور کہانیوں کی تحریف کے لئے اور آئندہ ماہ بھی پر خلوص تحریر کے لئے شکریہ قبول کریں، آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

**محمد حنیف شاکر** نذکن صاحب سے، سلام سنون کے بعد خیریت کا طالب خداوند قدوس کے فضل و کرم سے خیریت سے اور آپ کی خیریت کے لئے ہر وقت رب ذوالجلال سے دعا گو ہوں۔ جناب 22 مارچ کو ملتان سے گھر واپس پہنچا تو اپریل کا شمارہ میری آمد کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہوئی۔ غزل، شعر اور خط شائع کرنے پر بہت بہت شکر ہے۔ سرورق پر ڈرڈائجٹ کے ساتھ نیلی آنکھوں والی دوشیزہ بھی کچھ ڈری بھی بیٹھی ہے۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازگی کی خطوط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ جناب جب گل اداسی صاحب! احمد خالد صاحب! اور جناب ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب نے کاشی شامی کو پسند کیا۔ سب کا دل کی گہرائیوں سے شکر ہے اور کرتا ہوں خطوط میں سب نے اپنی اپنی رائے سے خوب انصاف کیا، لیکن ادارہ نے خطوط کے جو جوابات دیئے یہ سب خوب سے خوب تر ہیں۔ قوس قزح میں خوب رنگ نکھرے پڑھنے کو لے غزل کی دنیا میں قدم رکھا تو یہ کیا اس بار تو تمام غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک ایسے معلوم ہوا



جیسے انھوں نے منبر سے موتی بلکہ سچے موتی ایک ہی ملا میں پرو دیئے گئے ہوں کس کس کی تعریف کروں پھر ایس حبیب خان صاحب، رابعہ آفرین صاحبہ اور میرے پیارے عزیز ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب کی خزانوں نے دل کی دنیا کو اٹھل پھٹل کر دیا سب کو اچھی خبریں لکھنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ مہر پرویز دولوی کہانی نے بھی بہت متاثر کیا۔ الیہ میں احسان الحق صاحب نے ڈرائی کی بلکہ معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔ طبعیت ناساز رہنے کی بنا پر باقی کہانیوں کا مطالعہ نہیں کر سکا۔ جناب میں نے 20 مارچ کو ”سپر اسٹریٹ“ روانہ کی ہے جو بالکل سونفید حقیقت پر مبنی ہے اگر اچھی نگاہ سے قریب مشاہدات میں شامل کر لیں گے ”گوگنہ بہرائچ“ کو لائن میں لگانے کا شکریہ اسے بھی جلد ہی لائن سے نکال کر آگے لکھا دینا بیڑی مہربانی، آخر میں خوفناک کہانیاں رسالہ نکالنے کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ مثنوی ادھار رہی۔ زندگی راتی اور کراچی آنا ہوا تو ضرور صدمت دیں گے۔ آخر میں سب کو بہت بہت سلام۔

☆ حلیف صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھتے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے دیری دیری تھکیں، نئی کہانی موصول ہو چکی ہے، آنکھ دھارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔ شکریہ۔

**خضر حیات** روڈ قتل سے، السلام، حکیم پیارے انکل صاحب آپ کیسے ہیں۔ امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی قیمتی کوشش سلامت رکھے۔ اور نبی صمدی کے ذریعے سب دائرہ زوار قارئین کو مبارکباد سلام قبول ہو۔ ذکر پڑھنے اور دوکچا ہونے والوں کو بھی سلام قبول ہو۔ اپریل کا شمار ایک خوب صورت اور دلکش ماہ تھا۔ 22 مارچ کو مل گیا۔ بالکل بہت خوفناک اور عجیب ایک تھا اور ساتھ دلکش اور خوب صورت بھی تھا۔ بالکل ایک طرف اور شہرہ ایک طرف جب شہر کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شہر ہر لحاظ سے پیرہٹ تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست، اچھی عمدہ بھی تھیں اور ساتھ ساتھ خوفناک اور ہیرا پیک بھی تھیں۔ جو کہانیاں تھیں بہت بہت ہی عمدہ اور اچھی لگیں۔ ان میں سب کی سب شامل ہیں۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ قوس قزح میں گیا تو دل اور بھی خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ سب کے سب اشعار بہت ہی اچھے تھے اور ساتھ ساتھ غزلیں بھی پیرہٹ تھیں۔ اپنی غزل اور شعر دیکھ کر خوشی سے کیا ہوا کیا بتاؤں۔ باقی شہرہ ہر لحاظ سے پیرہٹ تھا۔ ڈرکی سب سے بڑی خاص بات یہ ہے کہ 25 سے پہلے پہلے جانا ہے۔ اس سے بڑی اور کیا خاص بات ہو سکتی ہے اب تک کے لئے اتنا ہی زندگی نے افادہ کیا تو آنکھ دھارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔ دعا ہے زور دہی اور سات چوکی ترقی کرے۔ آمین۔

☆ خضر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دل خوش ہوئی۔ آپ کے لئے بھی ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں سے نوازے اور کجی صحت عطا کرے، کہانیوں کی تعریف اور آنکھ دھارے بھی غلطیوں نامہ سال کرنے کے لئے دھیروں شکریہ قبول کریں۔

**مہر پرویز احمد دولو** میاں چنوں سے، السلام، حکیم اپریل 2018 کا ذکر دیکھ کر خوشی ہوئی، سرورق نے دل موہ لیا۔ ”قرآن کی باتیں“ میں ضرورت مندوں کی مدد پر زور دیا گیا اور نیکی بدی کی آگاہی ہوئی۔ خطوط میں محبتوں کے حاتمہ طائی حضرات پیار و محبت کے پھول بچھا کر دے نظر آئے۔ مجھے مسندس اقبال آپ کی شفقت کا بہت مشکور ہوں۔ مسز زینت خان بہت مہربانی اپنے چھوٹے بھائی کی حوصلہ افزائی کی۔ میرے محترم احسان الحق صاحب مجھے آپ کے تعریفی کلمات نے ہمیشہ کے آپ کا مقروض کر دیا ہے۔ آپ سینئر ادیب ہیں۔ میں تو آپ کی تحریروں پڑھ کر سینکڑوں کوشش کر رہا ہوں۔ میں آپ کی رہنمائی کا منتظر ہوں۔ شاید عظیم آپ کی چاہتوں کا ممنون ہوں۔ عامر شہزاد صاحب میں نے کسی دن آ جانا ہے پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی۔ جون میں چھٹیاں ہوتی ہیں۔ انشاء اللہ نکاح صاحب کی سیر کی کوشش کروں گا تھوڑا سا ایڈیٹر جس نے مجھ کو دعا دی ہے بہت شکریہ حوصلہ افزائی کا۔ جو تجربہ کسی ایوارڈ و فخریہ کے بارے میں بھی اس میں اقبال مگر کے حوالے سے میرا نام تیسرے نمبر پر تھا۔ میرا تعلق میاں چنوں سے ہے۔ اس تقریب میں مجھے کسی قسم کا کوئی ایوارڈ نہیں دیا گیا اور نہ ہی میں تیسرے درجے کا نکھار ہوں۔ خیر الحمد للہ پاکستان کے کبر و رسالوں میں عظیم ادیبوں کا تحقیق کردہ ادب پڑھتا ہوں اور رسالوں کے حوالے سے بے شمار لوگ مجھے قلبی لگاؤ سے یاد کرتے ہیں۔ الیہ میں احسان الحق صاحب ایک ہوس پرست ڈاکٹر کی بے خبری پر روشنی ڈال رہے تھے۔ جو محترمہ رحمان جتوئی کی طلب کردہ قربانی کی وضاحت کر رہے تھے۔ راجن کمار جی کی خوشیوں کے عوض اپنی عزت کا سورج روشن کر رہے تھے۔ پڑتے تھیں اور اس کی جتنی سربتا کی جی کا نام عالیہ پڑھ کر عجیب لگتا ہے خاص پاکستانی مسلمان لڑکیوں والا نام ہے۔ راجن شہزاد کی جان لیا ہوا تو قاسم ماموں کی جان ممانی کھر اور دو قہر سے بچا رہی ہے۔ ٹھیک کو خانہ بدوش شالا جی سے ہاتھ نہیں آگے پڑ چلے گا۔ رضوان قدوم رانی کی غلطی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ فدا میں وعدے کی ہاں تاحیات وہاں درج بن گئی۔ منوں بابا کا بھیجا کچن کرچن

عالم کی نفرت کا شکار ہو گیا۔ نیا گھر میں نیا خان ماموں کی خوشیوں پر روشنی ڈال رہی تھی۔ لیکن دگر تو عذاب کدہ بن گیا اس خاندان کے لئے پہلا دور استعارہ کے بارے میں ایک عالم صاحب کا خطاب دو ماہ قبل سنا ہے کہ سب سے افضل میلاد پانچ وقت کی نماز کی پابندی ہے اور آج کل خاتین کے میلاد کا طریقہ چل نکلا ہے۔ شراخت منع ہے۔ عورت کو تو گھر کے اندر پاؤں زور سے اٹھا کر چلنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اسفوس آج خاتین باگ باگ دل نبی اور پڑن پر محفل میلاد وغیرہ مرد حضرات کے سامنے پڑھ رہی ہیں اور آئے روز اس میں اضافہ اور ہے۔ استعارہ کے بارے میں حکم ہے دن کے کسی بھی کام کو ذہن میں رکھ کر دور کھٹل چڑھو۔ بعد میں فائدہ ہو تو وہ کام کر لیں۔ نقصان کی صورت میں ترک کر دو۔ قینا کسی بھی دوسرے شخص کا استعارہ درست نہیں ہوتا۔ ملک فیہر ارشاد اپنے اعزاز میں ہندو طما کو تبلیغ کر کے اسلام کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ طارق محمود بہت خوب صورت سبق دے رہے تھے، فرشتہ سیرت تفتیشی انسٹر نے برائی کے قلع قمع کے لئے ربانی کا پروانہ تھپایا۔ نسرن رانا، شہر خوشاں میں دلوں کے فیصلے تبدیل ہونے کی روداد بیان کر رہی تھیں۔ صبا کی نفرت بھی انتہائی تھی اور جاہت میں بھی مکمل کر دیا اور پایا۔ گناہ گلاب خان، سنگی تمام عوین کے واقعے کمال تھے لیکن یوڑ سے چوکیدار کی موت سمجھ نہ آئی۔ اسرار خالد شاہان کی بہت دلچسپ تحریر ہے۔ راج کمار کی اپنے وطن کی کج قسمت کے منہ میں چلی گئی۔ شریب جب نام کو مار کے تجھے چڑھا تو ایک بار خوف سے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ خونخوار جلی اسکول میں بچوں کی بیری کی رکھولی کر رہی تھی۔ فرخ خرم کوس اس لئے سبق تو سکھاتا تھا۔ ملک فرخ ندیم خوب تحریر لائے۔ شازہ عواں کی رانی نے حمید اور عارف کو موت سے ہٹا کر کر کے اپنی بے گناہی کا بدلہ لیا۔ مریم فاطمہ کی طوفانی رات اگرچہ نام نہانی تھی لیکن فردی کے پر اسرار ہونے کی ہو ہو کا پی تھی۔ ویران مندر کتنے ہی واقعات کا مرکز بھی تھے۔ معراج کہانیاں، گڑ کی ڈلی اور تیل گاڑی کمال کا منظر نگاری تھی۔ یہ خالص ہمارا دیہاتی کچھ ہے اور کتابوں میں بہت خوب صورت لگتا ہے۔ نمبر دار اور گاؤں والوں کا آفت کا بیچھا کرنا رشیدی اس سے شاہ بابا کا مندر کے چوڑے پر ٹیلوفر کے پھول رکھنا عجیب لگا۔ شاہ بابا تو مسلمان تھا مندر سے اس کا کیا تعلق؟ تمام کہانیاں اچھا جواب تھیں، چاہتوں کے اس میں ستاروں نے آسمان ادب کو چمکا رکھا تھا۔

☆ مہر پرویز صاحب: عزت دینے والی اللہ کی ذات ہے اور آپ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، ادب کے حوالے سے بے شمار لوگ آپ کو عزت کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور عزت دے۔ (آمین)

**مہد الجبار روسی انصاری** قصور سے، السلام، حکیم اقران جمید کے روشن موتی زندگی کے ہر لمحے کے لئے رشد و ہدایت کا باعث ہیں۔ اے کاش اللہ کے پیارے بندے بھی ان روشن موتیوں کو سمجھنے والے اور دلوں میں اتارنے والے بن جائیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ ملی کی بھی خبر نہیں۔ ایسے ہی میرے والد محترم بھی ہتھے سکر تے 10 فردی کی صبح ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور بلند درجات عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ مسز سندس اقبال کا جامع تبصرہ اچھا لگا۔ فلک زلہ یہ آئی بلا ٹھگئی۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ مسز زینت خان، ایس حبیب خان، رشک نور، احسان الحق، طارق محمود، ڈاکٹر عامر شہزاد، محمد اسلم جاوید اور مہر پرویز احمد دولو کے تبصرے زبردست رہے۔ اسی طرح قوس قزح اور غزل میں سمیرہ مہاس، محمد دانیال، الماس تنویر، رابعہ آفرین، اور محمد اسحاق، انجم کے شعر و غزل اچھی لگی۔ بختیں شکار نا اچھی کہانی تھی مگر اس میں شعر و شاعری اچھی لگی۔ کہانی میں صرف ایک آدھ شعر بول تو ٹھیک لگتا ہے۔ ورنہ کہانی کو کہانی ہی کی طرز پر لکھنا چاہئے۔ ایک نام کی طرح اسرار میں تو سننے سے اسرار دیکھنے کو ملے ہیں۔ سمندر کی عفریت سے جان چھوٹی تو راج کمار کی کوئی جیگلوں نے پکڑ لیا تو کوئی چال نا کام، ناکے شریب نے ربانی حاصل کی تو اب راج کمار کی خبر لینا ہے عمدہ کہانی۔ اندھیرے کے مسافر چھاپڑ کی سرگزشت بھی اچھی رہی جو انسانیت کے دشمنوں سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ گناہ گریلوے انٹینشن کی رتوں نے اور ہمارا گڑی نے یوڑ سے چوکیدار کو بھی زندگی سے نجات دلا دی۔ ایک دوسرے کو ڈرانے والے خود بھی عبرت انگیز تھے۔ کہانی اچھی لگی۔ جیون کا کوئی خوشحال نہیں کب اکٹھا جائے اس لئے اوپر والے حاصل اور عقل راست ہیں لینا چاہئے۔ برائی سے بچائی کی راہ پر لاتی عبداللہ، سنتوش، سانشی کا دیری اور دبیر جیسے انسانیت دوستوں کی خوب صورت کہانی بہت پسند آئی۔ ویران مندر کے عفریت نے تو گاؤں والوں کا جینا ہی حرام کر دیا۔ بھڑے اور کالے بے کے روپ میں سلطان نے کئی زندگیوں کا خون لپی لیا۔ آخر ان سب کے بڑے گرو سا جو پڑ بھیت لکھنے ہاتھ ڈالا اور اسے مار دیا۔ تب جا کر گاؤں والوں کو بھولتا ملی ورنہ ویران مندر کی جانب وہ بھی بھی نہیں جاسکتے۔ خوف دہشت سے بھر پور کہانی ویران مندر زبردست رہی۔

☆ مہد الجبار صاحب: آپ کے والد صاحب کا پڑھ کر دل بہت زیادہ دکھی ہوا کہ ایک شخص سالوں ساتھ رہتا ہے اور ایک لمحہ



بھی نہیں گلتا کہ وہ گھروالوں کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ خیر یہی نظام قدرت ہے۔ ہر شخص نے ایک دن جانا ہے۔۔۔۔۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور بل پل ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا رہے اور آپ تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

**ڈاکٹر رانا عامر شہزاد** نیکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، راسخز دیگر لکھنے والے اور قارئین السلام علیکم، 21 مارچ کو ڈیوٹی سے واپس پرٹی وی ٹی وی پر پڑنے والی خبر پر نظر پڑی جسے دیکھ کر دل تڑپا رہا تھا۔ ہوا گیا۔ فوراً سنا لگا اور اسے پڑنے لگا۔ ہر دفعہ ایڈیٹر صاحب اتنی جلدی اعزاز کی کا پی پیج پر میں تبدل سے آپ کا ممنون ہوں۔ اس بار سرورق واقعی بہت خوب صورت اور ڈراما ٹیکا ہیش کی طرح قرائی صفحہ پڑھ کر روح کو سکون ملا۔ شمارے میں اپنا لیٹر، شعر اور غزل دیکھ کر بہت خوش ہوئی، مگر کہانی شائع نہ ہونے پر واقعی دلی دکھ ہوا۔ جناب کے پاس میری دو کہانیاں (جو میں نے بہت لگن اور محنت سے لکھی تھیں) ایڈوانس پڑی ہوئی ہیں۔ مگر نچانے مجھے انتظار کی لمبی سولی پر کیوں لٹکایا جا رہا ہے؟ اس بار تھروں میں مسز سندس اقبال، فلک زاہد، رابعہ آفرین، مسز زینت خان، ایس حبیب خان، خدیجہ فاطمہ، مسز فرحان، حاتمہ، مریم فاطمہ، رشک نور، فاطمہ خان، محترم احسان الحق ہر دفعہ پر محمد حنیف شاکر اور خالد عباس نے عمدہ اور جامع تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں احسان الحق کی ”الیہ“ فاطمہ خان کی ”خوشی بُر“ ایس انیاز احمد کی ”پراسرار مخلوق“، نینا خان کی ”نیما گھر“ طارق محمود کی ”اندھیرے کا سفر“، نسreen رانا کی شہر خوشاں، شانزہ اعوان کی ”بے چین روح“، مریم فاطمہ کی ”طوفانی رات“ اور شہزاد خان کی ”دیران مندر“ ٹاپ اسٹور پر ثابت ہوئیں۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔ قوس فرخ میں ایس حبیب خان، سمیرہ عباس، حافظہ عادل، محمد حنیف شاکر، محمد اعظم اور مریم یوسف صاحب کے بہترین اشعار پڑھ کر خوشی ہوئی، غزل میں ایس حبیب خان، واید گدوئی، فلک زاہد، محمد حنیف شاکر، رابعہ آفرین، رشک نور اور خالد عباس نے اپنی کہانی کی غزلیں لکھیں۔ نیز ایس انیاز احمد کی ”یہ وقت“، فطیمہ ستاری ”خز“ ایس حبیب خان کی ”رزقِ مقدر“، نینا خان کی ”ایک حقیقت“ اور شرف الدین جیلانی کی ”گوہر آباد“ عمدہ اور بقیہ آموز تحریریں دل کھلیں۔ ماشاء اللہ تمام راسخز بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ انہی کے دم سے ”ڈر“ اپنے عروج تک پہنچ رہا ہے۔ فلک زاہد صاحب کے لئے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد از جلد صحت کا علاج فرمائے۔ تمام راسخز صاحبان سے میری عاجزی سے گزارش ہے کہ براہ مہربانی آپ کہانیوں کے علاوہ اشعار، غزل اور دیگر تحریریں بھی ضرور تبصرہ کیا کریں تاکہ نئے اے بھرتے ہوئے شعر اور راسخز کی بھی حوصلہ افزائی ہو آخروہ بھی ڈراما باقاعدہ ”حصہ“ ہیں۔ ایڈیٹر صاحب مجھے آپ سے ایک چھوٹا سا لگ رہا ہے۔ آپ میری کہانیاں شائع نہیں کر رہے۔ جناب آخر بندہ ناچنے سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ خیر میری دعا ہے کہ پاکستان کا نیشنل ڈراما ڈائجسٹ ”ہمیشہ ترنی کرتا رہے۔“ (آمین)

☆ **عامر شہزاد** صاحب: خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اگر آپ دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو دل سے یہی صدا آئے گی کہ زیادہ گلہ یا شکوہ ٹھیک نہیں، کیونکہ آپ کی کہانیاں سوا تر شائع ہو رہی ہیں اور اگر ایک ماہ کہانی شائع نہ ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، ہاں ضرور ہے کہ بڑی کہانی ان میں لگ کر انتظار کی سولی پر لٹک جاتی ہے۔ خوش ہو جائیے، کہانی شامل اشاعت ہے۔

**محمد قاسم** ہری پور سے، السلام علیکم، 25 مارچ کو یونیٹ سے واپس پر پڑنے ڈائجسٹ کے درشن ہوئے تو دل گل گلزار ہو گیا۔ ٹائٹل خوبصورت بھی تھا اور خوفناک بھی۔ ایڈیٹر صاحب آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریر کو شمارے میں جگہ دی۔ لاوارث جن زادی کے شائع ہونے کا بھی شدت سے منتظر ہوں۔ احسان الحق صاحب نے ہمیشہ بہت اچھا لکھا ہے اس مرتبہ المیہ بھی ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ فاطمہ خان اور ایس انیاز احمد کی کہانیاں بھی خوب تھیں۔ غصیبت روح باپ آف دی منٹھ رہی۔ نینا خان کی کہانی نیما گھر نے بھی متاثر کیا۔ سفاک کون، گمناہ، انکسٹین اور طوفانی رات بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ ویران مندر ایک نہایت خوفناک کہانی تھی۔ فاطمہ خان اور کہانیاں سر پٹ میں دوڑے جا رہی ہیں، ان میں کچھ تبدیلی آنی چاہیے۔ البتہ رولو کا کی آخری قسط ناپڑنے کا مال ہے، کیونکہ مجھے شمارہ نہ مل سکا۔ ساحل دعا بخاری ایڈیٹر عزیزہ زاہرہ کہاں غائب ہیں؟ ان سے بھی کوئی کہانی نکھوائیں۔ اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔

☆ **قاسم صاحب:**

**ربیعہ امجد** قصور سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب امید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے۔ میں کافی سالوں سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں لیکن کہانی پہلی بار بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس سے پہلے نئے افق ڈائجسٹ میں ہی لکھا ہے۔ اس کے

علاوہ پچھلے سال سائنڈ ڈائجسٹ کے تبصرے اور اکتوبر کے شمارے میں ”دو قسطوں پر مشتمل میرا ایک ناول آیا تھا۔ ڈر کے لیے یہ میری پہلی کہانی ہے امید ہے کہ میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ دعاؤں کی طلب گار ربیعہ امجد۔

☆ **ذریعہ صاحب:** ڈر ڈائجسٹ میں ویگم، کہانی آئندہ شمارے میں شائع ہوگی اور ہاں کہانی لکھنے کے بعد ایک مرتبہ پڑھ کر اصلاح کر لیا کریں۔ Thanks۔

**فرح انیس**، السلام علیکم جناب ایڈیٹر صاحب امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہونگے اور دعا ہے رب کائنات سے کہ وہ سب پر اپنا فضل و کرم رکھے (آمین) (میرا نام فرح انیس ہے کراچی سے میرا تعلق ہے، پچھلے تین سال سے دو ٹیڑھ اور بچی کہانیاں میں لکھ رہی ہوں، کچھ دنوں پہلے میری سترہ فلک زاہد سے بات ہوئی جو ڈر ڈائجسٹ کی لکھاری ہیں ان سے کافی آپ کے شمارے کی تعریف سنی، پہلی بار خریدنے کا اتفاق ہوا اور اندازہ ہوا کہ سترہ کی تعریف غلط نہیں۔ پھر کیا تھا ڈر کی کھل میں میں نے بھی ڈرتے ڈرتے پہلی حاضری لگا دی، پراسرار کہانیوں سے مجھے عشق ہے اور اب اس عشق کا اظہار ڈر کے شمارے میں ایک تحریر بھیج کر کر رہی ہوں اگلے ایڈیشن اللہ بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضری لگاؤں گی زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ ملاقات ہوگی اللہ حافظ۔

☆ **ذریعہ صاحب:** ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ بہت اچھا لگا، کہانی آئندہ ضرور شائع ہوگی۔ کہانی لکھنے کے بعد پڑھ کر فکیر کر لیا کریں تو اچھا ہوگا۔

**احسان الحق**، السلام علیکم محترم ایڈیٹر صاحبان، راسخز اور قارئین کرام! اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اپریل 2018ء کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کیونکہ سرورق سے حد متاثر کن ہے اور لکھنے والے تمام راسخز نے اس میں خوب لکھا۔ کہانیوں میں فاطمہ خان صاحبہ، ایس انیاز احمد صاحبہ، قاسم رحمان صاحبہ، رضوان قیوم صاحبہ، نینا خان صاحبہ، طارق محمود صاحبہ، محترمہ دو صاحبہ، نسreen رانا صاحبہ، گلہ خان لنگی صاحبہ، فطیمہ نیاز صاحبہ، فرخ ندیم صاحبہ، شانزہ اعوان صاحبہ، مریم فاطمہ صاحبہ سب نے خوب کاوش کی۔ جان لیوا کہ مصنف جناب راشد نذر بڑا صاحب نے اس مرتبہ پھر سے پڑھنے والوں کی جان دکھانے کا بیڑا اٹھایا اور اگلی قسط کا بے پناہ منتظر رہے، بہت زبردست لکھا۔ شہزاد خان صاحب کی کہانی بھی خوب رہی۔ اس کے علاوہ فلک زاہد صاحب کی علالت کی خبر پڑھ کر دل دعا گو ہے۔ ہماری بہن ایس حبیب خان صاحبہ کے لئے دعا گو ہوں، آپ کا بے حد شکریہ کہ اس مرتبہ آپ کی کہانی سے بڑھ کر ناچنے کے لئے دوسرا کوئی شخص نہیں ہوگا ڈر میں۔ دولو صاحب سے انتہا خاسرانا ہے کہ چھوٹی ہی تھی لیکن ہر ماہ مستقل ڈر میں کہانی ضرور لکھیں، شکر ہے۔ ڈر ڈائجسٹ کی مینجمنٹ اور ایم کا خاص شکریہ کہ رسالے کو بہترین انداز میں مزین کر کے قارئین اور راسخز کے سامنے لاتے ہیں، بہت شکریہ۔ اب اجازت دیجئے، والسلام و خیر اندیش۔

☆ **احسان صاحب:** مجھے جس کا انتظار تھا وہ شمارہ کار آ گیا۔ یعنی فلک زاہد اور ایس حبیب صاحب کی کہانیاں شامل اشاعت ہیں۔ اور اب تو امید ہے کہ قارئین کی پسندیدہ یہ دونوں راسخز اپنی اپنی کہانیاں ضرور ارسال کریں گی تاکہ انہیں پڑھنے والے خوش ہو سکیں گے۔ اور ہاں ہم اور قارئین آپ کی صحت کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کئی صحت عطا فرمائے۔

**عجب گل اداسی** ٹنڈوالہار سے، امید ہے کہ پوری ڈر ڈائجسٹ نیم اور اسٹرخرات خیر و عافیت سے ہوں گے۔ لیکن میں خیریت سے نہیں ہوں، کیوں کہ جو کہانیاں میں نے اپنے بچپن میں لکھی تھیں وہ میرا بڑا حباب آج تک ڈر میں نہیں لکھیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں جب بھی خط لکھتا ہوں تو صرف اسی موضوع پر لکھتا ہوں۔ تو پھر میں کیا کروں؟ اس موضوع سے میرا بیچھا چھوٹے تو میں کوئی دوسری بات چھیڑوں، ہر بار مجھ سے کہا جاتا ہے کہ دل مضبوط کریں آپ کی کہانی لگ جائے گی۔ دل مضبوط کو میں نے مضبوط کر کے پھر بنادیا پھر بھی کہانیاں نہیں لکھیں۔ اب آپ مجھے صاف صاف، سال مہینہ کا نام واضح بتائیں جس میں میری کہانی لگے گی۔

☆ **عجب گل صاحب:** آپ کا خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا، کیونکہ بچپن سے آپ کہانی لکھتے آ رہے ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ کہانی ابھی تک شائع نہیں ہوئی، بوسے بھی بچپن میں اور بڑھاپے کی سوچ اور شعور میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، دکھ تو مجھے بھی بہت ہے لیکن آپ نے بھی سوچا ہی نہیں کہ آپ کی کہانی کیوں شائع نہیں ہو رہی۔ ایک دو کہانی لکھ کر ہاتھ پر ہاتھ کر بیٹھ رہنا کیا یہ ٹھیک ہے، میں اکثر اور بار بار تمام نئے راسخزوں سے کہتا ہوں کہ جناب لکھتے لکھتے آدھی لکھاری بن جاتا ہے۔ اکثر نئے راسخزوں کی کہانی اصلاح نہیں بلکہ پوری کی پوری لکھی پڑ جاتی ہے۔ خیر آپ ان باتوں پر غور کیجئے گا اور ہاں میرا یہ پکا وعدہ ہے کہ آئندہ شمارے میں آپ کی کہانی شائع کر دی جائے گی۔ ☆ ☆

# پراتی شود

ایس حبیب خان - کراچی

چھن چھن کی زور دار آواز سنائی دی، اور پھر ایک عورت نما عفریت کی شکل نظر آئی اور پھر جب اس عفریت کا منہ کھلا تو نوجوان کی فلک شگاف چیخیں نکل گئیں کہ اتنے میں.....

ایک مفرور اور ناک پرکھی نہ بیٹھے والے شخص کی عبرت ناک اور لرزہ براندام کہانی



نے گاڑی موڑ لی۔

ہرش وردھن کا شمار دلش کی جانی مانی ہستیوں میں ہوتا تھا، اس کی جتنی اور بچے دلش سے باہر رہتے تھے۔ ہرش وردھن بے حد اپنکاری تھوڑیوں سے جتنا دینی وہ تھا دل سے وہ اتنا ہی چھوٹا تھا۔ اپنکار اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ غریب خانہ بدوشوں کو کپڑے مکڑے کی طرح سمجھتا تھا ان سے بات کرنا تو دور ان کے قریب سے گزرنا تک پسند نہیں کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ نہایت مجبور ہو کر اس طرف سے جانے پر راضی ہوا تھا۔ غریبوں کی بستی شروع ہونے سے پہلے ہی ہرش نے گویند سے گاڑی میں اس پرے کرنے کا کہا۔ بستی شروع ہوئی تو ہرش بھی اپنی گھڑی دیکھتا بھی موبائل وہ باہر کا منظر دیکھتا تک گوارا نہیں کر رہا تھا ایک دم گاڑی کے نیچے کوئی چیز آئی تو گاڑی نے جھپ کیا تو ہرش کا دھیان ہٹا اور اس نے بے اختیار باہر دیکھا باہر دیکھتا تھا کہ اس کے شیطانی دماغ میں کچھ آیا اس نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور ناک پر رد مال رکھ لیا اس کی اس حرکت پر گویند حیران ہو گیا۔

ہرش وردھن کا چھوٹے لوگوں کا دیدار کرنا؟ گویند کے دماغ میں نہیں سار ہوا تھا۔

”سور ایفٹ سائیڈ بند ہے اسی وجہ سے سارا ٹریفک ایک ہی جگہ آ گیا ہے، ہمیں سر کے آفس چکنے میں مزید آدھا گھنٹہ لگے گا۔“ ڈرائیور نے شیشے میں سے دیکھتے ہوئے پیچھے بیٹھے ہرش سے کہا۔

”شٹ آ“ ہرش نے سمجھلا کر ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا پھر کچھ سوچا اور بولا۔

”گویند! کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے، جس سے ہم تیز تر پہنچ سکیں؟“ گویند نے سوچا پھر بولا۔

”سرا شارٹ کٹ ہے پر تو.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”پر تو کیا.....؟“ ہرش نے پرسن کیا۔

”سرا وہاں سے گزرنا آپ کو اوجھٹ نہیں لگے گا وہاں پر زردھنوں کی جھوٹیڑیاں ہیں۔“ گویند کے کہنے پر ہرش کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ بولا۔

”تم نے ٹھیک کہا گویند وہاں سے گزرنا نہیں شوہا نہیں دیتا۔ پر اس سے وہاں پہنچنا ضروری ہے بہت اہم ڈیل ہے جو میں اور ہمیں آج سائن کرنے چاہے ہیں، پارٹی ڈیل کے فوراً بعد باہر چلی جائے گی اس کارن ہمیں وہاں (شارٹ کٹ) سے چلنا سونیکار ہے کیوں اسی سے کے لئے۔“ ہرش کے کہنے پر گویند



”سرائی پر اہلہ.....؟“ گویند سے رہنا نہ گیا تو اس نے پوچھا۔  
”پرائلم.....؟“ ہرش نے کہا اور قہقہہ لگایا۔  
”اس سنسار میں ایسی کوئی چیز ابھی پیدا ہوئی نہیں ہوئی ہے جو ہرش وردھن کے لئے پرائلم کری ایٹ کر پائے، ہرش وردھن خود اس سنسار کے لئے جب پرائلم ہے۔“ ہرش نے غرور سے کہا تو گویند خاموش ہو گیا۔

گاڑی کچھ ہی دیر میں جہین کے آفس پہنچ گئی۔  
”واؤ! ہم تو تریٹ پہنچ گئے۔“ ہرش نے کہا۔  
”نہیں سر! اس شارٹ کٹ سے آدھا سے لگتا ہے۔“ گویند نے بتایا تو ہرش نے سر ہلایا اور تیزی سے گھڑی دیکھتے ہوئے اندر چلا گیا۔  
جہین ہرش کا صرف بزنس پارٹنری نہیں بلکہ اس کے بچپن کا دوست بھی تھا اور ہرش اپنی ہریات، اپنا ہر معاملہ جہین سے فیکس کرتا تھا۔  
پچاس کروڑ کی ذیل سائن کرنے کے بعد ہرش اور جہین بہت خوش تھے اور فائیو اسٹار ہوٹل میں بیچ کر رہے تھے۔ ہرش کو ایک دم کچھ یاد آیا تو وہ جہین سے بولا۔

”جہین یہ جو تیرے آفس کے پیچھے زمین ہے جہاں جھونپڑیاں ہیں وہ کس کی ہے؟“  
”وہ خانہ بدوشوں کی ہے؟ وہ زمین تو گیتاجی کی ہے۔“ جہین نے عجیب سے سوپ کا سب لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہی کیڑے کوڑوں کی ہستی! مجھے اپنے راستے میں آنے والی اس جگہ سے صفایا چاہئے اور ویسے بھی وہ کافی کام کی زمین ہے اگر مجھے وہ مل جائے تو میں ان کیڑے کوڑوں کو صاف کر کے اپنے کام میں لے سکتا ہوں۔ کافی بڑی جگہ ہے ساتھ ہی میں اپنا نیا آفس وہیں بنواؤں گا تو میرا آفس تیرے بالکل قریب ہو جائے گا۔“ ہرش وردھن نے سوپ باؤل میں چچہ سمھاتے ہوئے کہا۔

”ہوں! وچا تو اچھا ہے مگر یہ سب گیتاجی پر زہر کرتا ہے کہ وہ یہ زمین ہمیں دیں گے یا نہیں۔“ جہین نے ٹنکن سے منصف کرتے ہوئے کہا۔  
”میں آج ہی گیتاجی سے بات کرتا ہوں۔“  
ہرش نے کہا ساتھ ہی ویٹر آگیا اور اپنی ٹائزر کے بعد بیچ سرو کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

مشینر گیتا بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور ملازم ٹرائی میں ناشتہ لے کر رہا تھا۔ مشینر گیتا سیدھے ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ان کا موبائل بجھا تو انہوں نے اسکرین دیکھی تو اس پر ہرش وردھن نکلا ہوا رہا تھا۔ انہوں نے کال ریسیدو کی۔

”تمھکار گیتاجی.....“ ہرش کی چپکتی آواز آئی۔  
”تمھکار! کوہنچی آج کیسے یاد کیا.....؟“

”گیتاجی! مجھے آپ سے ضروری کام تھا، وہ مجھے آپ کی زمین چاہئے تھی، میرے من کو بھانگی ہے اور میں اسے خریدنا چاہتا ہوں، اسی لئے آپ کو فون کیا ہے۔“ ہرش نے سیدی اپنی منوں کا منا گیتاجی کو بتادی۔  
مشینر گیتا کا شمار بھی ہرش کی طرح جانے مانے بزنس میٹوں میں ہوتا تھا کتھو وہ ہرش کی طرح کٹھنور دل اور مطلب پرست قطعی نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس بڑے ہی دیالو تھے اور یہ ہی کارکن تھا کہ ان کی کروڑوں کی زمین پر غریب اور خانہ بدوش رہ رہے تھے۔

”ارے ابھی ہرش تم کون سی زمین کی بات کر رہے ہو؟ اس شرم میں تو ہماری ان گنت زمینیں ہیں!“ گیتاجی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ جہین کمار کا آفس تو آپ نے دیکھا ہی ہے ناں اس کے پیچھے والی زمین کی بات کر رہا ہوں میں۔“ ہرش نے بتایا۔

”اچھا! اچھا! اس زمین کی بات کر رہے ہو۔ پرنتو ہرش شاکرنا وہ زمین میں نے خود بھی کسی پروجیکٹ کے لئے نہیں لی کیونکہ اس پر غریب لوگ رہ رہے ہیں۔ بے چاروں کے پاس کوئی گھر نہیں تھا مجھے دیا آئی تو میں نے

سب کو ہاں رہنے کی اومتی دے دی اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ زمین میں غریبوں کو ہی دان کر دوں گا پرا بھو کی کرپا سے میرے پاس بہت زمینیں ہیں اگر ایک کسی کے کام آ جائے تو اس سے بڑھتے کیا ہوگا۔“  
گیتاجی کی بات پر ہرش یوں اچھلا جیسے بچھونے ڈنک مارا ہو نفرت کی لہر سے جبر تک ہرش کے شریریش دوڑ گئی۔ پھر اس نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا۔

”کہاں کھوئے کھوئے ہو ہرش؟“ جہین نے نیبل بجا کر ہرش کو آواز دی جو کہ کافی دیر سے پیپر ویٹ سمھار رہا تھا اور نگاہیں سانسے فکس کر رکھی جہین کی آواز پر ہرش نے چوک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔

”کن خیالوں میں گم ہے؟“ ہرش نے جہین کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یاروہ گیتاجی کی زمین میں اٹکا ہوا ہوں میں اب تک۔“ ہرش کی بات سن کر جہین نے آرام سے کرسی سے ٹیک لگائی اور بولا۔

”نراش کیوں ہو رہا ہے؟ کوئی اور زمین دیکھ لے، زمینوں کی کمی تو ڈیڑی ہے۔“ ہرش نے کھومتے ہوئے پیپر ویٹ کو ہاتھ کر کر دیا اور بولا۔

”مجھے زمینوں کی کمی نہیں ہے جو چاہے لے لوں گا؟ بات یہ ہے کہ مجھے وہاں سے اس کنڈ کو صاف کرنا ہے کسی بھی قیمت پر، اور ویسے بھی ہرش وردھن کے من کو جو چیز بھاجائے وہ کیوں اسی کی ہوتی ہے۔“ ہرش کے انداز میں غرور صاف جھلک رہا تھا۔

”مگر میرے مٹر ہرش وردھن! مجھے شک ہے کہ اس سر جہتہاری پھتا ہزار شا میں نہ بدل جائے؟ کیونکہ میری گیتاجی کے ہر شکر سے بات ہوئی تھی، گیتاجی تین دن بعد انگلیڈ جا رہے ہیں اپنی ہارٹ سرجری کروانے اور وہاں وہ اپنی بیٹی کے پاس ہی رہیں گے اور واپسی چہ ماہ بعد ہوگی، اور اگر بھگوان کی اچھا سے گیتاجی پر لوک سدھار گئے تو پھر تمہاری تو چھٹی! اور اس سے بھی بڑی

سمسیا یہ کہ گیتاجی نے وہ زمین ان غریبوں کے نام کر دینی ہے۔“ جہین نے جبر کر کر سو کوڑے ہوئے کہا۔  
”تو ہے تو بچپن سے میرے ساتھ، پرنتو مجھے تو ابھی تک جان نہیں پایا ہے، ہرش وردھن ہوں میں، تین دن تو بہت ہیں اس سے پہلے وہ زمین میری ہوگی، ہرش وردھن کی۔“ ہرش نے اٹھ کر جہین کی مودہ ہوتی جبر کر دیتے ہوئے کہا تو جہین بھی مسکرانے لگا۔

☆.....☆.....☆

”آؤ بیٹھو ہرش!“ گیتاجی نے ہرش سے کہا اور خود بیڈ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”وہ شکر سے پتا چلا کہ آپ سرجری کے لئے انگلیڈ جا رہے ہیں تو میں نے سوچا آپ سے ملاقات کر لوں۔“ ہرش نے بناؤنی انداز سے کہا۔

”یہ تو تمہارا پریم ہے ہرش اور بتاؤ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“ گیتاجی نے پریم سے کہا۔

”بھگوان کی کرپا ہے، ویسے گیتاجی آپ نے مجھے وہ زمین نہیں دی، میں بہت نراش ہوا تھا آپ کا جواب سن کے۔“ ہرش نے کہا۔

”ہرش میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ زمین.....“ گیتاجی نے اپنی بات دہرائی۔

”آپ میری بات سمجھتے نہیں گیتاجی، پہلے آپ میری بات تو سن لیجئے، مجھے ان غریبوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ میں ان کے لئے کچھ کروں تو میں اس زمین پر ان کے لئے گھر اور آشرم بنانا چاہتا ہوں، ساتھ ان غریبوں کے سڑک پر پھرتے بچوں کے لئے انات آشرم جہاں وہ رہیں اور کھانپا سکیں اور چھوٹا موٹا کام بھی شروع کر دوں گا تاکہ وہ اپنے پر پیار والوں کے لئے چار پیسے کمائیں۔ اسی کارن میں وہ زمین لینا چاہ رہا تھا۔“ ہرش نے چال چلتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے ہرش پہلے بتانا تھا ناں! ابھی یہ تو بہت پنے کا کام ہے۔ ایسا کر دے یہ زمین یوں ہی رکھ لو، میں کل جہین زمین کے پیپر رجسٹر اداں گا۔“ گیتاجی نے خوشی سے کہا۔



”نہیں! گپتائی میں یہ زمین آپ سے خریدوں گا۔“ ہرش نے کہا۔

”کیوں، کیا تم مجھے اس پٹنے میں بھاگی دار نہیں بناؤ گے؟“ گپتاجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں گپتاجی؟ آپ جیسے دربادل اور دیالوش ہی کے کارن تو وہ درمن اسے سے اس زمین پر رہ رہے ہیں اسے درش آپ نے پٹنے ہی تو کیا ہے، اب یہ موقع مجھے دے دیجیے۔“ ہرش نے کہا۔

”پر تو ہرش.....“ گپتاجی نے کچھ کہنا چاہا مگر ہرش نے اٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تمام کر پیرا سے بھیج لئے تو گپتاجی سر ہلانے لگے۔ ہرش درمن نے گپتاجی کے گھر سے نکلے ہی اپنے چہرے سے مکاری کا کھوٹا اتار پھینکا اس کے منہ پر خشاک رقصا تھی کس طرح اس نے چال چل کر گپتاجی کی دمکی رگ پر ہاتھ رکھ کر ان کی بھادناؤ سے کھلو اذکر کے زمین لے لی تھی اس نے کامیاب چال چلی تھی اس وقت بھی زمین خریدنے کے پیچھے اس کے ساتھ گاڑی میں تھے مگر اس وقت وہ کیول گپتاجی کو چال میں اتارنے آیا تھا پھر اس نے شام کو زمین خریدنے کے پیچھے اور بلینک چیک گپتاجی کو بھجوا دیے۔

”یہ دیکھ رہا ہے ہمیں! کیا ہے یہ؟“ ہرش نے بلیک کلر کی فائل ہمیں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے یہ؟“ ہمیں کو ابھی کچھ بتائیں تھا۔

”یہ میری جیت کا پروانہ ہے! گپتاجی کی زمین کے پیچھے جو کہ اب میری ہو چکی ہے۔“ ہرش نے چپکے ہوئے کہا۔

”مان گئے! ہرش کہہ تو کتنا ٹھنکی مان ہے۔“ ہمیں نے کہا۔ تو ہرش نے گردن اڑا کر کہا۔

”ٹھنکی مان ہی نہیں بدی مان مگی۔“ پھر دونوں زور سے ہنسنے لگے۔

اسے میں ہرش کا موبائل بجا ہرش نے اسکرین دیکھی تو اس کا بزنس فرینڈ منیش تھا۔

”ہاں بولونش۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”یار ہرش! مجھے ساچا نہیں ہیں! میں ابھی اپنی وائف کے ساتھ اسپتال آیا تھا کہ میرے سامنے شکر، گپتاجی کو ابھر چکی میں یہاں لایا تھا، انہیں دل کا دورہ پڑا تھا، ڈاکٹر نے انہیں بچانے کی بہت کوشش کی پر تو ان کا دیہانت ہو گیا۔“

منیش کی بات سن کر ہرش کچھ منٹوں کے لئے بت بن گیا بھر بولا۔ ”اوہ! یہ تو بہت برا ہوا، بڑے ہی دیالو ہرش تھے گپتاجی، مجھے تو شواہد ہی نہیں ہو رہا ہے، ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو ان کا سیکریٹری مجھے پیپر دے کر گیا تھا ان کی زمین میں سے خرید لی ہے ناں۔“ ہرش نے جان بوجھ کر زمین خریدنے کا منیش کو بتایا کہ وہ سب کو بتائے کہ اب وہ زمین ہرش کی ہے تاکہ کل کو کوئی ارچن نہ آئے۔

”ہاں بھی کیا کر سکتے ہیں؟ تو سنسار کا نیم ہے کہ جو ہم لیتا ہے اسے مرتیہ آتی ہی ہے۔“ منیش نے کہا۔

”بھگوان ان کی آتما کو شانی دے۔“ ہرش نے کہا اور فون بند کر دیا ہرش نے ہمیں کو بتایا تو وہ بولا۔

”ہرش بہت ہی بھانجہ شالی ہے تو، اگر تھوڑا سا بھی سے نصف ہوتا تو مگی بھی زمین حیرے ہاتھ سے۔“ ہمیں کی بات پر ہرش ہنس کر بولا۔

”ہرش درمن کا بھانجہ، ہمیشہ روشن ہی رہتا ہے۔“ دونوں نے اس چیز کو بیزار میں جا کر سلیمینٹ کیا اور ہرش درمن نے پہلا پیگ سورگ باسی گپتاجی کے نام کر کے شروعات کی اور پھر ان کی پارٹی منج تک چلی۔

☆.....☆.....☆

کوشلیا کماری، اپنے پتر گوتم کی قتالی میں بھوجن پر دس رہی تھی کہ ایک دم اس کے کانوں میں شور پڑا۔ ”ہے رام! یہ شور کیسا ہے؟“ انہوں نے چونک کر کہا اسے میں گوتم دھونی سنجاتا ہوا چوکی آگے اپنی مار کر بیٹھ گیا۔ کوشلیا کماری نے چوکی پر چل بھر کھٹک رکھا اور قتالی لا کر کھدی جس میں ابلے چاول، کٹوری

میں دال اور ایک طرف ہری مرچ رکھی ہوئی تھیں۔

”گوتم یہ شور کیسا ہے؟“ انہوں نے پرسن کیا۔

”پتا نہیں ماں ٹھیک سے، پر تو کوئی بات تو اوشیہ ہے! میں منہ دھو رہا تھا تو کچھ دیکھتیوں کی آوازیں آرہی تھیں، کتھو میں سن نہیں پایا۔“ گوتم نے دال چاول کا نوالہ منہ میں رکھا اور ترنت بولا۔

”ماں! تنک تو ڈالا ہی نہیں تو نے۔“ کوشلیا کماری ساڑھی سنہلیاتی تنک کی برنی لائی اور تنک نکال کر قتالی کے کونے میں رکھ دیا۔

شور ایک دم حیر ہونے لگا تو کوشلیا کماری نے چشت انداز میں کہا۔ ”تو کھا! میں جرا دیکھ کر آتی ہوں باہر آخر ہو کیا رہا ہے؟“ پھر وہ جھکی ہوئی ساڑھی سنہلیاتی اپنے لکڑی کے ٹوٹے دروازے سے نکلی اور باہر موجود دونوں پٹیل دیوتاؤں کو شکا کر کیا، جن کے آگے سے وہ روز صفائی کرتی، انہیں جل چڑھاتی اور ان کی دیکھ رکھ کر تھی پھر وہ آگے بڑھ گئی، کوشلیا کماری اک درمن دودا تھی اور اس بھرے سنسار میں اس کی کیول ایک سندان تھی جو اس کے پاس تھی گوتم اس کا پتر کوشلیا کا پتی ایک راج مسز تھی اور جیون بھرو وقت کی روٹی کے لئے بھاگ دوڑ کر کے اس سنسار سے چلا گیا اور اب اس کی جگہ گوتم نے لے لی تھی۔ وہ تو بھلا ہو کوشلیا کے سر کا جٹھوں نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے پر یوار کے سر چھپانے کے واسطے سمجھتی میں یہ مکان چھوڑا تھا درنہ پتی کے دیہانت کے بعد کوشلیا کا جیون سڑکوں پر بیتا۔

جب وہ باہر مگی تو وہاں پوری بستی موجود تھی وہ بھی ان کی سمیائیں کران سے اسی دشنے میں بات چیت کرنے لگی۔

”مجھے تو یہ بات اوچت لگ رہی ہے کہ ہمیں روپے لے لینے چاہئیں۔“ نٹورلال نے کہا تو باقی بھی ہاں میں گردن ہلانے لگے۔

کوشلیا کماری نے کہا۔ ”کتھو! تم لوگ جاؤ گے کہاں؟ اسے تم سے میں گھر کہاں وضو صھو گے؟ زمین

کہاں سے آئے گی؟“

”کوشلیا دیدی! ابات تو تمہاری اوچت ہے پر تو ہمارے پاس اس سمیہیر تاکا کوئی دوسرا اپائے بھی تو نہیں ہے! کیوں یہ ہی راستہ ہے جس میں بتایا تو تھا کہ گپتاجی نے جسے زمین بیچی ہے اس مالک نے ہمیں روپے لے کر چندرہ روز میں یہ جگہ خالی کرنے کا آدیش دیا ہے۔“ نٹورلال نے چشت ہو کر کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے، ہمیں، پر تو یہ زمین تو گپتاجی نے بستی والوں کو دینے کا وجہ دیا تھا، تم جا کر بات کرو تاں شکر بٹاؤ۔“ کوشلیا کماری نے سمجھاؤ دیا۔

”بات تو تمہاری من کو لگ رہی ہے، ہم آج ہی شکر بٹاؤ اسے بات کریں گے۔“ تسلی داس جلدی سے بولا۔ پھر وہ سب مل کر گپتاجی کے گھر شکر سے ملنے گئے اور انہیں ہرش درمن کی چٹاؤنی کے بارے میں بتایا تو شکر نے دہریے سے ان کی بات سنی اور بولا۔

”یہ بات تو میری جانکاری میں تھی کہ میرے سورگ باسی پتاجی نے اپنے جیون میں ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ زمین وہ آپ لوگوں کو دے دیں گے پر تو! پھر ایسا کیا ہوا کہ انہوں نے اپنے فیصلے کے خلاف زمین ہرش درمن کے ہاتھوں بیچ دی اس مسئلے میں میری جانکاری بالکل بھی نہیں ہے ہاں میں ایسا کر سکتا ہوں کہ ہرش درمن سے بات کر کے یہ زمین اس سے دوبارہ خرید کر آپ لوگوں کو دے دوں گا۔

بھگوان کی بڑی کرپا ہے ہمارے پر یوار پر ہمارے روپوں کی کمی تھوڑی آئے گی اگر اس میں سے تھوڑا سا دھن آپ لوگوں کے کام آجائے تو کیا برا ہے؟“ سارے درمن شکر کی ہلا میں لینے لگے اور شکر گپتاجی کی آتما کی شانی کے لئے پراقتنا کرنے لگے وہ لوگ واپس چلے گئے۔

بہر حال ان کی سوچ کچھ ہی سے کی مہمان ثابت ہوئی شکر نے ہرش درمن سے بات کرنے کے بعد ان لوگوں کو بتا دیا کہ ”ہرش درمن نے صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ نہ تو یہ زمین بیچے گا اور نہ ہی اپنی دی

کئی چٹاؤنی سے پیچھے بٹے گا انتہائی نہیں اگر چند روز گزر گئے تو پھر زبردستی وہ جگہ خالی کروائے گا۔“ فخر کی بات سن کر ان لوگوں کی آس خراشاں بدل گئی۔

”ارے بھیا اتنی مہنگائی کے دور میں، اتنے تھوڑے روپوں میں تو کچھ نہ ہو پائے گا! میں کہاں جاؤں گا اپنے ربوہ کو لے کر اب تو میری کنیا بھی دودا ہو رہی ہے۔“ ہنسی داس نے سر ہل کر کہا۔

”ارے بھیا! کیوں چتا کرتے ہو، وہ جو پالن ہار ہے ناں وہ ضرور سہاگیا کرے گا، تم دیکھا۔“ کوشلیا بولی۔

”کاش چتا نہ کریں؟ ہم تو کھلے آکاش تلے آگے ہیں ہاں تمہارے لئے تو چتا کی کوئی بات نہیں ہے ناں کوشلیا بہن، تمہارا تو اپنا گھر ہے ناں اپنی زمین ہے ہر ش دروہن کی زمین کی سیما سہاوت ہو جانے کے بعد تمہاری زمین ہے تو تمہارے لئے تو کوئی سیما ہی نہیں ہے۔“ گھنٹھام نے شک کر کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو گھنٹھام بھیا؟ تمہاری اور میری سیما سا بھی ہے مجھے بھی انتہائی دکھ ہے جتنا تمہیں ہے، ہم کل بڑے مندر میں جا کر پراختا کریں گے۔ بھگوان جروہ سہاگیا کرے گا۔“ کوشلیا کماری نے کہا تو سب لوگوں نے ایک ساتھ ہاں کی اور پھر اگلے روز وہ سب بڑے مندر گئے اور بچاری جی کے ساتھ مل کر پوجا کی۔

بھگوان نے ان کے سچ من سے کی پوجا پر اتنا سونکار کی اور تین دن بعد فخر نے انہیں بلاوا بھیجا وہ سب فخر کے پاس گئے تو اس نے کہا۔

”میرے پتانے اپنے جیون میں آپ کو یوں نہیں چھوڑا کہ بے یار و مددگار پھریں تو میں اپنے پتا کے اس کارپہ کو بے کار کیسے ہونے دے سکتا ہوں؟ آپ سب ہر ش دروہن سے روپے لے کر وہ زمین خالی کر دیں میں اپنے نئے پردیکٹ کی زمین آپ لوگوں کو دے رہا ہوں آپ لوگ وہاں رہ لیں آپ کے گھر بھی میں بنوا دوں گا۔ روپے آپ لوگ اپنے

پاس رکھ لیجیے گا بس اپنی پراختاؤں میں میرے سورگ پاسی پتا جی کو یاد رکھیے گا۔“ سب خوشی سے ناچنے لگے گھنٹھام کوشلیا کماری سے ہاتھ جوڑ کر شامائی کہ اس روز میں نے بڑی ٹھوڑا سے بات کی تھی۔“ کوشلیا کماری مسکرا کر بولی۔

”ارے چھوڑیے ناں گھنٹھام بھیا! اتھ بھلا تو سب بھلا۔“

کوشلیا کماری نے سور یو دیو کو شکار کیا، پھیل دیو کو جل چڑھایا اور سارے میں آرتی کر کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو گئی اس کے تین دور تک پھیلی دیرانی کو دیکھ کر تیر بہانے لگے۔ سارے بستی والے کب کے جا چکے تھے اس نے ساڑھی کے پلو سے تیر صاف کئے اور اندر چلی آئی گوتم اشان کر رہا تھا۔ کوشلیا کماری نے دروازہ بند کر کے رسوئی گھر کی اور قدم بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے کسی نے دروازہ پینا دھڑا دھڑا اور کوشلیا نے آرتی کی تھالی ایک طرف رکھی اور دروازہ کھولنے جاتے ہوئے بولی۔

”کون؟“ پھر دروازہ کھولا تو سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے۔

”یہ مکان تمہارا ہے۔“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”ہاں میرا ہے۔ پرنتو کیوں پوچھ رہے ہو یہ؟“ کوشلیا نے کہا۔

”اس گھر کو خالی کر دو۔“ اس آدمی نے کہا۔

”بدمی بھر شٹ ہو گئی ہے کیا تمہاری؟ تمہارے باپ کا مکان ہے جو خالی کر دوں تمہارے کہنے پر۔“ کوشلیا کماری نے کہا۔

”یہ ہمارے صاحب کا حکم ہے!“ دوسرے بندے نے کہا۔

”تیرا مالک کیا بھگوان ہے جو اس کی آگیا کا پالن کروں؟“ کوشلیا کماری نے غصے سے کہا۔

”تو ابھی جانتی نہیں ہے ہمارے مالک کو تپ ہی اتنی اکڑ دکھا رہی ہے بڑھیا اس سے پہلے کہ تیری

شامت آئے سیدی طرح سے یہ مکان خالی کر دے ابدے میں دوگنی قیمت ملے گی۔“ انجی میں سے ایک اور نے کہا۔

”چلتے پھرتے نظر آؤ یہاں سے اور ہاں جا کر کھد دینا اپنے مالک سے کہ کوشلیا کماری بھی اپنا مکان نہیں خالی کرے گی۔ یہ اس کی نہیں، میری زمین ہے۔“ کوشلیا کماری نے مضبوط لہجے میں کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

☆.....☆.....☆

ہر ش دروہن کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ ”اس دو کوڑی کی بڑھیا کی اتنی مجال کہ ہر ش دروہن کو سچ کرے! اتنے تو میں دیکھ لوں گا تیرا وہ کاٹھ کبار میرے شاندار پردیکٹ کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ہے جسے مٹانا بہت ضروری ہے کرتا ہوں تیرا کچھ!“ ہر ش دروہن نے چیخ کر کھماتے ہوئے کہا تو جینن نے اسے شانت رہنے کا کہا اور بولا۔

”بڑھیا کو چھوڑ اس کے بیٹے کو چال میں پھانستے ہیں نیا خون ہے لالچ میں آئے گا آدھے آئے گا۔“ تو ہر ش منہ پٹانے لگا۔

پھر جینن نے گوتم کو بلوایا اور اس سے کہا۔ ”دیکھو! تمہاری ماما تو ہو گئی ہیں بوڑھی اور اپنا پورا جیون جی چکی ہیں پر تمہیں تو ابھی جیون شروع کرنا ہے اپنا ربوہ بنانا ہے کیا سارا جیون راج مستری ہی رہو گے اپنا مستقبل بننا۔“

پرنتو گوتم نے صاف انکار کر دیا یہ کہہ کر ”یہ مکان اس کے پتا کی نشانی ہے اور ہم یہ مکان بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ جینن نے اس کا جواب سن کر اسے آفر دی کہ ”مکان ان سے تین گنا بر قیمت خریدیں گے، نیا اچھا مکان بنوا دیں گے اور گوتم کو کہیں اچھی جگہ پر کام دلوائیں گے۔“

گوتم اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”مجھے سے دیکھتے ہیں اپنی ماما سے پوچھ کر بتانا ہوں۔“ گوتم نے ساری کٹھا جا کر کوشلیا کماری کو سنائی

تو اس نے کہا کہ ”وہ اپنا نرنے لے چکی ہے اور اپنی اہم سانس تک اس پر قائم رہے گی۔“

گوتم نے جینن کو اپنی ماما کی اور سے اتر دے دیا جو اس نے ہر ش تک پہنچا دیا ہر ش کے اندر ایک انجی جل اٹھی جو اس کے دماغ کو کھول رہی تھی وہ جینن ہر ش دروہن دھرتی پر دیکھنے والے کیڑے گردان رہا تھا انجی کیڑے کوڑوں نے اس کے سوال پر اسے اپنے دو وار سے دھچکا دیا تھا۔ ہر ش نے کال ملائی اور آرڈر دیا کہ ”کل کام شروع کرو تو سورج نکلنے ہی شروع کرنا۔“ اور فون کاٹ دیا۔

سورج نکل آیا گوتم اور کوشلیا ابھی سو رہے تھے آج کوشلیا کماری کی آنکھ ابھی تک کھلی نہیں تھی ایک دم گڑگڑاہٹ کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا جس سے کوشلیا کماری اچھل پڑی اس نے آنکھ کھولی تو اسے کچھ بھی نہ دکھائی دیا اٹا اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگی اور اس کا سانس کھٹکے لگا پھر اسے زوردار کھانسی آئی جو کہنے کا نام نہ لے رہی تھی کافی دیر گزرنے کے بعد وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوئی تو ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا دھواں مٹی اڑ رہی تھی کوشلیا نے گوتم کو آواز دی مگر اس کی آواز باہر ہوئی گڑگڑاہٹ میں دب گئی کوشلیا کماری نے ہمت جمع کی اور ٹوٹتی ہوئی انجی اس نے آنکھیں مل کر چاروں اور دیکھا تو اسے نظر آیا کہ اس کے گھر کی ایک طرف کی دیوار گر گئی تھی پھر اسے اس دیوار کے لیے تلے گوتم کی دھرتی نظر آئی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”گوتم!.....!“ وہ گرتی پڑتی وہاں پہنچی اور اسے پتھر مٹا کر ٹکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر پتھر اتنے بڑے تھے کہ اس بڑھیا سے مل بھی نہ پارے تھے وہ چیخ چیخ کر گوتم کو پکار رہی تھی پھر وہ باہر آئی اس کے گھر کے سامنے ایک بہت بڑی مشین کھڑی تھی، دیواریں گر رہی تھیں، کوشلیا نے چیخ کر اس مشین چلانے والے کو آواز دیں دیں کٹھو مشین کے شور میں وہ سن بھی نہیں رہا تھا کوشلیا روتے ہوئے

سر پہ کر دھرتی پر بیٹھ گئی پھر اس نے نیچے پڑے پتھروں میں سے ایک بڑا پتھر اٹھا کر مشین کے شیشے پر مارا تو اس میں بیٹھا شخص چونک کر اس طرف دیکھنے لگا کوشلیا رورور کر ہاتھ ہلا رہی تھی اسے دیکھ کر اس شخص نے مشین بند کیا اور اتر کر نیچے آ گیا اسے دیکھ کر کوشلیا پاگلوں کی طرح چیختی۔ ”اے اودہ آنکھوں کے اندھے یہ اتنا بڑا مکان تجھے نظر نہیں آیا جو تو اسے توڑ رہا ہے؟“

تو وہ شخص بولا۔ ”شاکرنا! ماتاجی! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مکان نہیں گراتا ہے۔“

کوشلیا روئے جاری تھی۔ ”ناس پیٹے مکان پر نہیں تو نے میرے کیلچے پر یہ مشین چلائی ہے میرے کیلچے کا ٹکرا اس بلبے تلے دبا ہوا ہے نکال اسے چل جلدی۔“ کوشلیا پاگلوں کی طرح چی رہی تھی۔

”ہے رام! یہ تو کھور پاپ ہو گیا مجھ سے! ماتاجی اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ خالی ہستی گرائی ہے کتنے مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس مکان میں جیوت لوگ رہتے ہیں، یہ تو اترتھ ہو گیا رام! رام!“

اور پھر بھاگ کر اور لوگوں کو بلایا کر لے آیا اور پھر ان سب نے مل کر گوتم کو بلے سے نکالا گوتم بری طرح سے گھاس تھا اس کی سانسیں چل رہی تھیں اسے اسپتال لے جایا گیا مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آسمانے اس کا جسم چھوڑ دیا۔

کوشلیا کماری کو جب یہ باچار ملے کہ گوتم جیوت نہیں ہے تو وہ اپنا نانسک سنوٹن کو بیٹھی اور سرخوں پر دوڑ پڑی۔ اس کے پرانے ہستی والوں نے اسے ”پاکل خانے“ میں بھرتی کر دیا۔

ہرش وردھن نے لوہا گرم دیکھ کر اس پر چوٹ ماری اور سرکار سے کوشلیا کا گھر دو گنی قیمت پر خرید کر روپے اس کے نام سے بینک میں کھانا کھول کر جمع کرادیے اور خود اپنے ذمہ اس کے علاج کا خرچہ لے لیا اور سارے سانج کی نظروں میں اہان بن گیا۔

کٹھ! ہرش وردھن کے منہ پر چڑھے مھوٹے کے پیچھے موجود بھیا تک چہرے کو کوئی بھی نہیں دیکھ

پارہا تھا۔ ان مزدوروں سے نفرت رکھنے والے ہرش وردھن نے کیول اپنی انا اور غرور کے کارن جان بوجھ کر کوشلیا کا مکان تروایا تھا جس میں اس کے بیٹے کی سرپرستی ہوئی تھی اور خود کوشلیا اپنا نانسک سنوٹن کھو بیٹھی تھی ہرش کی یہ چال کسی کے علم میں نہ تھی اس نے جان بوجھ کر ریمیکو والوں کو اس بات سے انجان رکھا کہ یہ مکان اس کی زمین کا حصہ نہیں ہے اور یوں ہرش کی راہ کے سارے کانٹے صاف ہو گئے اور زمین اس کے ہاتھ آ گئی۔

☆.....☆.....☆

ہرش آج سائٹ پر کام دیکھنے آیا تھا سارے مکان گرا کر زمین صاف کی جا چکی تھی تمام لمبا ٹھہ چکا تھا اب وہاں پٹیل میدان تھا سوائے پٹیل کے درختوں کے ہرش کی نگاہ ان پر پڑی تو اس کا منہ بن گیا اس نے مزدوروں کو بلایا سارے مزدور شرامک، کچھ دھاراک و چاروں کے سنے انہوں نے جان کر درختوں کو نہیں کاٹا تھا۔

ہرش بولا۔ ”ان کو کیا میرے سواکت کے لئے کھڑا چھوڑ رکھا ہے؟ گراؤ انہیں اسی وقت۔“ اس کی بات سن کر مزدور بولے۔

”صاحب جی اور شل پرانے درخت ہیں ان کو یوں نہیں کاٹنے پوجا کرنی پڑتی ہے پہلے۔“ ان کا کہنا تھا کہ ہرش زور سے دھاڑا۔

”واٹ نان سنس! اسے ٹھٹ کرنے کے بجائے ترنت انہیں گراؤ میرے سامنے! اسی سے۔“

اس کا کہنا تھا کہ سارے مزدور مشین کی طرح حرکت میں آ گئے اور اپنے اوزار سنبھالنے لگے اتنے میں ہرش کی فون پر ایک کال آئی تو وہ آگے بڑھ کر اینڈ کرنے لگا اس کے آگے جاتے ہی ان مزدوروں نے اپنے گلے میں پڑی کالاؤں کو تھا اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا پھر بولے۔

”اپنی سورت کھٹا تو کر لی اس کا بھگوان جانے۔“ ان کا اشارہ ہرش کی اور تھا ہرش بات کر کے

واپس آ رہا تھا تمام مزدور نے مل کر دونوں درخت اکھاڑ دیے۔

”تم سب ابھی اسی سے یہاں سے دفع ہو جاؤ اور جا کر کسی مندر میں پوجا پاٹ کرو۔“ ہرش نے ان سے کہا۔

”شاکرنا صاحب..... وہ.....“ انہوں نے کہنا چاہا مگر ہرش نے ان کی بات سچ میں کاٹ دی اور چلا کر کہا۔

”جسٹ گیٹ لوسٹ۔“ اور وہاں سے پھلا گیا۔

ہشمن نے ان مزدوروں کا انتظام کر دیا اور ہرش کو کھدہ نہ کرنے کا کہا۔

کنسٹرکشن شروع ہوئی تو سب سے پہلے ہرش کے عارضی آفس کے لئے روم بنایا جانے لگا بعد میں وہ اپنا آفس ٹاپ فلور پر شفٹ کرنے والا تھا رات کام ختم کر کے مزدور گھر چلے گئے تھے۔

اگلی صبح جب وہ سب واپس سائٹ پر پہنچے تو حیران رہ گئے وہ سب اس انجینے میں تھے؟ باؤنڈری وال کے باہر کچھ جیسا کالا سیال گھٹنوں تک کھڑا تھا جبکہ مین گیٹ پر تالا پڑا تھا کسی منش کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا ہشمن کو انعام کیا گیا تو اس نے تالا توڑ دیے کا کہا کچھ مزدور تالا توڑ کر اندر گئے تو وہ کمر تک کچھ نماسیال میں جھنس گئے۔

آخر یہ سب ایک رات میں آ کہاں سے گیا؟ کل تک تو کچھ بھی نہ تھا! یہ ایک ایسا سوال تھا جو سب ایک دوسرے سے کر رہے تھے۔ ہشمن بھی پہنچ گیا پر نتو کار کمان کی کبھی سمجھ نہ آیا۔

پھر مشینری کے ذریعے سارا سیال صاف کر دیا گیا مشین چل رہی تھی کہ ایک دم اٹک گئی مزدور مگھے اور مشین چیک کی جو چیز اٹک رہی تھی اسے صاف کیا گیا تو سب کو سانس سونگھ گیا وہ واضح میں کی لاش تھی۔

ہرش کے علم میں سارا ماجرا آیا تو اس نے بجائے ہٹنے ہونے کے ہشمن کو آڑ دیا کہ ”معامہ پیسے دے کر دفن کرو اور ہاں کام کسی بھی طرح رکنا نہیں

چاہئے۔“

انہر کے سارے کام آل موسٹ کمپلیٹ ہو چکے ہیں میں ابھی یہیں ہوں تو بھی دیکھ لے۔“ ہشمن نے ہرش سے کہا۔

”ٹھیک ہے میٹنگ ختم کرنے کے بعد آ جائیں گے۔“ ہرش نے ہشمن سے پروگرام طے کیا تو ہشمن وہاں سے نکل گیا ہشمن اور ہرش کی میٹنگ ختم ہوئی تو بارہ بیٹے والے تھے وہ لوگ نئے آفس پہنچ گئے انہوں نے جیسے ہی آفس کا دروازہ کھولا تو وہ صدمہ کھٹک گئے کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا کمرے کے کپڑوں سچ جہاں ہرش کی چیز اور ٹیبل رکھی تھی اس ٹیبل کے نیچے سے ایک موٹی درخت کی شاخ زمین پھاڑ کر ٹیبل کی رخ کے دو ٹکڑے کرتی ہوئی نکل کر کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

دونوں ہونٹوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے ہشمن کا تو یہ عالم تھا کہ کال تو تو لہو نہیں کیونکہ آج دوپہر کو تو اس نے اسی آفس میں کھڑے ہو کر ہرش سے بات کی تھی۔

”شٹ! ہرش نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا معاملہ ہے؟“ ہشمن نے اپنے آپ سے کہا ہرش نے چی کر چوکیدار کو بلوایا۔ اس کے لئے بھی یہ سب حیران کن تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ ہرش نے غصے سے کہا۔

”سروہ.....“ چوکیدار حیرت اور خوف کی ملی جلی استعجلی میں تھا اس کے منہ سے لفظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

”ہو سکتا ہے سر کہ جو درخت کاٹے گئے تھے ان کی جڑیں زمین کے اندر رہ گئی ہوں اور اب باہر نکل آئی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”شٹ پورا ماتھ یو ایلیٹ!“

”درخت کی جڑ سے یا آتش فشاں جو دھرتی چر دے اور باہر نکل آئے تم سب ہوئی نکلے بلاؤ مزدوروں کو اور اسے اکھاڑ پھینکو۔“ ہرش نے اسے جھاڑا



ہاں ہاں ایاد ہے، پہلے اس منجھٹ سے تو کل اؤں پہلی منزل کرنے کے، یار جین اس پر جیکٹ میں تو نقصان پہ نقصان ہو رہا ہے اور اس کارن میں دوسرے پر دیکھیں پر بھی دھیان میں دے پار ہاں..... روز ایک ناکھاشہ ہوتا ہے۔

جین نے اس کی بات سن کر اسے تلی دی اور کہا۔ ”اچھا چل چھوڑا لکھ مند نہ ہو، ابھی تو میٹنگ پر دھیان دے۔“ پھر دونوں نے میٹنگ اینڈ کی اور پھر ایک کینے میں بیٹھ کر کافی پی کر کپ شپ کرنے لگے۔

”اب تھوڑا ریلیکس شل کر رہا ہوں۔“ ہرش نے کہا اور ساتھ ہی دونوں کے موبائل بچے۔

دونوں نے کال اینڈ کی اور دونوں کو سانپ سگھ گیا۔ پروجیکٹ میں کنسٹرکشن کے دوران ڈرل مشین چلاتے ہوئے شارٹ سرکٹ ہو گیا تھا در بھاگہ کہ وہاں پانی بھی پڑا ہوا تھا کرنٹ پھیلنے سے کئی مزدوروں کی مرت ہو گئی دونوں فوراً وہاں پہنچے وہاں ان کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ نقصان ہوا تھا اس مزدور مر گئے تھے اور انکی ڈیڈ باڈیز کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی ان کے شریر دیکھنے کے لائق بھی نہ رہے تھے۔

ہرش اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا جین تو کسی اور ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا گاڑی میں دونوں چپ تھے پھر اس خاموشی کو جین نے توڑا۔ ”ہرش میری ایک بات مانے گا؟“

ہرش نے جواب میں صرف ”ہوں.....“ کہا۔

جین بولا۔ ”یہاں ہودن کروالے، میں تو کام شروع کروانے سے پہلے کہتا مگر تیرا موڈ دیکھ کر میں نے کہا نہیں۔“

اس کی بات سن کر ہرش اور بڑھ گیا اور بولا۔ ”اس سے میرا نقصان پورا ہو جائے گا؟“

تو جین بولا۔ ”نہیں ایہ تو نہیں ہو سکتا پرنتو آگے کا نقصان شاید رک جائے؟“

تو ہرش نے لمبی سانس لی اور بولا۔ ”اچھا تو پھر

جو تجھے اچھا لگے وہ کر، میں تو پک گیا ہوں۔“

جین نے کہا۔ ”جیرا اس ہودن میں ہونا ضروری ہے۔“ تو ہرش نے اسے گھورا۔

”ادھ اپنا جین جین مجھے مت گھینا ان سب میں، میرا دماغ تو پہلے ہی خراب ہو چکا ہے، میرا دماغ گھٹتا ہے ان سب چیزوں سے۔“ ہرش نے جین کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

”اچھا آخر میں تھوڑے سے کے لئے آ جانا۔“

جین نے پھر اسے فون کیا۔

”تیرے کہنے پر ہودن کر رہا ہوں یہ کافی نہیں ہے بس اس سے زیادہ کی آشا تو مجھ سے مت کرنا۔“ ہرش نے بات ختم کر دی تو جین بھی خاموش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

پنڈت جی ہودن کرتے ہوئے بار بار چونک رہے تھے ہودن ختم ہوا تو وہ ترنت اٹھ گئے اور مالا جیتے ہوئے آگے بڑھنے لگے پھر وہ کافی آگے تک گئے اور رک کر واپس آگئے جین ان کی حرکت پر غور مند ہو رہا تھا اس نے پنڈت جی سے پوچھا۔

”پنڈت جی! اس پریشانی میں ہیں آپ؟“

پنڈت جی نے اس کی بات پر رک کر کہا۔ ”کچھ تو ہے جو بدی میں نہیں سار ہا ہے پرنتو ایسا کچھ ہوا ہے جو سامنے نہیں ہے کوئی خشتی، کوئی راز تو ضرور ہے۔“

جین نہ سمجھنے والے انداز میں پنڈت جی کو دیکھنے لگا پھر پھر بولا۔ ”کیسا راز؟“

پنڈت جی بولے۔ ”پتا نہیں میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا کتو! کچھ تو ضرور ہے اور وہ بھی خشتی شال!“ اور وہاں سے چلے گئے۔

جین نے پریشان کن انداز میں ہرش کو جا کر سب بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔ ”یہ سب گریں لوگوں کو بھانسنے کے ہیں؟ تجھے پتا نہیں ہے انہیں دکھنا چاہئے ہوتی ہے اس لئے لوگوں کو ایسی باتوں میں الجھاتے ہیں۔“

جین بولا۔ ”ہرش! میں پنڈت جی کو جانتا ہوں وہ ایسے نہیں.....“ مگر ہرش نے اس کی ادھوری بات میں ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا تو وہ چپ ہو گیا۔

ہرش نے سارے معاملات رفع دفع کر کے دوبارہ سے کام شروع کر دیا ہرش اس طرف سے کافی فکر مند تھا اس لئے تمام مزدوروں سے بار بار دھیان رکھنے کا کہہ رہا تھا چار دن شامی سے گزر گئے پر پانچویں روز ہرش کا سکون پھر غارت ہو گیا۔

صبح جب مزدور سائٹ پر پہنچے تو ایک اور تماشا ان سب کے سواگت کے لئے موجود تھا کام کے لئے آئی ہوئی میٹنگروں انہیں چورے کا ڈھیر بنی ہوئی تھیں سینٹ کی تمام بوریاں پھٹی ہوئی تھیں اور ساری سینٹ زمین پر بکھری ہوئی تھی جو جگہ جگہ سے کالی ہو رہی تھی جیسے کچھ پکڑ کر دیا گیا ہو اور سریوں کے ڈھیر، چورے کے پھاڑے ہوئے تھے جیسے کسی کرشک مشین میں ڈالا گیا ہو کیونکہ لمبے لمبے سریوں کے ڈھیر کو چورے میں بدلنا کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی وہ بھی رات بھر میں۔

سارے مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا اور بھاگ گئے ہرش نے یہ سنا چار سن کر اپنا سر پیٹ لیا اس کی کپٹیاں ایک دم سنگے لگیں اور اس کا لبی لبالی ہو گیا۔

جین اس کے ساتھ تھا ڈاکٹر نے اسے ریلیکس کرنے کا کہا۔

”کیسے ریلیکس کروں؟“ ہرش نے دھاڑ کر کہا۔

”مسٹر ہرش! پلیز ریلیکس، اس وقت یہ آپ کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے وارن کیا۔

تو جین نے ہرش کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”ہرش میرے بار اچھے پتا ہے کہ تیری چٹا بالکل درست ہے پھر اس سے چٹا کو دماغ سے بالکل نکال دے یہ کوئی

بڑا حس حریف ہے جو کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے اسے ہم کھون لیں گے ادا کے۔“ جین نے تسلی دی تو ہرش نے آنکھیں بند کر لیں۔

”کل تو بارشتر جا رہا ہے! میں تیرے لئے سیٹ کنفرم کرادوں گا دو چار دن گزارو وہاں۔ پھر واپس آ کر سب دیکھیں گے۔“ جین نے کہا تو ہرش نے گردن ہلا کر اس کی بات مان لی، ہرش ایک ہفتہ بارشتر میں گزار کر آیا تو بالکل ریلیکس تھا اس سچ پر وجیکٹ کا کام بھی رکا رہا تھا۔

ہرش شام کی فلائٹ سے واپس آیا تھا اور سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے وہ ہاتھ فٹ میں لیٹا ہوا تھا دھما میوزک آن تھا ہرش کے سر ہانے جین کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور پھر اہوا گلاس ہاتھ میں تھا ہرش اپنی آنکھیں بند کئے گلاس میں موجود آگے کیو بر گما رہا تھا یہ اس کے ریلیکس کرنے کے طریقوں میں سے ایک تھا۔ ہرش نے آنکھیں بند کئے گلاس میں سے سب لیا ابھی وہ اس کے حلق سے نیچے اترا بھی نہیں تھا کہ ہرش کو اپنے بائیں پیر میں سناہٹ محسوس ہوئی تو اس نے پیر ہلایا اور اسے اگنور کر دیا اور پھر دوبارہ سب لیا پھر تھوڑی دیر بعد وہ سناہٹ تکلیف میں بدل گئی، ہرش نے پیر اوپر کیا اور اس پر سے جھماگہ ہٹائے تو وہ دھک سے رہ گیا ہرش کے پیر پر موجود سوراخ تھوڑے بڑے ہو گئے تھے اور پیر پر پسوں کا جال گھٹنے سے اوپر کھینچ گیا تھا اور ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا ہرش کو ان سے بہت خوف آیا۔

پروجیکٹ میں ہونے والے نقصان کے پتھر میں ہرش نے اس طرف بالکل دھیان نہیں دیا تھا، ہرش اچھے میں تھا کہ کیا کرے اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گھٹنے کے اوپر موجود پسوں نے واپس نیچے کی طرف آنا شروع کر دیا اور پیر سے غائب ہوتی جاری تھیں اور نیچے کی اور بڑی جاری تھیں اور پھیلتے پھیلتے پیر کے ناخنوں تک آ کر رک گئیں اور ناخن سیاہ ہو گئے ہرش کو اپنے پیر کے ناخنوں میں اگنی کی لپٹیں اٹھتی محسوس

ہونے لگیں پھر ان کی شدت بڑھتی گئی اتنی کہ ہر ش کی برداشت کی سیما کو پار کر گئی ہر ش کی چیخ نکل گئی پھر ان ناخنوں سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔

پھر دھواں آہستہ آہستہ گاڑھا اور ہاتھا اور پھر اس دھواں میں جمع ہونا شروع کر دیا اور ایک وجود کی شکل اختیار کرنے لگا ہر ش اپنی جگہ بن ہو کر رہ گیا جب اس دھواں نے پوری شکل اختیار کر لی تو ہر ش کا خون اس کی رگوں میں جسنے لگا۔ وہ وہی درخت تھا جس کا چہرہ سیاہ عورت کا تھا اور سر پر بیگ نما ٹہنیاں نکلی ہوئی تھیں اس کی آنکھیں بند تھیں ہر ش نے دھواں نہ آنے پر اپنی آنکھیں ملین کتو وہ درخت نما عورت یا عورت نما درخت وہیں موجود تھے پھر اس عورت نے اپنی بند آنکھیں کھولیں وہی خالی گڑھے جن میں پتلیوں کی جگہ گئی جل رہی تھی اور گاڑھا خون بہہ رہا تھا شعلے اگل رہے تھے۔

ایک دم اس عورت نے سیاہ دھواں میں اپنے ہاتھ آگے کئے جنہوں نے سٹ کر درخت کی شاخوں کا روپ دھارن کر لیا اور آگے بڑھ کر ہر ش کے سر میں موجود دھواں میں گھسنا شروع کر دیا اس کا ایسا کرنا تھا کہ ہر ش کو لگا کہ اس نے نئے تار کو چھو لیا ہوا ہے جسکے لگنا شروع ہو گئے اس کے سر میں کھال کے بیچے نسلوں کی جگہ درخت کی چڑیاں پھیلنے لگیں اور پھیلنے پھیلنے ہر ش کے سینے تک پہنچ گئیں ہر ش کے منہ سے فلک شکاف چھین نکلتے لگیں اور وہ سید پکڑ کر تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

ہر ش کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اجنبی جگہ پایا اسے یاد آیا وہ تو ہاتھ لب میں تھا دروازہ کھلا اور جین اندر آیا۔

”میں کہاں ہوں؟“ ہر ش نے پوچھا۔  
”شش شش.....“ جین نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

”مت بول ہر ش تجھے سخت ہارٹ ایک ہوا ہے“ جین کی بات پر ہر ش اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”ہارٹ ایک؟ مجھے تو کبھی کوئی ہارٹ پر اہم نہیں رہی۔“ اس نے کہا۔

”جی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ آخرا کیا ہوا تھا؟ ہر ش جو تجھے ہارٹ ایک ہو گیا۔“ جین کے بلونے پر ہر ش کی آنکھوں کے آگے وہی منظر کھوم گیا اور اس نے خوف سے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“ ہر ش نے جھوٹ بولا۔

”اوکے! اوکے! پلیس اتو کچھ مت یاد کر، بس آرام کر.....“ جین نے جلدی سے کہا۔

”جین! میرے سر میں درد ہے اذرا میرا الٹا سر تو دیکھنا۔“ ہر ش نے کہا تو جین نے اٹھ کر اس کا سر دیکھا۔

”یاد رہے جو چوٹ لگی تھی تیرے اس کی نیس سرخ ہو رہی ہیں۔“ جین نے بتایا تو ہر ش نے سکون کا سانس لیا اور دل ہی دل میں اطمینان سے سوچا۔

”یہ بھی میرا خواب ہی تھا، میں بلا وجہ چننا کر رہا ہوں۔“

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مہتا اندر آ گئے وہ ہر ش کے کلو ز فرینڈ ہونے کے ساتھ دلش کے جانے مانے ہارٹ سر جن بھی تھے۔

”ہیلو ہر ش! اب کیا حال ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اوکے.....“ ہر ش نے مختصر جواب دیا۔

”یار مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہر ش درجن اتنا کمزور دل کا مالک ہے کہ اتنی سی بات پر دل پکڑ لے گا۔“ ڈاکٹر مہتا نے ہر ش کو چھیڑا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ ہر ش نے کہا۔

”ہر ش! یہ تو قحی مذاق کی بات اور سیریس بات یہ ہے کہ تجھے سخت ہارٹ ایک ہوا ہے اور جہاں تک میرا ایکسپریٹس ہے مسئلہ تیرے بائیں بصر کی رگوں کا

ہے جو دل تک جارہی ہیں اگر پر اہم زیادہ ہوئی تو سر جری کرنی پڑ سکتی ہے ابھی یہ صرف میرا خیال ہے ہو سکتا ہے یہ خیال غلط ہو ابھی کوئی بات جتنی نہیں ہے ہم پہلے اس سے ریلیٹو کچھ ٹیسٹ کر لیں پھر فائنل بات کریں گے ابھی تو سب بھول کر تو صرف ریٹ کر۔“ ڈاکٹر مہتا نے کہا اور دم سے چلے گئے۔

”جین! ڈاکٹر کی بات سے چست ہو گیا اور بولا۔

”ہر ش! یار! میں جانتا ہوں کہ تو میری باتوں کو نظر انداز کر دے گا کتو میرے کہنے سے ایک بار کیول ایک بار مجھے اس معاملے میں کسی شکی شالی تا ترک سے بات کرنے دے؟“

ہر ش خاموش رہا دراصل وہ جین کی بات سن ہی نہیں رہا تھا اس کے دماغ میں تو وہ خواب والا درخت چل رہا تھا جس کا چہرہ سیاہ عورت کا تھا جس نے پہلی بار ہر ش کا سر پکڑا تھا تکلیف ہر ش کو جی شروع ہوئی تھی ورنہ اس سے پہلے تو اس کا سر بالکل ٹھیک تھا۔

”بول ہر ش! بھر کیا کہتا ہے۔“ جین کی آواز پر ہر ش سوچ سے باہر آ گیا۔

”کیا کہا.....؟“ تو جین نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”رہنے دے تو، میں خود کر لوں گا۔“ اس نے ہر ش سے کہا تو ہر ش پھر سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے پنڈت جی نے مجھے آپ نے میری مدد کرنی ہے۔“ اس شخص نے جین سے کہا۔ جس کے چہرے کو جین غور سے دیکھ رہا تھا ادھونگا تھا گہرے رنگ کی دھوپ باندھی ہوئی تھی، ہاتھوں اور گلے میں دھاگے باندھے ہوئے تھے۔

”میرا نام جین ہے؟ اور آپ کا شہر نام؟“ جین نے پوچھا۔

”شیوا!“ اس شخص نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بنا دیکھے آہستہ آہستہ گڑھے لگا پھر وہ ہر ش کے آفس کی جگہ آ کر رک گیا۔ جین نے کچھ گھٹایا پھر کچھ سوچ کر رک گیا وہ شخص وہیں رکا رہا

اور پھر کافی سے گزرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

”ایک کالا بکرا منگواؤ۔“ اس نے کہا تو جین اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”آج؟“

”تو وہ شخص بولا۔“ ابھی ترنت۔“ تو جین نے

موہاگل نکالا اور اپنے بندے کو بکرا لانے کو کہا۔ جین کا بندہ ٹھوڑے ہی سے میں کالا بکرا لے آیا..... اس شخص نے اپنے کاندے پر لٹکی جھولی میں سے مٹی نکالی اور اسے بکرے کے سر پر لگا دیا پھر دوبارہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دینے لگا اس کا ہاتھ جھولی میں گیا اور اس میں سے ایک کھوٹا نکالا پھر اس پر پھونک ماری اور چاروں طرف کمرے میں کھونٹے لگا پھر ایک کونے میں رک کر اس کھونٹے کو گاڑ دیا اور اس سیاہ بکرے کو اس کھونٹے سے باندھ دیا پھر جھولی میں سے سیندر نکال کر اس کھونٹے اور بکرے کے سر پر لگا دیا اور جین کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا اور آفس سے نکل کے باہر آ کر بولا۔

”آج کی رات بیت جائے تو کل سورج کے نکلنے کے بعد یہاں آنا اور جو کچھ وہ مجھے بتانا کہ یہاں کیا نظر آیا ہے؟“ اور پھر وہاں سے چلا گیا جین بھی وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز سورج نکلنے ہی جین جلدی سے گاڑی لے کر پرجیکٹ سائٹ پر پہنچ گیا اور تیزی سے ہر ش کے آفس گیا دروازہ کھولتے ہی جین کے ہوش اڑ گئے، زمین نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا اس کی آنکھیں حیرت و خوف سے پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ کمرے کے کونے میں گڑے کھونٹے سے بندھے بکرے کا صرف سر تھا جو کہ کٹا ہوا تھا اور باقی دھڑ عائب تھا اور اس جگہ خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

جین اٹلے قدموں چلنے لگا اور پھر وہاں سے سر پر چڑھ کر کھجکا اور شیواجی کے پاس جا کر رہی رکا۔ اس نے شیواجی کو سب کچھ بتایا اور انہیں دیکھنے لگا۔

شیواجی بولے۔ ”میں کل ہی معلوم ہو گیا تھا

کثرت و شواہد نہ کرتے اسی کارن اس مسئلے کو دور کرنے کے لئے یہ عمل کیا تا کہ سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے اور تم اپنی آنکھوں سے حقیقت دیکھ لو۔“

ہتھین نے ہاتھ جوڑ کر شیواجی سے پوچھا۔ ”یہ کیسی سسپا ہے شیواجی؟“ تو شیواجی نے لمبی سانس لی اور بولے۔

”تمہارا دوست اپنے سردناش کا کارن سویم ہے اور یہ وہ جانتا ہے پرنتو آستیر سے کام لے رہا ہے۔“ ان کی بات سن کر ہتھین بولا۔

”شما کیجیے شیواجی میری مدد میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے میں اپنے متر کو آپ سے ملواتا ہوں پھر اس کے سامنے اس وٹے میں بات کرتے ہیں۔“

شیواجی نے ہتھین کی بات سن کر کہا۔ ”جو بھی چاہے کرلو پرنتو تمہارا متر جس دلدل کے بھیر جا چکا ہے اس میں سے لکھنا ممکن نظر نہیں آ رہا۔“ ہتھین نے ہنسنے والے انداز سے شیواجی کو دیکھنے لگا۔

ادھر ہرش نے کافی دنوں سے کوئی بزنس ڈیلنگ نہیں کی تھی بس ڈاکٹروں کی ہدایات پر آرام کر رہا تھا۔ سارا کام ہتھین دیکھ رہا تھا اور آج اس نے ہرش سے کسی کی ملاقات کروانے کا کہا وہ بھی کسی اہم کام کے لئے۔

پھر جب ہتھین شیواجی کو لے کر آیا تو شیواجی کو دیکھ کر ہرش کا من بن گیا اور وہ بولا۔

”ہتھین یار! یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے تو؟ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں ایسے پاکھنڈیوں کو یہ عام لوگوں کو ہاتھوں کے جال میں الجھا کر جانے کس لوگ میں پہنچا دیتے ہیں یہ ساگری لاؤ اس کی دیکھنا اب یہ چیز آڈینک ہے اب یہ کرواد وہ کرواد آخر کار تنگ آ کر بندہ کہتا ہے یہ روئے لو اور سب کچھ خودی کرو اور اس الجھاؤ کے لئے تو سارا بھینڈ اڑا جاتا ہے۔“

ہتھین بھی ہرش کی شکل دیکھتا تو کبھی شیواجی کی اس نے شیواجی سے کچھ کہنا چاہا تو شیواجی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور ہرش کی اور نہ کر کے بولے۔

”میں یہاں اپنی اچھا سے نہیں اس شخص کی خواہش پر آیا ہوں چرن نہیں چھوئے تھے کہ مجھے یہاں بلاؤ، سسپا تمہاری ہے میری نہیں اور مورکھ ہے جو ایک گیانی کا ایمان کرتا ہے اسے فراد کرتا ہے تیری اسٹھیا ہی حیرے سردناش کا کارن ہے جس سنگٹ میں تو گھرا ہے وہ تیرے عمل کی کرتی ہے جسے تو اب بھوگے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جسے تو اپنا بھرم جان رہا ہے ناں وہ ستیہ ہے۔“ اس بات پر ہرش چونک گیا اور جلدی سے بولا۔

”کس بھرم کی بات کر رہے ہو؟ مجھے کوئی بھرم نہیں ہے۔“

تو شیواجی بولے۔ ”من کے بھیر کا بھید جانتے ہیں ہم، تو ہرش بولا۔

”انتا گیان ہے تو بتا کیا بھید ہے؟“

ہرش کی بات پر شیواجی ہنسنے ہوئے بولے۔ ”میرے پاس گیان کہاں ہے؟ میں تو پاکھنڈی ہوں، میں کیسے بتاؤں؟“ شیواجی کی بات سن کر ہرش کھسیانہ ہو گیا۔

شما کیجیے شیواجی! اس کی بات کا ارتھ آپ کو کہنا نہیں، دوسرے پاکھنڈیوں کو کہنا ہے آپ کر پا کر کے ہماری سہایت کریں۔“ ہتھین نے معاملے کو خفشتا کرتے ہوئے کہا تو شیواجی خاموش ہو گئے۔

ہرش کا موہاںل بجاتا تو اس نے اسکرین دیکھ کر ہتھین سے کہا ڈاکٹر مہتا ہیں۔

ہتھین نے کہا۔ ”ایپنیکر آن کر دیا کہتے ہیں ڈاکٹر مہتا؟“ تو ہرش نے اپنیکر آن کر دیا اور بولا۔

”کہو کیسے ہو مہتا؟“ تو اپنیکر سے آواز سنائی دی۔

”میں تو ٹھیک ہوں ہرش! پر تیرے دل کا معاملہ بہت سمجیر ہے اسب کچھ الجھا ہوا ہے اور کوئی خاص ریزن بھی بتائیں چل پارہا ہے۔ پر مسئلہ بڑھ رہا ہے آئی تھنک کہ ہارٹ سرجری کرنی پڑے گی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے تو کل آچھر اس مسئلے پر بات کرتے

ہیں۔“ ہتھین شیواجی کی اور دیکھ کر بولا۔

”سہایت کریں شیواجی۔“ اور ہرش کو بھی اشارہ کیا کہ وہ شیواجی سے کہے، پرنتو ہرش نے منہ دوسری ادر کر لیا۔

شیواجی بولے۔ ”تمہیں کیوں سسپا کے بارے میں سوچت کر سکتا ہوں، اس کا اپائے نہیں کر سکتا۔“

ہتھین نے ان کی بات سن کر ہاتھ جوڑ لئے اور بولا۔

”اپنے متر کی اور سے میں شامنگتا ہوں اس وقت اس کی دماغی سوچ ٹھیک نہیں ہے، کر پا کیجیے اب تو کیڈل آپ کا ہی آسرا ہے۔“

شیواجی نے گہری سانس لی اور بولے۔ ”بات تمہارے متر کے سو بھوؤ کی نہیں ہے ہانک! ہم نے جو کہا کہ ہم اپائے نہیں کر سکتے تو اس کا ارتھ ہے کہ نہیں کر سکتے تمہارے متر کے لئے بالکل بھی اچھے سار چار ٹھیک ہیں وہ جس سنگٹ میں پڑ چکا ہے اس سے نکلنے کا اہائے تو ہے پرنتو اس کا سے اب بہت پیچھے رہ گیا ہے اب ہم تو کیا کوئی بھی تمہارے متر کی سہایت نہیں کر پائے گا اور تمہارے متر کا خاتمہ اٹل ہے۔“ یہ سن کر ہرش اور ہتھین سناٹے میں آ گئے۔

ہتھین نے آگے بڑھ کر ان کے چرن کھلے۔ ”یہ سب کیا ہے شیواجی؟“ اب تو ہرش بھی اس اور متوجہ ہو گیا تھا شیواجی نے اپنی آنکھیں بند کیں اور ہر کچھ دیرک کر دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں اور سانس لے کر بولنا شروع ہو گئے۔

”یہ جو سنسار ہے ناں اس کے لئے المیہ شور نے کچھ نیم بنائے ہیں ہرشے اپنی سیسا کے دھارے میں پھنسے ہیں اور المیہ شور نے اس سنسار میں کیوں انسان شکتی نہیں اور شکتیوں کو بھی جما ہے اور اگر ان تمام شکتیوں میں سے کوئی بھی شکتی اپنے دھارے کی سیسا سے کھل کر دھارے میں پراوش کرتی ہے تو اس نکر اوڑھنے ستونک بگڑ جاتا ہے اور ہر بھی بگاڑ ارچنوں کو لافا دیتا ہے۔ اب چاہے انسان شکتی دوسری شکتی سے کھراؤ کرے یا وہ انسان شکتی سے اور بھی کچھ تمہارے

متر نے کیا، ہر کار کا ایک قاعدہ ہوتا ہے پرنتو تمہارے متر نے اپنے آپ کو بھگوان جانا اور اسٹھیا وکھریا کی سیسا میں لاگ کر گھور پاپ کیا ہے، کیوں ایک زمین کے کھرے کے لئے ایک ماں کے کلیجے کے کھلے کو کاٹ دیا یہ کیا سمجھا کہ سنسار کی نظروں میں ماہان ہے تو المیہ شور کے ساتھ بھی چھل کرے گا اس کا ماتا کا شراب لگا ہے اسے، جی تو اس نے اپنی شامت کو آپ ہی نینو دیا ہے دھرتی کے سینے پر کھڑے ان برہما بڑس کے پرانے پٹیل کے درخت کے اندر ہزاروں چھپے ہوئے تھے جسے اس نے اپنے اہنکار میں یوں ہی اکھاڑ پھینکا بنا کوئی اپائے کے۔“

ہتھین نے حیرانی سے پوچھا۔ ”پٹیل کے درخت تو جانے کتنے ہوتے ہیں اور ایسے کاموں میں تو اکثر کاٹنے پڑتے ہیں تو اس میں ایسا کیا ہے۔“

تو شیواجی بولے۔ ”وہ کوئی عام پٹیل کے درخت نہیں تھے برسوں سے ایک بوڑھی عورت اس پٹیل کے درخت کے نیچے پڑی رہتی تھی جب وہ صرف ایک درخت تھا وہ عورت بس آسن جمائے تپا کرتی رہتی، نہ کھاتی، نہ پیتی سر جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہتی تھی پٹیل کے درخت کے پھیرے لیتی رہتی تو کبھی اس کے تنے سے لپٹی پڑی رہتی اس کا اور پٹیل کے درخت کا ایک سبندہ تھا؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا اس کے جیون کا ایک ایک ش پٹیل کے درخت کے ساتھ چلتا تھا ایک پتہ بھی اس پٹیل کے درخت سے کرتا تو وہ دیوانوں کی طرح اسے جھپٹ لیتی۔“

لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ وہ بوڑھی عورت اور پٹیل کے درخت پتی پتی ہیں اور وہ بوڑھی عورت کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ عورت کے روپ میں کوئی ناؤیدہ شکتی تھی یا پھر پٹیل کے درخت کی چڑیل ٹٹو اس نے کبھی بھی کسی کو تنگ نہیں کیا بس وہ پٹیل کے نیچے رہتی تھی وہ کہاں سے آئی اس کی عمر کیا تھی اس کا نام کیا تھا؟ کسی کو بھی معلوم نہ تھا لوگ خوف سے اس کے قریب نہ جاتے تھے۔



پھر ایک روز وہ ہوا کہ سب حیران رہ گئے وہ عورت پتیل کے درخت کے نیچے سے غائب ہوگئی کہاں گئی یہ بھی آج تک راز ہی ہے پرتوہ جانے کے بعد اپنے پیچھے لوگوں کے لئے ایک اور گتھا چھوڑ گئی اس بوڑھی عورت کے غائب ہوتے ہی اگلے روز کیل ایک ہی رات ہی میں اس پتیل کے درخت کی جڑ سے ایک نیا تناور پودا پھوٹ پڑا پتیل کی جڑ سے بڑا ہوا درخت اور اوپر سے بھی پرانے پتیل کے درخت کے ساتھ جڑا ہوا لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دوسرا درخت وہی بوڑھی عورت ہے جو تیسارے درخت میں بیوست ہوگئی۔ برسوں سے وہ دونوں پتیل کے درخت دھرتی پر کھڑے تھے مگر تھارے مرنے بنا جانے یا معلوم کر کے انہیں سنگدل سے لکھاڑ پھینکا کہ اتنی سی بات نہیں جانتا تیرا یہ مورکھ مترکہ اتنے پرانے درختوں کے تو نیچے سے گزرتے ہوئے بھی وہی سا ودھان رہتا ہے پرتو اس کی مورکھتا تو دیکھو! ہانسی پوجا کے بنا کوئی سیما بندھے ہانسی شور کھسا کا وج کے انہیں لکھاڑ پھینکا اب وہ شہتی اسے ٹھٹھ کئے بنائیں چھوڑے گی۔

شیواجی خاموش ہو گئے اور وہاں سے پلٹ کر واپس جانے لگے تو ہمیں دوڑ کر ان کے سامنے آیا اور ہاتھ جوڑنے لگا شیواجی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

”تیرا بیاتیرے دوست کے لئے اپنی جگہ ہے لیکن ہم نے کہا ناں کہ سے نکل گیا ہے۔“ اور وہاں سے چلے گئے۔

شیواجی کے جاتے ہی ہرش زور سے ہنسا اور بولا۔ ”اسے پتا چل گیا ناں کہ یہاں اس کی دال نہیں ملے گی اور یہاں سے اسے کچھ بھی مالی فائدہ نہیں ہوگا اس لئے اس کو کچھ بھی نظر نہیں آیا تو کہنے کو کچھ بڑا نہیں تو اس نے جھوٹی کہانی گھڑی اور ہمیں سنا دی پتیل کے درخت کی واہ واہ! میری پیاری کو جانے کیا روپ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے لوگ فراڈی ہوتے ہیں۔ رہی بات پریشانی کی تو وہ تو ہر دور میں آتی رہی

ہیں کل میں مہتا سے مل کر سرجی کی ڈیٹ ڈیبا نیڈ کرتا ہوں پھر سدا کے لئے اس سسپا سے مکت ہو جاؤں گا۔“

ہتین خاموشی سے ہرش کو سکے جا رہا تھا پھر ہرش سے بولا۔ ”تیرا میرا ہتین کا ساتھ ہے اور ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تو مجھ سے صاف صاف کہہ کہہ شیواجی کیا کہہ رہے تھے کہ تو نے جانتے ہو مجھے سب کیا ہے۔“

ہرش دوبارہ ہنسا اور بولا۔ ”ہتین میرے بار میں جج جج میں کچھ نہیں جانتا، اگر جانتا ہوتا تو مجھے بالکل بتاتا اور میرے تمام کاموں میں تو برابر کا پارنٹر ہے۔“

ہتین آگے بڑھا اور ہرش کو کانڈھے سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ جج ہے کہ اس بوڑھی عورت کا گھر تو نے جان کر گروایا تھا جس میں دب کر اس کے پتر کی مریو ہوگئی اور وہ ابھاگن اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی اور پاگل خانے پہنچ گئی۔“

تو ہرش نے اپنا چہرہ ہتین کی اور سے موڑ لیا۔ ہتین نے اسے دوبارہ پکڑ کر واپس اپنی اور کیا اور بولا۔ ”ہرش اتنا بڑا پاپ کیا تو نے وہ بھی کیوں ایک زمین کے لئے، وہ بھی اس زمین کے جو تیری ہی نہیں تیری زمین ختم ہونے کے بعد ان کا بیڑھوں پرانا مکان تھا جو تو نے اپنی انا اور غور کے تحت گرا دیا۔“

ہتین کی بات پر ہرش ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں نے کوئی پاپ نہیں کیا یہ تو ایک گھٹنا سی جو گھٹ گئی۔“ ہتین جھلا کر بولا۔ ”جج کہہ رہا ہے تو نے پاپ تھوڑی کیا ہے، تو نے کیوں آئندہ پرانی کی ہے۔“ تو ہرش بغیر کچھ کہے کمرے سے چلا گیا۔

ہتین اور ہرش نے ڈاکٹر مہتا سے مل کر ہارٹ سرجری کی ڈیٹ فاسل کر لی دونوں بعد ہرش کو ایڈمٹ ہونا تھا ہتین ہرش اس کے ساتھ ہی تھا ہرش اپنی تمام ضرورت کی ڈینگ کمپلیٹ کر رہا تھا کیونکہ اس نے

مرجری کے بعد بھی کافی سے ریٹ کرنا تھا۔ اس سے وہ اور ہتین اپنے اسی آفس آئے ہوئے تھے جس کا کام جانے کب سے رکا ہوا تھا پریشانی اور فگر نے ہرش ہنگ کر دیا تھا، ابھی بھی دونوں اس مسئلے پر بات کر رہے تھے کہ ہتین کا موبائل بجاس نے اسکرین دیکھی اور کال ریسپونڈ کی دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو ہتین نے گھڑی دیکھ کر اس کے کہا اور فون بند کر کے ہرش سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں دس منٹ لگیں گے بس۔“

”جا کہاں رہا ہے تو؟ کس کی کال تھی؟“ ہرش نے پوچھا۔

”یارا وہ ہے ناں اگر دال، اس کو ہمیں پرسوں پہنٹ کرنی تھی پرتو اسے کل اچانک پونا جانا پڑ رہا ہے اور اس کی واپسی چار پانچ روز میں ہوگی تو وہ کہہ رہا ہے کہ میں ابھی چیک لے جاؤں وہ نہیں آجائے گا کیونکہ وہ پریوار کے ساتھ ریسٹورنٹ میں میٹھے میں آتا ہوں چیک لے کر، کیوں دس منٹ لگیں گے پھر ساتھ چلیں گے۔“

ہتین نے بتایا تو ہرش سوچ کر بولا۔ ”راجن اگر دال۔“ تو ہتین نے ہاں میں گردن ہلائی اور پتیل سے چابی اٹھا کر آفس سے نکل گیا اور باہر چوکیدار سے ہرش کا دھیان رکھنے کا کہہ کر چلا گیا ہتین کے جانے کے بعد ہرش نے کرسی پر بیٹھ کر آرام سے پیر اٹھا کر ٹیبل کے اوپر رکھ لئے اور آنکھیں موند لیں۔

”جمن.....؟“ کی زور سے آواز نے ہرش کو چونکا دیا اس نے دیکھا تو ٹیبل پر رکھی اس کی گاڑی کی چابی نیچے گر گئی تھی ہرش دوبارہ آنکھیں بند کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ پانی کے گلاس پر پڑی جو دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور اسے سرک رہا تھا پھر وہ تیزی سے کنارے تک پہنچ گیا اور نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہرش نے ترنت پیر نیچے گئے اور ٹیبل کر بیٹھ گیا اس نے غور کیا تو آفس کا فرش لہر رہا تھا اور اس کی شدت تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی پھر ٹیبل دھڑا دھڑا کر کے جلنے لگی ہرش کو لگا کہ ڈرلہ آگیا ہے وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کے قدموں کے

سامنے فرش میں دراز بڑنا شروع ہوگئی اور فرش دو کھڑے ہو گیا ہرش کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ پھر اس ٹوٹے ہوئے فرش میں سے سیاہ دھواں نکلنا شروع ہو گیا اور پھیلنے پھیلنے چھت تک چلا گیا اور دھیرے دھیرے اس نے اسی سیاہ درخت کی شکل اختیار کر لی جس کا چہرہ عورت کا تھا۔ اس کے وجود سے سیاہ جڑیں نکل کر سارے کمرے میں پھیلنا شروع ہو گئیں۔

ہرش بت بنایہ سب دیکھ رہا تھا۔ ”گتا ہے اس شیواجی کی باتیں میرے دماغ میں کھسکی رہ گئی ہیں۔“ ہرش بوڑھیا اور اپنی آنکھیں ملیں مگر اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر تبدیل نہ ہوا پھر ان سیاہ جڑوں نے اپنا رخ ہرش کی اور کر لیا اور آگے بڑھ کر ہرش کی ٹانگوں کو پکڑ لیا اور اس کے بائیں پیر پر موجود دونوں سوراخوں میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔

درد سے ہرش کی چیخ نکل گئی وہ جڑیں تیزی سے ہرش کے پیر کے پیر جاری تھیں پھر ہرش کی کھال کے نیچے سے وہ جڑیں پھیلنے لگیں اس کے ہاتھوں، پیروں، چہرے اور سر پر ہرش نے سوئی کی جگہ وہ جڑیں جال کی طرح پھیل گئیں۔

ہرش خوف زدہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اس کے شریر میں انگارے سے دوڑنے لگے اور ہرش کی تکلیف نے انتہا کو اس سے چھو لیا جب اس کے شریر کی چڑی نے پھٹنا شروع کر دیا ہرش کی چیخیں آکاش ہلانے والی تھیں مگر شاید اس کی آواز کسی اور کو نہیں سنائی دے رہی تھی، جو کوئی بھی اس کی سہانچا کے لئے نہیں آ رہا تھا، چڑی بھیننے کے ساتھ ساتھ ہرش کے شریر پر سے ماس نے ہٹنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ہڈیوں کے اوپر درخت کی چھال نکلنا شروع ہوگئی۔

ہرش کے سینے کی کھال پھٹ گئی اور ماس ہٹ گیا تو اس سینے میں دھڑکتا دل نظر آنے لگا جنہیں اب جڑیں پکڑ رہی تھیں۔



## نادیدہ مخلوق

نینا خان - کراچی

رات کے گھپ اندھیرے میں اچانک ہوائی مخلوق کی آواز گونجی اس جگہ سے جتنی جلدی ہوسکے چلے جاؤ یہ معماری جگہ ہے اور اپنی جگہ کی حفاظت ہم ہر صورت کریں گے چاہے جان لینا پڑ جائے۔

خود کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھنے والا اکثر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

1997ء میں جب ابانے سی سینٹر کے گمنام آباد علاقے میں گھر خریدا تو اس وقت اس علاقے میں اتنی آبادی نہ تھی۔ ابا ایک سخت مزاج اور انتہائی اصولی انسان تھے اور اپنی بچہ بوہ سے ہی چلتے تھے۔ ابا نے اپنی مرضی سے بغیر کسی کو دکھائے گھر کا سودا طے کر لیا تھا۔ جب ابا گھر خرید چکے تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بلال بیٹا میں نے سی سینٹر میں ایک گھر خریدا لیا ہے۔ اور اس کی فل مینسٹ بھی کر دی ہے آج ہی مجھے گھر کی فائل ملی ہے تو تم کل اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سامان شفٹ کروا دینا۔ پرسوں پھر ہم سب اپنے نئے گھر میں مشل ہو جائیں گے۔“ ابا کی بات سن کر میں نے کہا۔ ”نھیک ہے ابا جیسا آپ کہیں۔ میں کل ہی تمام سامان شفٹ کرتا ہوں۔“

”ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے متر کے پاس سے نہیں ہے مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے متر کے پاؤں میں تم مجھے دار ہو یا نہیں، پر تو تمہارے متر کے پاؤں کا گھڑا بھر چکا تھا پرامبو کے بنائے نروہوں کو ہمیشہ کیڑے کدوے جان کر انہیں بیروں تلے روندنا ہے اس نے اور اپنے آپ کو بیگوان سمجھا ہے کہ وہ جو چاہے کرے گا اور جس کا چاہے بھاگ اپنی اچھا کے انوسار لکھ دے گا مگر اس بار شاید اس کی چھوٹ سماعت ہو گئی تھی جب ہی اس کا سامنا ایک عجیب شستی سے ہو گیا یہ اس کا ڈنڈ ہے کیونکہ وہ ڈنڈ پوترے میں نے پہلے ہی تمہیں سوچت کر دیا تھا کہ وہ اسے نہیں چھوڑے گی تمہارے متر کی کھاسمت ہو چکی ہے لے گئی وہ اسے سدا کے لئے اور تمہارے متر کے مرتبہ نے دوبارہ اس کی شستی کو جیون دان دیا ہے اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تم کیول اپنا سے نشٹ کر رہے ہو اور کچھ نہیں پرنتو ایک بات کا ہمیشہ دھیان رکھنا یہ درخت بھی مت کاٹنا ورنہ تمہارا انتھ بھی تمہارے متر جیسا ہی ہوگا اور اگر تم بھی اپنے متر کی طرح پاپ کرتے رہے ہو تو تمہارے پاس وقت ہے کہ تم اپنے پاؤں کا پراکچٹ کر لو ورنہ ایسا نہ ہو کہ سے کل جائے۔“ ہمیں سر جھکائے شیواجی کی باتیں سن رہا تھا۔

”جیسا آپ کا آدیش شیواجی کٹو!! اس درخت نے کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو؟“ اس نے کہا تو شیواجی بولے۔

اس کا ابا نے یہ ہے کہ اس درخت کے ساتھ ہی شیواجی کی مورٹی رہی پڑے کی جو اس شستی کی سیما باندھ دے گی اور ہاں یہ بھی دھیان رہے کہ شیواجی کی مورٹی یہاں سے نہ ہٹے کسی بھی طور سے اور نہ ہی کوئی اس درخت کو کاٹنے کی بھول کرے۔“ ان کی بات سن کر ہمیں نے گردن ہلا دی اور شیواجی ہمیں کو شیواجی کی مورٹی کی حقیقت کے بارے میں بتانے لگے۔



پھر ایک دم سے ان سیاہ جڑوں نے سٹنا شروع کر دیا اور ہر ش جڑوں کے ساتھ کھینچتا ہوا اس عورت کے سامنے چلا گیا۔ اس عورت نے اپنا منہ کھول دیا اس کا منہ اتنا بڑا تھا جیسے کوئی غار ہو، ہر ش چیخا ہوا اس کے منہ کے اندر چلا گیا۔

اس درخت نما عورت نے اپنا منہ بند کر لیا اور دوبارہ چیخ کر بولی۔

”پرانی شود.....!“ پھر منہ بند کر لیا اور دوبارہ دھوئیں میں تبدیل ہو کر دھرتی میں سانا شروع کر دیا، تھوڑے ہی سے میں تمام دھواں زمین میں چلا گیا اور زمین واپس برابر ہو گئی اور سب کچھ اپنی جگہ واپس آ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ہمیں واپس آیا تو ہر ش اپنے آفس سے غائب تھا، ہمیں سمجھا وہ انچ با تھ روم میں ہے اس نے ویٹ کیا پر ہر ش باہر نہیں آیا اس نے دروازہ ٹاک کر کے کھولا وہ خالی تھا ہر ش کی گاڑی بھی باہر کھڑی تھی تو وہ واپس بھی نہیں گیا تھا ہر ش کا موبائل اس کی گاڑی کی چابیوں دونوں ٹیبل پر ہی رکھے ہوئے تھے تو پھر آخر ہر ش کہاں گیا؟ ہمیں نے گاڑی سے جا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”ہر ش مرتوا ہر آئے ہی نہیں۔“

اب تو ہمیں کی چتا اور بڑھ گئی آخر ہر ش گیا تو کہاں گیا؟ ہمیں نے ہر ش کو ہر جگہ تلاش کیا کٹو اس کا کچھ پتا نہ چلا پھر ایک روز ہمیں کوگاڑ نے کال کر کے ترنت ہر ش کے سنے والے آفس آنے کا کہا ہمیں ترنت وہاں پہنچ گیا اور اپنی جگہ مل کر رہ گیا۔

”ہر ش کے سنے آفس کے بیچوں بیچ ایک تناور درخت اگا ہوا تھا جس کے دو تنے تھے یا پھر وہ درخت ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے جیسا کہ شیواجی نے بتایا تھا۔ ہمیں نے شیواجی سے دوبارہ رابطہ کیا اور ان سے استجاء کی کہ وہ اس کی سہانیتا کریں وہ اپنے متر کو کھوجتے ہوئے تھک گیا ہے اور اب یہ دو درخت اس کی مجھ کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ شیواجی ہمیں کے کہنے پر ہر ش کے آفس آ گئے اور ہمیں سے بولے۔

ابا چونکہ بہت سخت مزاج آدمی تھے تو ان سے جرح کرنے کی ہمت کسی کی نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ میں پہلی اور بڑی اولاد تھا اس لئے ہر کام کی ذمہ داری شروع سے مجھے ہی سونپی جاتی ہے۔ اہل اور میری دونوں بہنیں ابا سے تھوڑا خائف تھیں کہ کم سے کم ہمیں ایک بار گھر تو دکھا دیتے ہیں سے پہلے گھر ابا سے کہنہ کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

کہتے ہیں کہ پہلی اولاد پر سختی کرو اور اس کی اچھی تربیت کرو وہ بانی بنے۔ مجھے بھی اسی طرح پروان چڑھتے ہیں بس ابا کی اسی سوچ نے جہاں مجھے بہت اچھا سکھایا تو وہیں انتہائی سختی کا سامنا بھی بس مجھے ہی کرنا پڑا۔

ابا ایک تجرہ گزر پانچوں وقت نماز کے پابند ابجیکشن ڈپارٹمنٹ میں 17 گریڈ کے افسر بھی تھے ایک بچے اور کھرے انسان تھے۔ بس وہی اوصاف وہ مجھ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے بھی تجرہ میں ڈانٹ کر اٹھاتے۔ پھر جرح میں بھی تو اسی لئے بچپن سے میں بھی نہ صرف تجرہ گزر بلکہ پانچوں وقت کا نماز ہی بھی تھا۔

بچپن سے مجھے تحقیق کا بہت شوق رہا ہے اسی شوق کی خاطر ایسے ایسے کام کروئے کہ عام بندہ تو نہیں صرف سوچ ہی سکتا ہے۔ میں انتہائی بڑا انسان ہوں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں بس تحقیق کی جستجو میں رہتا ہوں۔

اگلے دن رمضان کی چاندنات تھی۔ خیر میں نے اپنے چار دوستوں کے ہمراہ نئے گھر میں سامان شفٹ کروانا شروع کر دیا۔ 120 گز کا گھر تھا جیسے ہی تالا کھولا تو ایک عجیب سی بو کی جیسے یہ گھر سالوں سے بند ہو۔ اس میں ایک بہت بڑا سالہا تھا اس کے ساتھ یہی گھن تھا گھن کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ۔ اوپر جانے کی سیڑھیاں اور سیڑھیوں کے ساتھ ہی اٹیچڈ ہاتھ اور پکین تھا۔ گراؤڈ فلور میں، میں نے تمام سامان دوستوں کی مدد سے سیٹ کروا دیا فرسٹ فلور پر کمرہ تھا جو کہ لاک تھا اور اس کی چابی ابا کے پاس تھی۔ فرسٹ فلور کے اوپر کشادہ سی چھت تھی جس پر ہم نے ل کر واشنگ مشین رکھ دی اور گراؤڈ فلور میں تمام سامان اچھی طرح سجایا تھا تا کہ اماں اور بہنوں کو پریشانی نہ ہو۔

سامان سیٹ کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ دوستوں نے مجھ سے اجازت لی اور چلے گئے۔ اب رات میں مجھے اکیلے ہی رہنا تھا پھر صبح پہلی سحری بھی تھی اور میں بری طرح سے تھک چکا تھا۔

میں پال میں ہی بڑے صوفے پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے ٹھنکن کی وجہ سے نیند آگئی۔ میں گہری نیند میں تھا کہ گھن میں بنے واٹر ٹینک میں پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے جا کر دیکھا تو واٹر ٹینک میں پانی گر رہا تھا مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی میں نے ہاتھوں سے ہی پانی پینے کی کوشش کی۔

اور جیسے ہی میں نے ٹینک سے پانی ہاتھ میں بھر اور منہ تک لے جانے ہی کا تھا کہ مجھے کسی نے کہا۔ ”شش..... شش“ میں نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ پھر سے میں نے پانی پینے کی کوشش کی تو پھر مجھے آواز آئی۔

”شش..... شش“ میں نے پھر سے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نہ تھا پھر میں نے پانی پینے کے لئے ہاتھوں کو منہ سے لگا یا پھر کسی نے۔

”شش..... شش“ کم دینیں چار مرتبہ ایسا ہوا اور میں پانی نہیں پی سکا۔ ایک عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی مجھے۔

میں نے اٹھ کر واٹر ٹینکر کا ڈھکن بند کر کے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اوپر سے پہلے بلب کی روشنی مزید وحشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس وقت سیڑ اور اہل ای ڈی لائٹس تو ہوتی نہیں تھیں اور پورے گھر میں ایک ہی بلب لگا تھا وہ بھی بس پال میں چاروں طرف اندھیرا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں صوفے پر آ کر پھر سے لیٹ گیا تو مجھے چھت پر سے برتن گرنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر لگا کہ سیڑھیوں سے کسی نے برتن زور سے پھینکے ہیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔

اب ان تمام واقعات کی وجہ سے میں مکمل طور پر چاک و چوبند ہو چکا تھا کہ چھت پر سے مجھے دوا دیوں کی

ہاتھیں گرنے کی آوازیں آنے لگیں میں اٹھ کر چھت پر دیکھنے لگا ان دوا دیوں کی آواز اب بند ہو چکی تھی میں اندر پل میں گیا تو پھر سے ان دوا دیوں کی باتیں گرنے کی آوازیں آنے لگیں میں پھر جا کر دیکھنے لگا تو آوازیں بند ہی طرح تین سے چار بار ہوئیں۔ میں جب آواز کے تعاقب میں باہر جا کر کھڑا ہوتا تو آواز آنا بند ہو جائے جب اندر آؤں تو باتوں کی مستقل آوازیں آئیں۔

عجیب ماجرا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا بہر حال میں پھر اٹھا۔ گھر کا مین دروازہ بند کر کے اپنی بایک پر سابقہ گھر میں آ گیا۔ جہاں پہلی سحری کی خوب ذوق و شوق سے تیاری کی جا رہی تھی میں نے غسل کر کے سحری کی اور پھر نماز پڑھ کر سو گیا۔

روزہ افطار کے بعد ہمیں سی سینٹر والے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ ہم سب وہاں آ گئے اماں اور بہنیں اسامہ اور عظمیٰ بچن سمیت کرکھانا بنانے کا انتظام کرنے لگیں اور مجھ سے چھوٹا بھائی جہاں بھی میرے ساتھ مل کر چھت پر کچھ سامان رکھوانے لگا۔ ابا تو گھن کے ساتھ والا کمرہ لے چکے تھے کہ میں وہاں اکیلے رہوں گا اماں اور دونوں بہنیں پال میں ہی رہنے کا کہہ چکی تھیں تو میں نے ان سے کہا۔

”ابا فرسٹ فلور اب تک لاک ہے اس کی چابی دیں تاکہ میں اور جہاں وہاں کی صفائی کر کے اپنے رہنے کا بندوبست کر سکیں۔“

میری بات سن کر ابا بولے۔ ”چلو لاک میں کھول دیتا ہوں۔“

ابا کی بات سن کر میں اور جہاں دونوں ابا کے بچے سیڑھیاں چڑھنے لگے ابا نے فرسٹ فلور کے کمرے کا لاک کھولا تو وہاں خون کے نشان تھے اور خون جما ہوا تھا خون کی بو بھی بہت تھی کہ سانس لینا محال ہو گیا تھا میں اور جہاں بو کی وجہ سے ناک پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگے اور روم سے باہر نکل گئے ابا نے چابی میرے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے کہا۔

”بس کرو کھانا۔ جا کر دونوں مل کر فرش دھولو اچھی طرح سے۔ یہاں ایک جالور مر گیا تھا یہ اسی کا

خون اور بد بو ہے بس اب صاف صفائی کر کے اپنے رہنے کا بندوبست کرو۔“

ابا کے سامنے کبھی کسی نے کچھ بولا ہے جو ہم آج بولتے۔ میں اور جہاں دونوں ہی فرش دھو کر اپنا روم سیٹ کرنے میں لگ گئے، اسی کام میں سحری کا وقت بھی ہو گیا تھا میں اور جہاں نیچے آ کر سحری کرنے میں معروف ہو گئے، سحری اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کی تھوڑا آرام کرنے کے بعد ہم سب اپنے اپنے مشاغل میں لگ گئے میں اس وقت یونیورسٹی کا طالب علم تھا اپنی پڑھائی میں مگن تھا ابا بھی اپنی جاب پر پلے گئے۔

دن بھر تو اماں اور بہنیں کام اور آرام میں معروف رہیں، افطار کے بعد جب رات کا کھانا کھا کر ہم سب سو چکے تھے اپنے اپنے پورشن اور کمروں میں کہ اماں کو ایسا لگا کہ میں نے آخر ان کا انگوٹھا پکڑ کر نہیں گھسیٹا ہے، وہ بری طرح چیخنے لگیں تو میں اور جہاں اوپر سے نیچے آ گئے ابا بھی اپنے کمرے سے آ گئے اسامہ اور عظمیٰ بھی بہت خوف زدہ ہی تھیں اماں کے چیخنے پر۔ اماں نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

”میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر تم نے مجھے اتنی زور سے گھسیٹا کہ میں اپنی جگہ سے گر کر یہاں آ گئی۔ تم نے ایسا کیوں کیا بال۔“

اماں کی بات سن کر میں جہاں کو دیکھنے لگا اور جہاں مجھے، کیونکہ ہم دونوں ایک ساتھ ہی نیچے آئے تھے وہ بھی اماں کی آوازیں سن کر میں نے کہا۔

”اماں میں تو ابھی اوپر اپنے کمرے سے آ رہا ہوں آپ کی آواز سن کر۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔ گلن ہے آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے۔“

اماں میری بات پر غصہ سے کہنے لگیں۔

”میں نے خواب نہیں دیکھا جو کہہ رہی ہوں سچ ہے وہ۔“

ابا فوراً اپنی گرج دار آواز میں بولے۔

”آسیہ بیگم یہ تمہارا وہم ہے چلو سو جاؤ اب۔“

سحری کا وقت بھی ہونے والا ہے کچھ دیر آرام کرلو۔“



ابا کی بات سن کر ہم سب اپنے اپنے کمروں میں آگئے پھر سونہ سکے کچھ دیر بعد سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ روز کے معمول کے مطابق اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

اظفار کے بعد رات کا کھانا سوچا کہ کھلی فضاء میں کیوں نہ کھایا جائے یعنی چھت پر۔ تو ہم سب کھانے کا سامان چھت پر لے گئے۔ اماں ہانچر ٹینک کی مرہیں ہیں تو کھلی فضاء میں رہنا انہیں اچھا لگتا ہے۔

کھانا وغیرہ کھا کر ہم سب کچھ نہ کچھ سامان لے کر نیچے آگئے باقی کے برتن اٹھانے کے لئے چھوٹی بہن اکیلی چھت پر گئی تو اس نے زور زور سے چنچنا شروع کر دیا اس کی آواز پر ہم سب بھاگتے ہوئے چھت پر گئے تو عظمیٰ خوف کے مارے بہت زور زور سے کانپ اور چیخ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر عظمیٰ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا عظمیٰ اس طرح چیخ کیوں رہی ہو کیا ہوا.....؟“

مجھے زور سے پکڑ کر وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بھائی یہاں کوئی خوف ناک چیز چھپی ہے دیکھ کر میں بہت ڈر گئی اور وہ وعائب ہو گئی۔“

ابا اور میں نے اسے اس کا وہم بتا کر اسے نیچے لے گئے اگلے دن اسامہ بچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اسے زور سے نواچا تو وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی مگر وہاں کوئی نہ تھا اس کے بازو میں درد ہو رہا تھا نوچنے کے باعث وہ ڈر گئی اس نے اماں اور عظمیٰ کو بتایا تو اماں اور عظمیٰ بھی گھبرا گئیں کیونکہ رات میں برتن گرنے کی آوازیں آنا اور چھت پر باتیں کرنے کی بہت آوازیں آتی تھیں۔

کوئی پھیر مار کر چلا جاتا۔ کوئی نوج کر چلا جاتا۔ دیکھنے پر کوئی نظر نہ آتا۔

پہلیں اس گھر میں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اماں اسامہ کی تینوں بری طرح خوف زدہ ہو چکی تھیں ابا تو ڈانٹ کر سب کا وہم بتا کر چپ کر دیا کرتے تھے ان سے بات کرنا ہی فضول ہوتا تھا۔ میں نے بھی ان

سب باتوں کو وہم کے طور پر ہی لیا تھا جہاں بھی ان تمام باتوں پر سنجیدہ نہ تھا جبکہ برتنوں کے گرنے اور چھت پر باتیں کرنے کی آوازیں ہم بھی سنتے تھے۔

بریاں ہی ہم سب بہت شوق سے کھاتے ہیں میں نے فرمائش کر دی کہ آج اظفار میں بریاں بناؤ، میں مجبور کھا کر شربت پی کر نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور سوچا کہ آج بریاں سیر ہو کر کھاؤں گا۔ میں نے کہا۔

”اسامہ تم میرے لئے کھانا نکال کر میرے کمرے میں رکھ آؤ۔ میں بس ابھی اوپر آتا ہوں۔“

اسامہ نے ایک پلیٹ میں بریاں نکال کر اوپر کمرے میں رکھ دی۔ میں پیسے ہی اپنے کمرے میں گیا تو بریاں غائب ہو چکی تھیں پلیٹ سے، میں خالی پلیٹ لے کر نیچے آیا اور اسامہ سے کہنے لگا۔

”اس خالی پلیٹ کا میں کیا کروں جب تم اوپر ہی کھا کر آ گئیں تو میرے لئے دوسری پلیٹ میں نکال کر رکھ دیتیں۔“

میری بات سن کر اسامہ کہنے لگی۔

”بھائی میں ابھی تو پلیٹ بھر کر بریاں اوپر آپ کے کمرے میں رکھ کر آئی ہوں۔ بھلا میں ایسا کیوں کروں گی۔“

اس کی بات پر میں نے کہا۔

”تو بریاں کہاں غائب ہو گئی مجھے اب پھر سے نکال کر دو۔“

”اسا جیسے ہی بچن میں بریاں لینے کی تو بریاں کا بھگوتا ہی غائب تھا۔ ہم نے پورا گھر ڈھونڈ لیا مگر بریاں کا بھگوتا کہیں نہیں ملا۔ چھت پر برتن گرنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کر وہاں گیا تو بریاں کا خالی بھگوتا پڑا تھا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

کیونکہ ہم سی سی سی کے علاقے میں رہتے تھے محلے والوں سے اتنے تعلقات ابھی نہ تھے ہمارا گھر سینٹر کا تھا۔ دونوں طرف پڑوس میں گھر تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دن کے وقت تو وہ لوگ اپنی اپنی چھتوں پر آ جاتے تھے مگر رات کے وقت اس پوری گلی کے لوگوں کو میں نے

ان کے ہی گھروں کی چھتوں پر انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس ہم لوگ ہی اپنے گھر کی چھت پر جایا کرتے تھے۔

ایک دن میں اپنے دوستوں سے مل کر واپس گھر آ رہا تھا کہ اپنے پڑوسی اکل کو باہر دیکھا تو انہیں سلام کر کے ہاتھ ملایا پھر اپنا تعارف کروایا۔

”میرا نام بلال ہے ہم آپ کے پڑوس میں ڈیڑھ ہفتے پہلے ہی شفٹ ہوئے ہیں اب کچھ لی ہم سب اپنی اپنی اسٹڈی میں مصروف رہتے ہیں پھر رمضان میں وقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر فٹنگ میں بھی مصروف رہے تو آس پڑوس میں ملنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ آپ یہاں کب سے ہیں۔“

میری بات سن کر اکل کہنے لگے۔

”چند روزہ سال سے ہم یہاں ہیں۔ بیٹا آپ لوگوں نے یہ گھر کیوں خرید لیا۔“

اکل کی بات سن کر میں چونکا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں اکل آپ کی بات۔“

اکل بولے۔ ”بیٹا بلال یہ گھر تقریباً سولہ سترہ سال سے بند ہے۔ اس گھر میں آج تک کوئی نہیں رہا۔

جب سے ہم یہاں اس علاقے میں آئے ہیں اس گھر کو بند ہی دیکھا ہے۔ یہ گھر آسب زدہ ہے یہاں تو آسب کا بھرا ہے۔ یہاں ایک لڑکی کا قتل ہوا تھا تو اس کے بعد اس گھر میں جوتا لا لگا ہے نا اب آپ لوگوں کے آنے سے ہی کھلا ہے۔ رات اس گھر سے چنچنے چلانے اور تہتوں کی آوازیں پورے محلے میں گونجتی ہیں۔ برتنوں کے گرنے کی آوازیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“

رات مغرب کے بعد اس گلی میں کوئی بھی اپنے گھروں کی چھتوں پر نہیں جاتا۔ کیونکہ اس گھر کی چھت پر نا دیدہ مخلوق نظر آتی ہے جو سب کو ڈراتی ہے اور منع کرتی ہے کہ رات میں چھت پر کوئی نہ آئے، بیٹا تم مغرب کے بعد اپنی چھتوں پر ہی نہیں جاتے۔ آپ کیسے رہے ہو۔ بیٹا

میری بات مانو تو جلدی سے اس گھر کو خالی کر دو۔ اس گھر میں جن نا دیدہ چیزوں کا بھرا ہے نا وہ آپ لوگوں کو نقصان بھی

پہنچا سکتی ہیں بہت کچھ ہوا ہے رات مغرب کے بعد اس محلے کے لوگوں کے ساتھ چھتوں پر جانے سے۔“

اکل کی بات سن کر میں کچھ پریشان سا ہو گیا پھر میں نے وہاں کے آس پڑوس کے سب ہی لوگوں سے تحقیق کرنا شروع کر دی اس گھر کے بارے میں سب نے تقریباً وہی باتیں بتائیں تھیں جو کہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے خوردشید اکل نے بتائی تھیں۔ مزید معلومات کو نہ پوچھے پتا چلا کہ سترہ سال پہلے اس گھر میں کثوم نامی لڑکی کا قتل ہوا تھا، کثوم کے والدین کا اسلام آباد میں ایک کارا کیسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ کثوم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی کافی جائیداد کی اکلوتی وارث تھی اس نے کسی لڑکے سے شادی کر لی

اور وہ کراچی شاہ فیصل کے علاقے سی سینٹر میں مکمل ہو گئی تھی اس کے شوہر نے جائیداد کی لالچ میں فرسٹ فلور کے کمرے میں اس کا گھلا کاٹ کر اسے قتل کر دیا تھا وہ چیختی رہی چلائی رہی مگر اس کے شوہر پر تو لالچ کا بھوت سوار

تھا۔ وہ یہ گھر کسی طرح کچھ کثوم کی ساری جائیداد لے کر کراچی سے چلا گیا۔ جس نے یہ گھر خریدا وہ خون دکھ کر گھر کو نا لالگا کر پٹے گئے۔ کوئی اس گھر میں نہیں رہا۔ سترہ سال سے یہ گھر بند ہے۔ اتنے سالوں بند رہنے اور قتل ہونے کی وجہ سے یہ گھر آسب کا بھرا بن گیا ہے آس پڑوس کے لوگ مغرب کے بعد اپنے گھروں کی چھتوں پر جانے سے بھی گریز کرتے ہیں کیونکہ جب بھی کوئی چھت پر جاتا ہے تو وہ مخلوق نظر آ کر بھیا تک روپ میں ڈراتی ہے۔“

یہ ساری افواہیں سن جانے کے بعد میں ابا کے کمرے میں ان سے بات کرنے گیا اور انہیں سب کچھ بتایا تو ابا کہنے لگے۔

”مجھے یہ سب کچھ پہلے سے پتا ہے تم پریشان نہ ہو اور اس بات کا ذکر اپنی ماں اور بہنوں سے مت کرنا ورنہ وہ ڈر جائیں گی۔“

ابا کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا تو میں نے کہا۔

”ابا جب آپ کو سب کچھ پتا تھا تو آپ نے یہ



## سایہ

طارق محمود - کامرہ انک

رات کے ایک بجتے ہی ایک سایہ کوٹھی کی بڑی دیوار سے برآمد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ کمرے کی دیوار سے گزر گیا اور دیکھنے والے اجنبی میں انگشت بدن داں رہ گئے۔

ایک روح کی چاہت خلوص اور والہانہ پیار کی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو تنگ کر دے گی

سانے بے تحشرے پر دن چڑھے اٹھ کر بیٹھا ہوں اور وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں اور خوب صورت گاڑیوں کو محبت سے دیکھتا رہا، کبھی کبھی گھومنے کے لئے بھی نکل جاتا تھا۔ اپنی پڑھائی پر کچھ زیادہ ہی توجہ دی تھی۔ اسی لئے دوست یا ربانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب بھی گھومنے کا من چاہا تو اکیلا ہی نکل کھڑا ہوتا ہوں اتنا کچھ ہونے کے باوجود کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہی تھی۔

## زندگی

اچھی گزر رہی تھی لیکن کچھ خشک اور بے رنگ سی تھی والدین فوت ہو گئے تھے لیکن میرے لئے دودھ کاں اور چار دکانیں جو کہ کرایہ پر چڑھی تھیں، ان کا معقول کرایہ آ رہا تھا اس کے علاوہ میرے لئے ایک تین کمروں کا پیارا سا گھر جس میں، میری رہائش ہے مکان اور دکانوں کا کرایہ اتنا آ جاتا ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اپنی دکانوں کے

تیز ہو چکی تھیں میں نے اپنی تمام تر ہمت کو نیچا کر کے درود شریف پڑھنے لگا اور بھانسا ہوا نیچے آ گیا۔

اس رات میری حالت نہ بوجھو کسی تھی، جب میں نے اب اسے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔

”اب مغرب کے بعد چمت پر نہ جانا۔“

ابا کی بات سن تو لی میں نے اور خاموش بھی ہو گیا مگر میں نے مغرب کے بعد چمت پر جانا نہیں چھوڑا، میں اکثر گرمی کی وجہ سے چمت پر جاتا مجھے وہ نادیہ قوتیں مختلف انداز میں ڈراتیں، میں ہمت کرتا اور ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کرتا جب ڈر حد سے زیادہ محسوس ہوتا تو نیچے آ جایا کرتا تھا مگر میں نے اپنی ہمت کو آ زما نہ چھوڑا۔

اسی طرح آ سب زدہ گھر میں رہتے ہوئے بڑی مشکل سے ہمیں ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا۔ ہمیں ہر طرح سے ڈرایا جاتا۔ مختلف حربے آزمائے جاتے اس ڈھائی سال کے عرصے میں ابا کو بھی ان نادیہ قوتوں کی طرف سے دھمکیاں ملتی رہیں کہ یہ گھر ہمارا ہے یہاں ہمارا پورا خاندان آباد ہے۔ یہاں ہمارا بھیرا ہے تم اپنے خاندان کو لے کر جاؤ ورنہ تم میں سے کسی ایک کی جان لے لیں گے اگر جان پیاری ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر پھر بھی تم یہاں سے نکلے تو ہم سب کو مار ڈالیں گے۔“

اس طرح کے واقعات ابا کے ساتھ بھی پیش آ رہے تھے مگر ابا ایک اسٹرائٹ آدمی تھے نمازی عبادت گزار اور تہجد گزار تھے ان مخلوق سے دودھ باتیں کرتے رہتے تھے۔

ایک دن اباں ہاتھ روم گئیں تو ان کو کسی نے زور سے دھکا دیا اور وہ گر گئیں بہنوں نے چاکرماں کو اٹھایا ہم انہیں اسپتال لے کر گئے اماں کی ناگ فریج پر ہونچکی تھی ان نادیہ قوتوں کی طرف سے ملنے والی دھمکیاں پر ابانے بخیدگی سے کام لیتے ہوئے ایک نیا گھر ڈھونڈا اور اس گھر کو ہم نے کم قیمت میں ہی فروخت کر دیا۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ ملے گھر میں کوئی واقعات پیش نہیں آئے۔



گھر خریدا ہی کیوں۔ اگر اس مخلوق نے کسی کو نقصان پہنچا دیا تو۔“

میری بات سن کر ابا غصہ کرتے ہوئے بولے۔  
”بس کرو بال اس طرح کی باتیں۔ اللہ نے انسان کو زیادہ طاقتور بنایا ہے اچھا بس اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی یاد رہے اماں اور بہنوں سے مت کرتا یہ بات۔“

ابا کی بات سن کر میں غصے میں اپنے روم میں آ گیا اب تو یہ روز کا معمول تھا کہ کھانا بنا کر کھو پورا کا پورا کھانا برتن سمیت غائب، کوئی ٹیبلر مار کر جاتا تو کوئی نوج کر چلا جاتا اور جب دیکھو تو کوئی نظر نہ آتا۔

خیر ایک رات میں چمت پر اکیلا ہی نکلے چادر لے کر سونے چلا گیا۔ رات میں، میں نے چادر بچھائی نکیہ لگایا اور لیٹ گیا۔ کھلی فضا کھلا آسمان اس پر سچے چاند ستارے اور چاند کی روشنی بہت دلکش لگ رہی تھی اوپر سے ٹھنڈی ہوا کے جھوکے، میں بہت لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میری نظر بڑوں کے گھر کی چمت پر پڑی جو ہماری چمت سے ذرا اوپر تھی ان کی چمت پر ایک ساڑھی پہنے ہوئے عورت مجھے مشتعل دیکھ رہی تھی میری نظر جب اس پر پڑی تو میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو اس نے اپنی بہنوں میں اچکا کر اشارہ کیا کہ ”کیا ہے۔“

میں بس اس کو ہی دیکھ رہا تھا کہ تین بار انہوں نے اپنی بہنوں میں اچکا کیں تو میں نے پہچان لیا کہ یہ خورشید انکل کی والدہ ہیں اور وہ مشتعل مجھے دیکھ رہی ہیں تو میں نے انہیں مسکرا کر سلام کیا۔

”السلام وعلیکم۔“ میرا سلام سنتے ہی ان کے بال ایک دم بکھرنے لگے چہرہ بھی ہلکے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھیانک چہرے کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

پھر میرے ذہن نے کام کیا کہ یہ ساڑھی والی خاتون خورشید انکل کی والدہ کیسے ہو سکتی ہیں وہ تو مرجی ہیں وہ مجھے مشتعل سمجھ رہی تھیں ان کا چہرہ انتہائی بد صورت اور خوفناک ہو چکا تھا زندگی میں پہلی بار مجھے خوف محسوس ہوا تھا میں پسینے میں نہا چکا تھا میرے دل کی دھڑکیں انتہائی

ایک دن چچا منظور جو کہ میرے کرایہ دار تھے نے مجھے کہا۔ ”علی بیٹا کب تک یوں اکیلے رہو گے..... شادی کرلو۔“ ان کی بات سن کر میری دل زور سے دھڑکا اور میں اچھل پڑا بات سامنے کی گئی لیکن..... اس دن سے میں جب بھی کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتا تو سن میں کھد بدمی ہونے لگتی۔ لیکن یہ کھد بد اس لڑکی کے سامنے سے بہت ہی ختم ہو جاتی اور میں جو پینے پینے کی تیاری کر رہا ہوتا تھا کہ اچانک واپس اپنی پوزیشن پر آ جاتا۔ ”اور پھر سوچا شادی کے بارے میں۔“ چچا منظور نے پھر ایک دن پوچھا۔ ”چچا شادی کر تو لوں لیکن کوئی لڑکی نظر میں ہے تو سوچ“ میں نے دل پر ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا۔ تو چچا مسکرائے۔

”وہ ایک چھوٹی سی ڈنر پارٹی تھی جو کہ میرے ایک رشتہ کے ماموں کی شاندار کوٹی میں تھی۔ جس میں مجھے بھی انوائٹ کیا گیا تھا میں ایسی محفلوں میں کم ہی جاتا ہوں لیکن یہاں ایک تو بات رشتہ داری کی تھی اور دوسرا میرے تعلق دار اور اپنے مجھے مغرور سمجھتے تھے۔ اسی لئے میں نے یہ پارٹی انڈی کی۔

پارٹی بوری تھی میں بھی لئے دیئے والا بندہ تھا اور میرے ماموں اور ان کی فیملی بھی رشتہ داروں سے زیادہ میل ملاپ رکھنے والے نہ تھے۔ اسی لئے میں ان کے گھر بنے چڑیا گھر اور پھر ایک یوم میں رنگ برنگی چھیلوں سے دل بہلاتا رہا۔

کھانا بھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ میں دس بجے وہاں پہنچا تھا۔ اور بارہ بجے والے تھے، ایک ویٹر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس پارٹی کا کوئی مہمان خصوصی بھی ہے اور جب مہمان خصوصی محفل میں آیا تو سب کی نظر اس طرف لگ گئیں میں بھی اس شخصیت کو دیکھتے ہی چڑیا گھر سے نکل کر کوٹی کے اندر جی محفل میں آ گیا جہاں ہر جوان اور بڑی عمر کا مرد اس شخصیت کے ارد گرد نظر آ رہے تھے، ہلکے مہرون کمر کے کپڑوں پر سفید پھولوں والی چادر اوڑھے چہرہ پہ میک اپ کے نام پر کئی سی لپ اسٹک اور ہاتھ میں شیج موبائل اس کے تھوڑا سی

پچھے کالی چست پینٹ شرٹ میں ملبوس دونو جوان جو کہ اس شخصیت کے یقیناً باڈی گارڈ تھے۔

”او بھائی..... یہ لیزڈی کون ہے۔“ ایک ویٹر سے پوچھا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”کون سے شہر سے آئے ہو اس شاہینہ کو کبھی جانتے۔“

”او“ میرے منہ سے نکلا اور وہ ویٹر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مس شاہینہ کے آتے ہی اس محفل میں جان سی پڑ گئی کہیں سے پیانو کی مدھ مدھ بجنے لگی جو کہ اس ماحول میں فسون سا جگانے لگی۔ میں مس شاہینہ کے نزدیک تو نہیں گیا لیکن ایک کونے پر بیٹھا، وہ جدھر جاتی میری نظریں اس کا تعاقب کرتیں، اس کی عمر میں سے کچھ زیادہ ہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنہال کر رکھا ہوا تھا اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی والد والدہ دونوں حیات تھے اور جاگیر دار تھے نجانے کتنے ہی رشتے آئے لیکن مس شاہینہ نے کچھ نہ کچھ بھانہ کر کے ان سے شادی سے انکار کر دیتی۔ یہ سب معلومات مجھے اسی محفل میں گھومتے پھرتے مل گئی میری عمر پچیس سال تھی لیکن میں نے سامنے لگے ایک شیشہ میں اپنے آپ کو دیکھا اور ساتھ ہی تصور میں مس شاہینہ کو کھڑے دیکھا تو مجھے یہ جوڑی بہت ہی اچھی لگی۔

ادھر ادھر لوگوں کے درمیان گھومتے ہر کسی کو نہیں کر سکتے ہوئے مس شاہینہ نے دو تین بار مجھے دیکھا میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی لیکن اس کا چہرہ کسی تاثر سے عاری تھا۔ میرے رشتہ کے ماموں اس کے سامنے جیسے جیسے بچے بچے جاتے تھے اس پارٹی میں چند سیاسی لوگ بھی تھے جن سے مس شاہینہ کچھ زیادہ دیر تک باتیں کرتی رہی اور پھر ڈنر کا وقت ہوتے ہی ڈنر شروع ہو گیا۔

مس شاہینہ کو دیکھنے کے بعد کھد بدی میرے دل میں ہوئی تھی وہ اس کے جانے کے بعد ختم نہ ہوئی بلکہ وہ اتنا بڑھی کہ مجھے کسی پل چین نہ تھا دو دن بہت ہی بے تابلی میں گزرے آخر اس کا دیدار کرنے کی ہمت باندھی اور اس کے محل کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ایک

درخت کے نیچے جا بیٹھا پورا دن وہاں بیٹھا بے چینی سے محل اور اس کے گیٹ کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید وہ نکلے اور اس کو دیکھ کر دل کی کھد بد کچھ سکون لے سکے نہ کہانے کا ہوش تھا نہ ہی کچھ پینے کا، آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور محل کا بڑا سا گیٹ کھلنے لگا پھر سفید رنگ کی بڑی گاڑی میں فرنیٹ سیٹ پر آنکھوں پر سن گھاسز لگائے مس شاہینہ محنت سے براہمان نظر آئی۔ اسے دیکھ کر دل کی حرکت پہلے سے تیز چلنے لگی۔ گاڑی میرے سامنے سے گزر گئی اس نے ہلکا سا جھکی اور ادھر نہ دیکھا میں نے اسے چند ساعت نظر بھر کر دیکھا لیکن اس سے سکون نہ ملا بلکہ دل کرنے لگا اور دیکھوں اور دیکھوں پر مجھے وہاں سے اٹھنا ہی پڑا کیونکہ وہ علاقہ امیر لوگوں کا تھا۔ صنعت کار، مل آئرز اور جاگیر دار اسی لئے وہاں سے خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں چائے پی اور پھر گھر کی راہ لی۔ بے سکونی، بے چینی اور میں، دوسرے دن صبح ہی صبح میں پھر اس محل کے سامنے کھڑا ہونے کے لئے چل پڑا۔ اپنے خیالوں میں مس شاہینہ کے خیالوں میں کھویا چپ چاپ سر نہوڑائے چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے سے آ کر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا میں نے چونک کر سر ہٹا کر دیکھا سامنے چچا منظور جی آگے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑے تھے۔

”میاں علی..... کہاں گم مسم جا رہے ہو میں نے دو تین دفعہ آپ کو پکارا لیکن آپ تو سن کے ہی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

”نہیں چچا کچھ نہیں کوئی گڑبڑ نہیں۔ ذرا ایک کام سے جا رہا تھا۔ اسی کام کے بارے میں تانے بانے بن رہا تھا۔“ میں نے باتیں ہاتھ سے گردن کھجاتے ہوئے جواب دیا تو چچا منظور مسکرائے۔

”چلو میاں اچھی بات ہے تمہیں بھی کوئی کام تو سوچا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ان سے اجازت لی اور پھر ایسے ہی چلتے چلتے پینٹل بینک کے سامنے سے ہوتا ہوا مس شاہینہ کے علاقہ کی طرف مڑا ہی تھا کہ میری نظر مس شاہینہ کے ایک باڈی گارڈ پر پڑی جو کہ بینک کے

باہر انٹینشن کھڑا تھا میں ٹھیک کر رک گیا میری نظریں پارکنگ میں پھرنے لگیں اور پھر میں نے مس شاہینہ کی گاڑی پارکنگ میں ایک طرف کھڑی دیکھ لی اب میں باہر ایک بیچ پر بیٹھا اس کے بینک سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ چندر میں منٹ بعد وہ بالو کٹر پڑوں میں سر پر سفید دوپٹہ کئے بینک سے نکلتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی نکلا جو کہ مجھے کچھ مشکوک سا لگا۔ بینک کی سیڑھیاں اترتے ہی اس نے موبائل نکالا اور بیچ ٹاپ کرنے لگا۔ شاید اس نے بیچ بیٹھ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے مس شاہینہ کی طرف ایک نظر دیکھ کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا لیکن مس شاہینہ اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ چلتے ہوئے میرے سامنے سے گزر کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ آج بھی اس نے ادھر ادھر نہ دیکھا بلکہ نیچے دیکھتے ہوئے ہی گزر گئی۔ اس کی گاڑی پارکنگ سے نکلی ہی تھی کہ ایک موٹر سائیکل سوار اسپید سے پارکنگ میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ وہ سیدھا گاڑی کے ساتھ جا کر مایا، موٹر سائیکل سوار ہوا میں اڑ کر پارکنگ کے ساتھ بنے پلاٹ میں لگے ایک فوارے کے پانی میں جا کر۔ گاڑی ادھر ہی رک گئی تھی۔

مس شاہینہ اور اس کا باڈی گارڈ گاڑی سے نکل آئے۔ شاید وہ موٹر سائیکل سوار کو دیکھنا چاہتے تھے۔ میں بھی آہستہ سے بھاگ کر ادھر پہنچا۔ میں نے ان سے پہلے موٹر سائیکل سوار تک پہنچ کر اسے پانی میں سے نکالا زیادہ چوٹ لگنے سے اس کی بچت ہوئی میں اسے نکال کر پلاٹ کے گھاس پر لایا ہی تھا کہ میری نظر بڑک پر آتے ہوئے ایک بلیک ٹری موٹر سائیکل پر پڑی جس پر دو نقاب پوش بیٹھے تھے۔ پچھلے کے ہاتھ میں مجھے پستول کی جھلک نظر آئی۔ ان دونوں کی آنکھیں مس شاہینہ پر مرکوز تھیں۔ موٹر سائیکل کے ٹاپے پر رکھا تھا۔

”چیف آف ڈیوٹی۔“ میں نے اس ڈنڈی موٹر سائیکل والے کو تیزی سے پلاٹ کے گھاس پر ڈالا تو میرے ذہن میں باز آگئی تھی کہ ”مس شاہینہ کو بچاؤ“ پھر میں نے ایک چپ لیا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس کے



سامنے آ گیا اسی وقت ترزا گولیاں چلیں مجھے دائیں کندھے اور پیٹ میں گرم سلاخیں محسوس ہوئیں میں زور سے زمین پر گر کر اس زمین سے ٹکرائے ہی ایک اور درد کی لہر اٹھی اور میرا دماغ جیسے سن ہو گیا۔

ہوش آیا تو ایک نرم سے بستر پر لیٹا تھا۔ دائیں بازو پر ڈرپ لگی تھی۔ بڑا سا کمرہ تھا پاس ہی ایک نرس کھڑی دیوار کی طرف کچھ دیکھ رہی تھی۔ یہ اتنا بڑا کمرہ یقیناً کسی اسپتال کا نہ تھا میں اٹھ کر بیٹھا تو سر چکرانے لگا۔ سر پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا کندھے اور پیٹ پر جھنکی تھی نرس نے محسوس کر لیا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں اس لئے وہ پلیٹ کر میرے پاس آ گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ بند آنکھوں سے بھی اس کا ہیولہ مجھے نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنے اوپر جھکے ہوئے محسوس کرتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے میری طبیعت کے بارے میں دو تین باتیں پوچھیں میں کچھ سوچ کر سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا وہ سر ہاں میں ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی اس کے جانے کے چند من بعد اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور باڈی بلڈر ٹاپ آ دی جو کہ بڑی عمر کا تھا۔ ہینڈ سٹم سمبھرتن تراش خراش والا سوٹ پہنے اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے آہستہ سے سلام کا جواب دیا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو۔“

”ٹھیک۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر میرے اوپر جھک گیا۔ اس نے پٹی اتار کر کندھے اور پیٹ کے زخم دیکھے۔ ”ابھی کچھ دن تک تم..... جل پھر نہیں سکتے۔“ ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا تو وہ پٹی لگانے لگی۔

”لیکن میں ہوں کہاں۔“

”تم انہوں میں ہو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس ہینڈ سٹم آ دی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اس کا باپ ہوں جس کی تم نے اپنی جان پر کھیل کر جان بچائی ہے۔“ اس کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی نرس زیادہ تر میرے کمرہ میں ہی رہتی

تھی اور ڈاکٹر دو چکر لگا تا صبح اور شام لیکن مس شاہینہ مجھے نظر نہ آ رہی تھی میں خود حیران تھا کہ جس کی میں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے جان بچائی وہ تو شکر یہ ادا کرتے تک نہ آئی میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کمرے کے دروازہ کو تاک کرتی اندر آئی میں اسے دیکھ کر آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا لیکن اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی پھر باتوں باتوں میں اس نے بہت ہی اچھے انداز سے میری طبیعت کا پوچھا۔ میرا شکر یہ ادا کیا۔ میں خود میں پھولے نہ سہا رہا تھا۔

”آپ کو کیسے احساس ہوا کہ وہ موٹر سائیکل سوار مجھ پر قاتل کرنے آئے تھے۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں جب ڈی موٹر سائیکل والے کو پانی سے اٹھا کر باہر لایا تھا تو مجھے سامنے سے آتے ہوئے وہ مشکوک موٹر سائیکل والے نظر آئے..... مشکوک اس لئے کہ ان کے چہرہ خراب سے ڈھکے تھے اور پچھلے کے ہاتھ میں پستول تھا جو کہ تیار حالت میں تھا اور وہ دونوں آپ کی طرف دیکھ رہے تھے تو بس۔“

میں نے بات ختم کی۔ ”چھاتی اب وہ لازمی اور بہت ہی اہمورث سوال۔“ مس شاہینہ کی بات سن کر میں چونک گیا میرے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔

”آپ نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے میری جان کیوں بچائی۔“ آخر اس نے وہ سوال کر دیا جس سے میں بچ رہا تھا۔

”اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا اور ہو سکتا ہے کہ کبھی نہ بتا سکوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتی گئی لیکن کہا کچھ نہیں تقریباً ایک ماہ تک میں نے بھرپور ریسٹ کی آخر دنوں میں پہل قدمی کرتے ہوئے اس عمل کے بڑے سے لان میں پھولوں کی معطر فضا میں خوب سانس لیتا، میں اس عمل سے لگتا تو جیسے بھول ہی گیا۔ میرے ذہن میں ہی نہ رہا کہ یہ میرا گھر

نہیں اور جب میں ٹھیک ہو گیا زخم بھر سے گئے تو اچانک مجھے جیسے یاد آیا کہ میرا اناجی ایک گھر ہے جب میں نے سوچا کہ اب ان لوگوں کے سر سے اترا جانا چاہئے دل تو کہہ رہا تھا کہ ڈھیت بن کر مس شاہینہ کا دیدار کرتا ہی رہوں لیکن مروت بھی کچھ چیز تھی۔

اسی شام میں بصیر صاحب کے آنے کا انتظار کر رہا تھا مس شاہینہ کے والد بصیر صاحب۔ وہ شام کو میرے کمرہ میں آئے اور پاس بیٹھ کر طبیعت کے بارے میں پوچھا کیونکہ اب میں ٹھیک تھا۔ اسی لئے میں نے اسے سب اچھا ہی کہا تھا اس کے بعد میں وہاں سے جانے کے لئے ان سے بات کرنے کے لئے مناسب الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے خودی بات شروع کر دی۔

”علی..... تم اپنے آپ کو یہاں کھٹی فیل نہ کرو..... تمہیں شاید احساس نہیں کہ تم نے ہماری بیٹی کی جان بچا کر ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے..... اب میں چاہتا ہوں کہ تم شاہینہ کے..... انہوں نے اتنا کہہ کر کچھ سوچا میرے دل کی دھڑکن متزلزل ہونے لگی۔ شاید شاید انہیں میرے دل کی بات بتا چلی تھی ہو۔

”اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی شاہینہ کے سیکرٹری بھرایلو انڈر بن جاؤ کیونکہ وہ اس انکیشن میں ایم بی اے کے لئے لڑ رہی ہے۔“

”اوہ“ میرے منہ سے ایک لمبے سانس کے ساتھ نکلا۔ بصیر صاحب نے مجھے کچھ حیرت سے دیکھا۔

”لگتا ہے تمہیں اس بات کو جان کر حیرت ہوئی ہے..... میں اب اس پر لبا لیجھ تو نہیں دے سکتا لیکن بس اتنا کہوں گا کہ یہ انکیشن بہت بھجوری میں لڑنا پڑ رہا ہے اور تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ ہم نے تمہیں جانے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا..... لیکن بلکہ میں نے تمہارے زخمی ہونے کے بعد تمہارے بارے میں پوری معلومات کر لی ہیں تم پر مجھے لکھے ہو لائق لڑ کے ہو۔

ہاں شاہینہ نہ کرنا بس تمہارا کام ہے جی جاتے ہو۔“

ان کی یہ بات سن کر میں کسمسا کر رہ گیا اور وہ مسکراتے گئے۔

”میں نے پہلی ہی کہا تھا کہ مانڈ نہ کرنا۔“

”انس اوکے سر۔“ میرے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ ”تم اس بارے میں خوب سوچ لو اگر تمہیں یہ آفر اچھی لگے تو بخوہ اور رہائش وغیرہ کے بارے میں بات کر لیں گے۔“

اس کے بعد وہ مجھے آرام کرنے کا کہہ کر وہاں سے چل دیئے۔

وہ رات مجھے نیند نہ آ رہی تھی یہ نہیں کہ میں اس آخر کے بارے میں غور کر رہا تھا بلکہ یہ آفر تو میں نے بصیر صاحب کے جانے کے بعد ہی قبول کرنے کا سوچ لیا تھا۔ مجھے تو مس شاہینہ کے ساتھ ایک بہترین وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ سوچ تھی کہ وہ کون سی ایسی بھجوری تھی جس کی وجہ سے مس شاہینہ کو انکیشن میں حصہ لینے کو ضروری تھا۔

رات آدھی گزر رہی تھی کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی، میری آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں کہ اچانک مجھے لگا کہ کھڑکی کے سامنے سے کوئی سایہ لہرایا ہو جیسے آہستہ آہستہ میں نیند کی وادی میں جا رہا تھا اسی طرح آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا اور پھر کھڑکی پر جا کر باہر دیکھنے لگا میری نظر میں لان میں گردش کر رہی تھیں۔

مس شاہینہ کے کمرہ کی دیوار کے باہر ہی مجھے وہ سایہ کھڑا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھولی اور اس میں سے اتر کر باہر کود گیا۔ میرے قدم زمین پر نکتے ہی ہلکی سی تھپ کی آواز آئی۔ اس سایہ نے پھر بھی میری طرف پلٹ کر نہ دیکھا سیدھا ہوتے ہی میں اس کی طرف دوڑ پڑا گھاس تھا۔ اور میں جتنے پاؤں اسی لئے بھاگنے سے عجیب سی دھمک پیدا ہو رہی تھی لیکن وہ سایہ اسی طرح مس شاہینہ کی کھڑکی کے سامنے مجھ سے بے پرواہ کھڑا تھا۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر اس پہ چھلانگ لگادی لیکن مجھے ایک حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میں اس سایہ میں سے اڑتا ہوا گھاس پر جا گر۔ وہ حقیقت میں سایہ ہی تھا لیکن کس کا، میں نے ادھر ادھر دیکھا مجھے وہاں کوئی آدی نظر نہ آیا جس کا وہ سایہ ہو۔ پھر میں نے جلدی

سے اس سایہ کی طرف دیکھا جو مسلسل مس شاہینہ کی کھڑکی پر نظر میں جمائے کھڑا تھا میرے جسم سے ٹھنڈا پسینہ نکلنے لگا۔ اس سایہ کی کسی آدمی کے بغیر یہاں موجودگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے کوئی باور دانی چکر لگ رہا تھا۔ میرے دل پہ ایک ہیبت سی ڈیرہ ڈالنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ بس ابھی سانس رک جائے گا۔ میں پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکلا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ اور اس کے فغاش بلند ہوتے ہی اس سایہ نے میری طرف سر گھمایا، میری زبان پہ ورد جاری رہا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ غائب ہو گیا۔ میرے منہ سے کھٹی کھٹی چیخ نکلی، میں ہیبت سے پیچھے الٹ کر کر پڑا، جانے کتنی دیر میں بے سدھ سالان کے گھاس پہ پڑا تھا۔

ادھر صبح کی آذان ہوئی اور ادھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اس لان میں بے یقینی سے اپنے آپ کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو دیکھا وہ واقعی میں تھا یا کوئی خواب تھا یہ سوچتے ہوئے میں وہاں سے چلتے ہوئے کمرہ میں آ کر بیٹھ کر گر گیا۔ وہ سایہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے لہرا سا جاتا اور پھر میں نیند کی گہری وادی میں چلا گیا۔

اور جب میں اٹھا تو دو پہر گزر رہی تھی، ملازم ناشہ کا پتہ کرنے آیا تو میں دو پہر کا کھانا اور ساتھ میں چائے منگوا لی۔ اس کے کھانا لانے تک میں فریض ہو گیا۔ کھانے کے برتن اٹھاتے وقت ملازم نے بتایا کہ بصیر صاحب صبح سے دو تین دفعہ یاد کر چکے ہیں، میرے ذہن میں فوراً رات والا واقعہ پھرنے لگا جانے وہ کیا تھا کیوں تھا کس لئے تھا ملازم جب چلا گیا تو میں بصیر صاحب اور مس شاہینہ کے بارے میں سوچنے لگا جو کہ یقیناً میرے جواب کے منتظر ہوں گے۔ مجھے تو اپنی خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن ان لوگوں کو مجھ سے بہت بہتر ایسے لوگ مل سکتے تھے جو کہ سیاست میں چلے پھرتے پڑے تھے اور وہ ایک بہترین مینیجنگ پرائن کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے جبکہ مجھے

سیاست کی شد بد ہی نہ تھی تو پھر یہ لوگ میرا ہی انتخاب کیوں کرنا چاہتے تھے کیا اس لئے کہ میں نے مس شاہینہ کو بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی یا پھر ان بڑے لوگوں کو قربانی کے لئے ایک بکرے کی ضرورت تھی میں تو بکرا بھی ایسا تھا کہ جس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میرے گمشدہ کسی قسم کی چوہن میں چھپنے کے بعد ایسا کوئی نہ تھا جو کہ میرے بارے میں پوچھتا چھوڑتا کہ میں نہیں پر مجھے ایک بات یاد آگئی جس کا احساس مجھے اتنی شدت سے ہوا کہ میں بصیر صاحب سے ملے ہی اس بارے میں پوچھ لیا کہ جب مس شاہینہ پر سر عام گولیاں چلیں جو کہ میں نے اپنے جسم پر کھائی تھیں تو لازماً پولیس کیس بھی بنا ہوگا مجھ تک پوچھتا چھوڑنے کے لئے کوئی پولیس والا نہیں آیا اور وہ آدمی کون تھے جو کہ مس شاہینہ کو مارنا چاہتے تھے۔ میرے ان سب سوالوں کا بصیر صاحب کے پاس ایک جواب تھا وہ دونوں موٹر سائیکل سوار پولیس والوں کو موٹر سائیکل کے ساتھ ہی ایسی حالت میں ملے کہ کسی نے انہیں قتل کر کے ان کی شناخت منہ کر دی تھی اور موٹر سائیکل چوری کی تھی پولیس تفتیش کر رہی ہے جلد ہی کوئی نتیجہ سامنے آئے گا میں ان کے اس جواب پر مطمئن نہ تھا۔ لیکن کبھی کیا سکتا تھا۔

میں نے بصیر صاحب کو مس شاہینہ کے ایڈوائزر کے طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔ بصیر صاحب میرے اس فیصلے پر بڑے خوش لگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مس شاہینہ سے ملوایا اس نے بھی میرے اس فیصلے کو سراہا۔ بصیر صاحب ہم دونوں کو وہاں بیٹھا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ میں مس شاہینہ کے بے داغ چہرے کو غور سے دیکھ کر رات کے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا تو وہ بالکل ہشاش بشاش تھی اس کا مطلب تھا کہ ابھی اس کا اس سایہ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

”علی تمہارے ذہن میں اس بارے میں بہت سے سوالات ہوں گے کہ سیاست میں تو کتنے ہی ایڈوائزر ہوں گے کتنے ہی کل پڑے ہوں گے تو ہم نے تم کو ہی کیوں رکھا..... اس کا آسان سایہ میرے

پاس جواب ہے کہ میں کسی پہلے سے سیاسی آدمی کو رکھنا ہی نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے فائدہ کے لئے مجھے ہر طرح کے داؤ بیچ سکتا ہیں گے اور چاہے میں جتنا بھی بچوں ان کے داؤ بیچ میں آخر آ جاؤں گی اس لئے میری خواہش تھی کہ میرے ایڈوائزر کے طور پر کوئی نالیگن پڑھا لکھا اور کچھ دار بندہ ہونا چاہئے..... تمہارا تعلق سیاست سے نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہر آنے والے مشکل وقت میں مجھے بہترین کانڈیزس دے سکتے ہو۔“

مس شاہینہ کی باتیں سن کر میں خوشی سے پھول سا گیا۔ میرے ذہن سے خدشات کی گرد کچھ کم ہوئی۔ ہم سب نے رات کا کھانا ساتھ کھایا اس کے بعد میں اجازت لے کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔ بیڈ پر لیٹ تو گیا لیکن دن بھر سوئے کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میری آنکھیں کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ مجھے اسی سایہ کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے میں نے اپنے لئے چائے منگوا لی۔ ملازم کو قہر اس میں لانے کا کہا تاکہ رات جب بھی طلب ہو آسانی سے بی لوں۔ ایک بجنے والا تھا میری نگاہیں پنجرہ انداز میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں کہ اچانک کوئی کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔ میں چونک کر اٹھا اور کھڑکی کے پت کھول کر ادھر سے ہی باہر جس طرف کوئی گیا تھا دیکھا وہ ہی سایہ درمیانی اسپڈ سے چلتا ہوا مس شاہینہ کے کمرہ کی کھڑکی طرف جا رہا تھا۔ میں پھولوں کے پودوں کے ساتھ چھپتا ہوا اس کے پیچھے جانے لگا۔ اب وہ سایہ کھڑکی کے عین نیچے کھڑا کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پودوں کے ساتھ چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔

اسی وقت سایہ کھڑکی کی طرف بڑھا میں اس کے انداز سے چونک اٹھا کیونکہ اس نے بھاگنے والے انداز میں دو اسپڈ لئے اور جب لگا کھڑکی پر چڑھ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر آ گیا۔ میں پھولوں کے ساتھ حیرت سے کھڑا کھتا رہ گیا۔ قریباً پانچ منٹ سے زیادہ مجھے ادھر ہی حیرت زدہ کھڑے ہوئے تو میں ایک لمبا سانس لے کر شش و پنج

میں مبتلا اس کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کے پت بند تھے جبکہ میں نے خود کھلی کھڑکی سے اس سایہ کو ادھر کودتے دیکھا تھا میں اس کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن اوپر لٹک کر اس میں سے جھانکنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی میں سوچ میں پڑ گیا کہ اندر دیکھوں یا چپ چاپ واپس اپنے کمرہ میں چلا جاؤں۔

اچانک میں نے اندر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور لپک کر ایک جھپ لگایا اور کھڑکی کے اوپر بنے چھتے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اندر جھانک کر شیشوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرہ میں چھوٹا بلب جل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے پورے کمرہ میں جہاں تک ان شیشوں سے نظر آتا تھا دیکھا لیکن وہ سایہ مجھے نظر آیا اور پھر میری نظر سامنے دیوار کے ساتھ پڑے بیڈ پر پڑی میں چونک اٹھا بیڈ پر مس شاہینہ کے ساتھ کوئی تھا وہ دونوں آپس میں کھل کے اندر گھس گھس رہے تھے۔ میں اس طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک کے سر پہ سے کھل پٹا کہ مجھے دیکھا اس کے دیکھتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا اور میرے ہاتھ مجھے سے چھوٹ گئے میں بیٹھ کے بل زمین پر گر کر میرا جسم جھنجھٹا اٹھا۔ میرا داغ حیرت کے شگے میں تھا کیونکہ میری طرف دیکھنے والا سو فیصد وہ سایہ ہی تھا۔ میں نے جو کچھ اندر دیکھا تھا اس کے بعد تو میری وہاں سے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو پاری تھی۔

میں آج بھی بے سدھ سا پڑا رہا جیسے کہ زمین نے مجھے اپنے ساتھ چپکالیا ہو۔ صبح کی آذان ہوئی تو میں اٹھ کر اپنے کمرہ میں جا کر سو گیا لیکن صبح دس بجے مجھے اٹھا دیا گیا کیونکہ سیاسی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں میں نے مس شاہینہ کی طرف کئی بار غور سے دیکھا لیکن وہ بالکل ہشاش بشاش اور ہر گز سے جیسے آزاد تھی۔

میٹنگ اور پھر کچھ کنکشن اینڈیز کرتے رات کے دس بج گئے واپس آ کر کھانا کھاتے ہی میں اپنے کمرہ میں چلا گیا آج پھر میں اسی سایہ کا انتظار کرنے جا رہا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ یہ چکر کیا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا بیڈ



پر لیتے لیتے اٹھ آنے لگی۔ جاننے کی بہت کوشش کی لیکن آگھیں بند ہونے لگیں پھٹیں پھٹیں ہو گئیں۔

مجھے ایسا لگا کہ کمرہ میں کوئی ٹہل رہا ہو میں نے زور لگا کر آگھیں کھول دیں وہ سایہ مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آیا میری زبان پسا یک دم سے آیا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ اچانک مڑ کر بھاگا کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن وہ رک نہیں اور بند دروازہ سے پار ہو گیا، میں اٹھ کر حیرت سے بیڑ پر بیٹھ گیا میں نے سوچ لیا کہ بصیر صاحب سے اس سایہ کے بارے میں بات کروں گا میرے خیم میں اس سایہ کو دیکھتے ہی سستی پھیل جاتی تھی اس کے جانے کے بعد بھی داغ کسی بھی سوچ سے خالی رہتا تھا لیکن اس رات میں اس کے جانے کے بعد اس کا قلع قمع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور اس کے لئے بصیر صاحب کو اعتماد میں لیان بہت ہی ضروری تھا لیکن.....

جب میں نے بصیر صاحب سے اس بارے میں بات کی تو وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری عقل پر یقین نہ رہا ہو پھر بھی انہوں نے میری بات مکمل سنی اور پھر اگلی رات میرے ساتھ ہی اس سایہ کو دیکھنے کے لئے تیار بیٹھے تھے کہ وہ سایہ میری کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا میں نے بصیر صاحب کو مخاطب کر کے جو کہ میری طرف دیکھ رہے تھے اس سایہ کی طرف متوجہ کیا اور اٹھ کر کھڑکی سے کوکر باہر نکل آیا بصیر صاحب بھی میرے پیچھے آہستہ سے اترے، میرا رخ اس سایہ کی طرف تھا جو کہ آہستہ آہستہ مس شاہینہ کی کھڑکی طرف بڑھ رہا تھا، میں نے بصیر صاحب کو اس طرف اشارہ کر کے سایہ دکھانے کی کوشش کی انہوں نے میری انگلی کی سیدھ میں اس طرف غور غور سے دیکھا شروع کر دیا روشنی کم ہی تھی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہ تھا کہ وہ سایہ ان کو نظر نہ آتا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے آج پھر سایہ کھڑکی سے لٹک کر اندر چلا گیا میں نے بصیر صاحب کو اس کھڑکی تک لے جانا چاہا لیکن انہوں نے مجھے بازو سے

پکڑا اور گیلری سے چلتے ہوئے مس شاہینہ کے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازہ کھٹکنا ڈالا۔ مس شاہینہ تیسری دفعہ دروازہ کھینچ کر آواز دیتی آئی اور دروازہ کھول دیا۔ بصیر صاحب نے اس سے استفسار کیا لیکن اس نے ایسے جواب دیا جیسے کہ وہ حقیقت میں اس سایہ سے بے خبر ہے میں بھی اس کا مضبوط پھیرن کر حیران رہ گیا۔

اسی لئے میں نے چپ سادھ لی کیونکہ بصیر صاحب کو وہ سایہ نظر نہیں آیا تھا۔ اور مس شاہینہ میرے سے ہی کمرہ گئی تھی اس نے کسی سایہ کے بارے میں جاننے سے صاف انکار کر دیا تھا اس کے بعد دو دن تو ان باپ بیٹی نے مجھے بلایا تک نہیں اور تیسرے دن بصیر صاحب ایک محزون سے شخص کو لے کر میرے کمرہ میں آ گئے انہوں نے اس آدمی کا تعارف ایک قریبی دوست کی حیثیت سے کرایا اور میرا بھی تعارف کرا کر چلے گئے۔ وہ آدمی مجھے پہلے تو سیاست کے داؤ بیچ کے بارے میں بریفنگ دینے لگا اس کی معلومات میرے لحاظ سے کمپلیٹ معلومات تھیں میں بھی اس سے مکمل مل گیا اور ان چند دنوں میں مختلف فنکشن میں لوگوں میں گھوم پھر کر جو معلومات سیاست کی لی تھیں وہ بتانے لگا باتوں ہی باتوں میں اس نے اچانک کہا۔

”بصیر صاحب کہہ رہے تھے کہ ہمیں اس کوئی میں کوئی سایہ نظر آتا ہے۔“

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا لیکن چونکہ یہ گپ شب ایک دوستانہ ماحول میں ہو رہی تھی اسی لئے میں نے پہلی رات سے جو سایہ مجھے نظر آیا تھا اس رات سے لے کر آج رات کے سایہ کے مس شاہینہ کے کمرہ میں کھڑکی سے داخل ہونے تک بتایا۔ وہ اسی طرح گپ شب لگاتے اٹھ گئے۔

اسی رات میں نے اس طرف کے سیکورٹی گارڈ کو اپنے ساتھ تیار کیا پہلے تو وہ ڈرتا رہا کہ بصیر صاحب کو پتہ چلا تو وہ نوکری سے فارغ کر دیں گے۔ آخر میرے اعتماد دلانے پر وہ تیار ہو گیا۔ کیونکہ وہ مجھے اس کوئی میں ایک خصوصی مہمان کے طور پر جانتا تھا۔

رات کے ایک بجتے ہی وہ سایہ کوئی کی بڑی دیوار سے برآمد ہوا۔ میں سیکورٹی گارڈ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا اور سیکورٹی گارڈ کو الرٹ کیا وہ میرے ساتھ ہی اس کوئی سے نکلا اور ہم آگے پیچھے اس سایہ کے تعاقب میں چل دیئے۔ ”سردہ سایہ کو کمرہ ہے۔“

سیکورٹی گارڈ کی بات سننے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا سایہ تو ہمارے سامنے ہی ناک کی سیدھ میں ایسے چار ہاتھ جیسے کوئی آدمی نیند میں چل رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر فور سے اس گارڈ کو دیکھا میرے اچانک یوں پلٹ کر دیکھنے سے وہ کٹھنڈ ہو گیا اور گڑبڑا کر بولا۔ ”وہ سر جی سایہ مجھے نظر نہیں آ رہا۔“

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا میں نے اس سے ٹارچ لی اور احتیاط سے دو دفعہ جلا کر اس سایہ پر ڈالی اس سایہ نے پلٹ کر دیکھا میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ ان الفاظ کا فضا میں گونجنا ہی تھا کہ وہ سایہ غائب ہو گیا۔ سیکورٹی گارڈ بھی بصیر صاحب کی طرح اس سایہ کو دیکھ نہ پایا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بصیر صاحب ڈرا بڑی عمر کے ہیں تو ان کی نظر کچھ کمزور ہو لیکن اس سیکورٹی گارڈ کو بھی وہ سایہ نظر نہ آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اس گارڈ کو واپس اس کی ڈیوٹی پر جانے کا کہا اور خود اپنے کمرے میں جا کر اس سارے جکر کے بارے میں سوچتے ہوئے گہری نیند میں چلا گیا۔

دوسری شام ایک قہری جیس سوٹ والا میری عمر سے کچھ بڑا آدمی بصیر صاحب کے ساتھ نظر آیا۔ بصیر صاحب نے پہلے اس کا تعارف کرایا وہ بھی سیاست کا ایک چلتا پھرتا پرزہ تھا۔ پھر انہوں نے میرا تعارف کرایا تو اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اچھا اچھا تو یہ ہیں..... علی صاحب۔“ مجھے اس کا لہجہ بڑا ناگوار گزر لیکن میں چپ رہا۔ بصیر صاحب نے بھی اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ نیچے جھک گیا۔ اس کے بعد وہ نیا آنے والا آدمی مس شاہینہ

کے ساتھ نظر آنے لگا۔ بصیر صاحب اور مس شاہینہ مجھے انور کرنے لگے اب رات کو وہ سایہ میرے ارد گرد نظر آنے لگا۔ میرے اندر ڈر بھر کر نے لگا۔ میرا دماغ جھنجھٹنے لگا۔ اور وہ نیا پرزہ آتے جاتے مجھ پر طرے کے تیر برسائے لگا۔

ایک دن میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اس کے ساتھ ہاتھ پائی کی مجھے بڑی مشکل سے قابو کیا گیا۔ میرا دماغ بہت ہی گرم تھا۔ میں بصیر صاحب کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھ تو گیا لیکن میرا دماغ سلک رہا تھا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس نے آدمی کو میری جگہ رکھ لیا گیا ہے۔ شاید اس سایہ والے واقعہ پر میری ذہنی صحت پر شعبہ کیا جا رہا تھا۔ اچانک بیٹھے بیٹھ میں اٹھ کھڑا ہوا اور شور مچانے لگا۔ جو کچھ ہاتھ میں چڑھا اور اصرار پھینکنے لگا۔ سیکورٹی گارڈ آگئے مجھے قابو کر کے باندھ دیا گیا جانے کہاں سے اب ڈاکٹر وارد ہوا اور مجھے دائیں بازو پر بانجش لگا دیا بانجش لگنے کے بعد مجھے نیند آگئی شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا میری دھندلی آنکھوں کے سامنے وہ سایہ کھڑا جیسے مجھ پر ہنس رہا تھا۔

مجھے ہوش ایک سلاخوں والے کمرے کے اندر آیا میں فرش پر چھٹی چادر پر لیٹا تھا اس کمرہ میں اکیلا تھا میرے حواس کام کرنے لگے تو مجھے سمجھ آئی کہ وہ ہانگل خانے کا ایک کمرہ تھا میں اپنا سر بیٹ کر رہ گیا میں اٹھا ہی تھا کہ وہ سایہ سلاخوں کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور مجھے گھورنے لگا۔ فضا میں عجیب سی سنسنات ہو رہی تھی جیسے کہ وہ کچھ بول رہا ہو میں نے غور سے سننے کی کوشش کی تو مجھے سمجھ آیا کہ وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ صرف میری ہے۔“ اب مجھے پتہ چلا کہ مس شاہینہ اتنی خوب صورت اور بالدار ہونے کے باوجود بھی ابھی تک کنواری کیوں تھی کیونکہ اس کا عاشق ایک سایہ تھا جو کہ اس پر مکمل چھایا ہوا تھا۔





برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگردان انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بندان کر کے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دہشت طاری کرتی کہانی۔

ایک ناپیدہ اور پراسرار رستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

**میں** ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا،

البتہ دیان کے منہ سے نکلے ہوئے ان لفظوں کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد ہی جھوپڑے کا پردہ ہٹا اور ایک بوڑھا سا آدمی دکھائی دیا۔

اس کے سر اور اڑھی کے بے تماشہ بال بکھرے ہوئے تھے..... اور تقریباً سارے ہی سفید ہو چکے تھے..... چہرے پر جھرمیاں تھیں اور آنکھیں قدرے اندر کودھکی ہوئی تھیں۔

”ملاگا.....؟“ دیان نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔ بوڑھے نے اثبات میں گردن ہلائی اور واپس اندر چلا گیا..... اب دیان میری طرف مڑا۔

”یہ ہماری علاقائی زبان ہے..... اس بوڑھے کا نام مادون ہے..... اسے کوئی اور زبان نہیں آتی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے کوئی اور زبان سیکھی ہی نہیں..... یہ میرے ماموں یعنی سردار کا خاص خادم ہے..... بے چارہ کو لگا ہے۔“

”اوہ.....؟“ میرے منہ سے نکلا۔ ”ہاں.....“ دیان مسکرایا۔

”شاید اسی وجہ سے یہ کوئی اور زبان نہیں سیکھ سکا..... اسے اردو بالکل سمجھ نہیں آتی.....“ میں نے اس

سے سردار کے بارے میں پوچھا تھا۔

میں نے سر ہلادیا، جلد ہی بوڑھے مارون کی واپسی ہوئی، اور وہ ہمیں اندر لے گیا..... اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس جھوپڑے میں بھی کمرے بنے ہوئے تھے سامنے ہی دوسرے کمرے کا دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

اس کمرے میں ضروریات زندگی کا سامان موجود تھا..... میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا، عین اسی وقت میری نگاہ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی اور میں بری طرح چونک اٹھا۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ دیان میری کیفیت سے واقف نہیں تھا، اس نے مجھے آواز دی۔

”ارے کلیل..... دروازے پر کیوں کھڑے ہو.....؟ اندر آ جاؤ۔“

”آں..... ہاں.....!“ میں چونک کر بولا۔

اسی تصویر کو دیکھتا ہوا میں ان دونوں کے قریب آ گیا..... دیان نے فوراً ہی ادھیڑ عمر شخص سے میرا تعارف کروایا۔

”یہ میرا دوست کلیل ہے..... یہ خانہ بدوشوں کی

زندگی پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ہماری بستی میں آیا ہے۔ یہ ہم لوگوں کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔“ سردار نے یہ کہہ کر میری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے چہرے پر ایک شیشی مسکراہٹ عود کر آئی تھی، میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اب دیان نے کہا۔  
”اور یہ میرے ماموں ہیں۔۔۔۔۔ اس بستی کے سردار بھی ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھا ہوا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! میں نے کہا۔  
”تم لوگ بیٹو۔۔۔۔۔“ سردار کی آواز کافی بھاری تھی۔  
”میں مہمان کے لئے خاطر تواضع کا انتظام کرتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے ماموں۔“ دیان نے کہا۔  
”میں اسے بستی کی سرگردانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ بالکل۔“ سردار فوراً بولا۔  
”فکلیں جب تک چاہے اس بستی میں رہ سکتا ہے اور جہاں چاہے گھوم سکتا ہے میری طرف سے اجازت ہے۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔“ دیان کے منہ سے نکلا۔

میں نے بھی سردار کا شکریہ ادا کیا، پھر دیان نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا، میری نظریں بے اختیار دیوار پر لگی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر میں بھی دیان کے ساتھ چھوٹے سے باہر نکل آیا۔

میں بہت بے چین تھا، دیان نے اس بات کو محسوس کر لیا اور بولا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“  
”ہاں دیان۔۔۔۔۔ میں نے شالا کو دیکھا ہے۔“  
وہ چلتے چلتے رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔  
”کہاں۔۔۔۔۔؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔!“ میں بولتے بولتے رک گیا۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ کہو۔۔۔۔۔ رک کیوں گئے۔۔۔۔۔؟“ دیان نے کہا۔

”اس کی تصویر۔۔۔۔۔ میں نے سردار کے گھر میں دیکھی ہے۔“ میرے منہ سے نکلا۔  
دیان غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر یک بیک ہنس پڑا اور بولا۔

”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“  
”نہیں دیان۔۔۔۔۔ میں نے حیرت سے کہا۔  
”میں بھلا مذاق کیوں کروں گا۔“  
”اچھا۔۔۔۔۔ تو پھر میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“  
”جس کی تصویر کو تم شالا کا نام دے رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ سردار کی بیٹی کی تصویر ہے۔“ دیان نے کہا۔

”مجھ میں یاد ہے جب تم مجھے شالا کا حلیہ بتا رہے تھے تو میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔“  
”ہاں۔۔۔۔۔ یاد ہے۔“

”دراصل میں اس وقت خود بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ تم عروا کا حلیہ بتا رہے ہو۔“  
”عروا۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ شالا نہیں بلکہ عروا کی تصویر ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔!“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ میں بے تابی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کا خاموش ہو جانا مجھے بری طرح محالے لگا۔

جب وہ چپ ہی رہا تو مجھے کہنا پڑا۔  
”بولو۔۔۔۔۔ تم رک کیوں گئے۔۔۔۔۔؟“  
”پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا واقعی وہ تصویر تمہاری شالا کی طرح ہے۔۔۔۔۔؟“

”ہو۔۔۔۔۔ بلکہ سو فیصد۔۔۔۔۔“  
”ہوں۔۔۔۔۔!“ دیان نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا۔

”یہ تو۔۔۔۔۔ بہت ہی عجیب سی بات ہے۔“  
”تم مجھے پتیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ میں جھلسا گیا۔

”صاف صاف بتاؤ۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ چندا نے اس کا نام غلط لیا ہو۔۔۔۔۔؟“  
”چند تو عروا سے مل ہی نہیں سکتی۔۔۔۔۔ نام کیسے لے سکتی ہے۔“

”کیا سردار کی بیٹی یہاں نہیں رہتی۔۔۔۔۔؟“  
”ہاں۔۔۔۔۔“  
”تو پھر۔۔۔۔۔ وہ کہاں ہوتی ہے۔۔۔۔۔؟“  
”دوسری دنیا میں۔“ دیان نے انکشاف کیا۔  
”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”مطلب یہ ہے کہ عروا کو مرے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں۔۔۔۔۔ اس کی تصویر تو یادگار کے طور پر سردار نے اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے۔“  
”یہ سن کر میں سانس میں آ گیا۔  
کافی دیر تک میں گم سم رہا، پھر میرے منہ سے نکلا۔

”یہ۔۔۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“  
”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ فکلیں بولا۔  
”عروا ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی، میرے ماموں یعنی سردار کو اس سے بہت محبت تھی، کیونکہ عروا کے پیدا ہونے کے دوسرے سال ہی عروا کی ماں چل بسی تھی۔ تب سے ہی میرے ماموں نے اسے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا تھا۔ لیکن پھر عروا بھی ان کا ساتھ نہ دے سکی اور میرے ماموں اب تنہا ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے دوسری شادی بھی کرنا گوارا نہیں کیا۔ اپنی بیوی اور بیٹی کی یاد میں اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔“ وہ بولے جا رہا تھا اور میری حالت عجیب سی تھی۔ اب تو خود میرا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ میں رون شروع کر دوں۔

یہ سب کیا تھا۔۔۔۔۔ شالا تو مجھے چندا کے ساتھ دکھائی دی تھی اور میں پہلی نظر میں ہی اسے اپنا دل دے

بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ پھر شالا کا وجود سرے سے ہی غائب ہو گیا اور اس کی جگہ عروا نے لی، لیکن عروا تو بقول دیان کے اب اس دنیا میں ہی نہیں تھی۔ تو پھر۔۔۔۔۔ جس سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ کون تھی۔۔۔۔۔؟

اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا، میں نے دیان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

”سنو دیان۔۔۔۔۔ میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔“  
”کیا۔۔۔۔۔؟“

”ہو سکتا ہے کہ شالا تمہارے ماموں کی بیٹی کی ہم شکل ہو۔“

”یہ بات ممکن نہیں ہے۔“  
”کیوں۔۔۔۔۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔“  
”خود سوچو۔۔۔۔۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو کیا سردار کو یا مجھے اس کا علم نہ ہوتا۔۔۔۔۔؟ سردار تو اسے اس کے گھر والوں سے مانگ کر اپنے ساتھ ہی رکھ لیتا، تاکہ اسے عروا کے بدلے میں اپنی بیٹی بنا سکے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ یہ بات تو ہے۔۔۔۔۔“ میں نے سر ہلایا۔

شاید میں بہت زیادہ الجھ گیا ہوں، اس لئے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوچو رہی۔۔۔۔۔ اور اب میرا خیال ہے کہ اس بستی میں شالا کی تلاش بھی فضول ہے کیونکہ اگر وہ عروا کی ہم شکل ہے تو اس صورت میں تو وہ مشہور ہوتی۔۔۔۔۔ یہ کسی کو اس کے بارے میں پتا ہوتا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔۔۔“ دیان نے کہا۔  
”عروا کو اس بستی کا بچہ بچہ جانتا ہے۔“  
”بس تو پھر میں شالا کے خیال کو اس بستی میں دفن کر دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرا خیال اب یہ ہے کہ میں نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں دیان۔ تمہاری مدد اور غلط کام بہت بہت شکریہ۔“  
یہ کہہ کر میں نے اپنا سر بدل لیا۔

”ارے..... کہاں جا رہے ہو؟“ دیان نے چونک کر پوچھا۔  
 ”میں واپس جا رہا ہوں.....“ میں نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔  
 ”میرا اب یہاں رکنا فضول ہے کیونکہ مجھے شالا نہیں ملے گی..... یہاں رک کر میرا دل مزید پریشان اور مایوس ہوگا اس لئے میں جا رہا ہوں۔“  
 ”پلو..... پھر میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“  
 ”نہیں دیان..... میں چلا جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم صبح سے میری وجہ سے خواہ خواہ پریشان ہو..... اب تم ہمیں رمو اور آرام کرو..... میں چلا جاؤں گا۔“  
 دیان نے کافی اصرار کیا تھا، لیکن میں نے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لے جانا مناسب خیال نہیں کیا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی میری وجہ سے دوپھر لگا چکا تھا۔ چنانچہ اسے میں نے سمجھا بھرا کر وہیں روکا اور جیستی سے باہر نکل آیا۔  
 یہ حقیقت تھی کہ اس وقت میرا عجیب حال تھا..... دل چاہ رہا تھا کہ اسے مگر کی طرف جانے کے بجائے اسی جنگل میں کسی طرف نکل جاؤں۔  
 کیا زندگی تھی؟.....؟ بیچن سے لے کر اب تک نہ جانے کس گرداب میں پھنسا ہوا تھا..... آقاں قلی کے زیر سایہ میں پروان پڑھا..... وہ قبیلہ..... جو جادوؤں کے اور کالے کلم کا ماہر تھا..... لیکن میرے باپ کے مرنے کے بعد اس قبیلے کا نہ تو کوئی نام بوا تھا اور نہ ہی کوئی اس علم کو اگے بڑھانے والا تھا..... کیونکہ میں تبھی کہ چکا تھا کہ اس کالے دھندے کو بھی اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ ہی زمین میں دفن کر دوں گا۔  
 وہ لوگ خون اور نسل کی بنا پر میرے لئے قابل احترام تھے..... لیکن ان ہی کی بدولت نہ جانے کتنے گھراڑے ہوں گے..... نہ جانے کتنے انسانوں کا سکون تباہ ہوا ہوگا..... کیا یہ غلط نہ تھا۔  
 یہ سب باتیں مجھے رحیم بابا نے بتائی تھیں..... چنانچہ مجھے اسی وقت اپنے قبیلے سے نفرت ہو گئی تھی.....

لیکن یہ نفرت صرف ان لوگوں کے پیشے کی حد تک تھی..... مجھے پالتے پوسے اور جوان کرنے میں جو میرے باپ کا احسان تھا وہ اب بھی میرے سر آنکھوں پر تھا۔  
 لیکن جن حالات سے میں گزرا تھا میری نظر میں اس کا سبب میرے باپ کا پیشہ ہی تھا..... اور اب مجھے محبت ہوئی اور میرے دل کے نہاں خانے میں کوئی چپکے سے آ کر بیٹھا تو اس کا مسئلہ ہی عقدہ لا تحلیل بن گیا تھا۔  
 آخر شالا کا کیا اسرار تھا.....؟ وہ کون تھی.....؟ ایسا حسن تو میں نے نہ بھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا..... لیکن وہ تھی کہاں..... کیا وہ سردار کی بیٹی کی روح تھی.....؟ کیونکہ شالا اور عوا میں بال برابر بھی کوئی فرق نہیں تھا..... تو..... تو کیا..... واقعی شالا عروا ہی کا کوئی روپ تھی..... جو اپنی ایک جھلک دکھا کر کسی چھلاوے کی طرح اوجھل ہو چکی تھی۔  
 میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور ذہن الجھتا جا رہا تھا..... میں اب جنگل کے گڈنڈی والے راستے سے گزر رہا تھا..... جہاں تھوڑے ہی فاصلے پر قدرتی چشمہ موجود تھا۔  
 اچانک ہی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔  
 ”شش..... شش.....!“  
 میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا..... لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔  
 ”شش.....!“ پھر کسی نے مجھے پھیرا۔  
 اس بار بھی مجھے کوئی نظر نہ آیا البتہ میرے اٹھتے قدم ضرور رک گئے تھے..... مجھے اس خیال نے ستایا کہ کہیں یہ وہی بولہ تو نہیں ہے، جو اکثر مجھے دکھائی دیتا ہے۔  
 چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے بلند آواز میں پوچھا۔  
 ”کون ہو تم..... سامنے آؤ.....“  
 ”میں یہاں ہوں.....!“ ایک نسوانی سریلی سی آواز میرے کانوں سے نکل گئی۔  
 ساتھ ہی کسی کی آواز گونجی، مجھے کافی حیرت ہوئی تھی..... میرا اندازہ تھا کہ یہ آوازیں سامنے والے درخت

کے عقب سے آرہی ہیں اور وہاں کوئی موجود ہے۔  
 ”سامنے تو آؤ..... کون ہو تم.....؟“ میں نے پھر کہا۔  
 ”مجھے شرم آرہی ہے..... سامنے کیسے آؤں.....؟“ اس کا لہجہ بے حد دلکش تھا۔  
 میں سوچ میں پڑ گیا..... آخر یہ لڑکی کون تھی.....؟ اور اس جنگل میں کیا کر رہی تھی۔  
 میں قدرے ڈر رہی رہا تھا، لیکن پھر جس میرے ڈر پر غالب آ گیا اور میں اس درخت کے قریب جا پہنچا۔  
 اب میں نے دوسری طرف جھانکا اور مجھے حیرت کا شدید جھکا لگا..... درخت کی آڑ میں شالا کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔  
 بالکل..... یہ شالا ہی تھی۔  
 میں حیرت کا بت بنا ہوا تھا اور پھرانی ہوئی سی آنکھوں سے اس وجود کو دیکھ رہا تھا۔  
 شالا کے جسم پر معمولی سا لباس تھا، لیکن اس کے ہار جو اس کا حسن میری آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہا تھا۔  
 لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی طرح کے اندیشے بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں.....؟  
 وہ مسلسل مجھے مسکرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ خود ہی بولی۔  
 ”کیسی لگی یہ ملاقات.....؟“  
 ”اچھی ہے.....“ میرے منہ سے نکلا۔  
 ”لیکن..... لیکن تم کون ہو.....؟“ میں نے تو تہا ہار جو وہی نہیں ہے۔  
 ”اوہ.....!“ وہ ہنسی۔  
 ”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں سردار کی وہ بیٹی ہوں، جو مر چکی ہے..... ہے ناں.....!“  
 ”یہ لو.....“ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔  
 ”تمہارے خیال میں اگر میں کوئی روح ہوں، تو میرا جسم نہیں ہونا چاہیے۔ لو دیکھو..... میں گوشت

پوست کی مالک ہوں۔“  
 اس کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا لیکن مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں وہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں..... حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس وقت کافی ڈرا ہوا تھا مجھے ساکت دیکھ کر وہ خود ہی دو قدم آگے بڑھی اور پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔  
 اوہ..... نرم و ملائم سا وہ سبک ہاتھ..... جس میں خون اور جوانی کی گرماہٹ تھی..... سرشاری کی تھر تھراہٹ تھی..... وہ ہاتھ اب میرے ہاتھ میں تھا۔  
 ”اب پلو.....“ وہ پھر گویا ہوئی!  
 ”کیا کہتے ہو..... کیا میں سردار کی وہ بیٹی ہوں، جو مر چکی ہے۔“  
 ”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ میں نے الجھ کر کہا۔  
 ”اور نہ ہی میں کوئی فیصلہ کر پارہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“  
 یہ سن کر وہ پھر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔  
 ”میں تمہارے حال سے واقف ہوں..... جو کچھ ہوا اس میں نہ تو میرا کوئی قصور ہے اور نہ ہی تمہارا کوئی دوش ہے۔“  
 ”تو پھر..... یہ سب کیا ہے.....؟“ میری آواز قدرے بلند تھی۔  
 ”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“ اس کی آواز میں التجا تھی۔  
 ”آؤ..... ہم دونوں کہیں بیٹھتے ہیں..... اس کے بعد میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی..... آؤ۔“  
 یہ کہہ کر وہ کھڑی اور اس نے آگے قدم بڑھا دیئے۔  
 میں بھی چپ چاپ اس کے عقب میں چلنے لگا۔  
 اس کی خراماں چال بھی بے حد دلکش تھی..... اس کا داہنا پاؤں ایک اداسے زمین پر پڑتا تھا اور اس وقت مگر پر آنے والا بل میرے دل میں گلدی سی کرنے لگتا تھا..... وہ سراپا قیامت تھی..... کسی حسین خواب کی طرح۔



اس نے ایک بار مجھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر دوبارہ آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی ہم دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درختوں کے درمیان کھلی جگہ میں ایک خیر صہ تھا۔ میں نے حیرت سے اس خیر صہ کو دیکھا۔ مثلاً میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔

”میں یہاں رہتی ہوں اور میرا نام مثلاً ہی ہے“

..... آؤ..... اندر جاؤ..... پھر میں تمہیں اپنی کہانی سناتی ہوں..... آؤ.....

میں اس کے ساتھ خیر صہ کے اندر داخل ہو گیا، یہاں باقاعدہ بستر بھی موجود تھا اور ایک طرف کھانے کے سامان اور کچھ برتن بھی موجود تھے۔ یہاں ایک آگ بھی رکھی ہوئی دکھائی دی۔

”بیٹھو.....“ مثلاً نے بستر کی طرف اشارہ کیا اور پھر خود بھی چوڑی مار کر بیٹھ گئی۔

”خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”ورنہ ممکن ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر میں بھی پیال پر بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں پاگل نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے عجیب سے انداز میں مجھ کو دیکھا۔

”کیونکہ تم نے نہ جانے اب تک کیا کیا سوچ لیا ہوگا..... میں اب تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے یہاں ایک مجبوری کے تحت رہنا پڑتا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟ کسی مجبوری.....؟“

”میں مردار کی بیٹی کی ہم شکل ہوں۔“ مثلاً نے کہا۔

”اور ہم دونوں میں کوئی بھی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن یہ صرف قدرت کا کرشمہ تھا کہ میں ہو بہو اسی کی طرح تھی..... ہم دونوں کی دونوں بھی بہت گہری تھی۔ ساتھ رہنا، ساتھ کھانا پینا اور ساتھ ہی کھینا کودنا ہمارا شیوہ تھا۔ اس میں اور مجھ میں صرف رنگت کا قدرے فرق تھا..... وہ زیادہ گوری تھی اور میرا رنگ سانولا ہے..... اسی بنا پر بستی

کے لوگ ہمیں پہنچاتے تھے لیکن پھر چانک ہی عروا بیمار پڑی اور اسی بیماری میں ایک دن اس کا انتقال ہو گیا۔ سردار کو اس سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ کیونکہ سردار نے بن ماں کے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ چنانچہ عروا کے مرنے کے بعد سردار گویا اپنے حواس ہی کو بیٹھا تھا۔ میں اس کے سامنے آتی تو وہ باگلوں کی طرح چیختا تھا۔ اور اس کی طبیعت بگڑ جاتی تھی۔ چنانچہ سردار کے حامیوں اور اس کے وفاداروں نے سردار کی اس تکلیف دہ حالت کا یہ حل نکالا کہ ان لوگوں نے مجھے بستی سے باہر کر دیا۔

”ارے..... یہ کیوں.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ جب بھی سردار سے میرا سامنا ہوتا تھا تو اسے عروا کی یاد جاتی تھی..... اس لئے بستی والوں نے میرے لئے یہاں جگہ بنا دی..... یوں تو میرا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے..... مجھے یہاں کھانے پینے کی سہولت ملتا ہے..... اور جب رات کو سردار سو جاتا ہے تو بستی کے چند لوگ مجھے آکر لے جاتے ہیں۔ اس طرح میں رات کے وقت بستی میں ہی سوتی ہوں۔“

”بڑی عجیب کہانی ہے.....“ میں بڑبڑایا۔

”تم تو بڑی مشکل قسم کی زندگی گزار رہی ہو۔“

”ہاں..... لیکن میرا جانے سے تو اچھا ہے۔“ وہ غمگین لہجے میں بولی۔

”تم بستی کے لوگوں سے واقف نہیں ہو..... وہ لوگ تو سردار کی حالت کے پیش نظر مجھے بھی مار دینے کے حق میں تھے۔ جب ہی میری ماں نے ان لوگوں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے تو مجھے زندگی کا ذرا نہ ملا۔“

”اوہ..... یہ تو..... یہ تو سراسر انصافی اور درندگی ہے۔“ میں کانپ اٹھا۔

”ہاں..... بس کوئی نیکی ہی کام آ سنی..... جو میری جان بخشی ہوگی..... ورنہ میں بھی موت کی نیند سوچتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور اس کے چہرے پر

اسی کے بادل لہرانے لگے۔ دفعتاً ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لگا۔

”یہ بتاؤ کہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں جنگل سے گزار رہا ہوں.....؟“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”تم کیا جانو کہ میں اس وقت یہاں ہوں۔“

یہ سن کر وہ مسکرائی اور بولی۔

”تم یہ بات کر رہے ہو؟ ارے..... میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ تم صبح سویرے ہی بستی چلے گئے تھے..... اور تم وہاں مجھے ڈھونڈنے کی غرض سے گئے تھے۔“

یہ سن کر میں اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا، پھر میرے منہ سے نکلا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا..... یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟“

”تم خود اندازہ لگاؤ.....“ وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دینے لگی۔

میں اس کی خوب صورتی میں کھوسا گیا، پھر سنبھل کر بولا۔

”تم خود ہی بتاؤ..... میں اس وقت بہت زیادہ الجھا ہوا ہوں۔“

”اچھا تو سنو..... چننا مجھے تھوڑی دیر پہلے ہی صاف تفصیل بتا کر گئی تھی کیونکہ وہ دیان کی گہری دوست ہے..... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔“

میں حیرت کا بت بنا ہوا اس کی شکل دیکھ رہا تھا..... وہ پھر بولی۔

”کیا تمہیں ان باتوں پر حیرت ہو رہی ہے؟“

”بہت زیادہ.....“ میں بول اٹھا۔

”وہ اس لئے کہ دیان تو صبح سے میرے ساتھ تھا.....“

”تم شاید ایک بات بھول رہے ہو.....“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

”تم دیان سے کل شام میں ملے تھے، اور میرے پاس اس نے کل رات میں ہی چننا کو بتا دیا تھا۔“

”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”تو..... یہ بات ہے۔“

”ہاں.....“ وہ بولی۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہارا نام کھیل ہے۔ اب خود سوچو کہ تمہارا نام مجھے کیسے معلوم ہوا؟“

”اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر دیان مجھے بستی میں لے کر کیوں گھوم رہا تھا.....“ میں نے کہا۔

”اس نے مجھے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا.....؟“

یہ سن کر وہ اداس انداز میں مسکرائی اور بولی۔

”بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماموں سے بہت ڈرتا ہے..... اگر تمہاری وجہ سے میری کہانی ان کے سامنے کھل گئی تو اس کی شامت آجائے گی..... وہ آنے والے وقت سے ڈر رہا ہے..... شاید اس لئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوگا کہ تمہیں میرے متعلق بتانے کی نہ تھوڑی سی سانس لی۔

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، پھر مثلاً بولی۔

”تم پہلی نظر میں ہی میرے دل میں اتر گئے تھے..... یہ محض اتفاق تھا کہ میں چننا کے ساتھ سیر کرنے نکلی تھی، ورنہ وہ اکثر یہاں آتی ہے، تو ہم دونوں اسی جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اور وقت گزار دیتے ہیں۔“

”اس نے بھی تمہارے وجود سے انکار کیا تھا.....“ میں نے بتایا۔

”میں اس سے مل چکا ہوں.....“

”ہاں..... مجھے معلوم ہے.....“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”اسے بھی دیان ہی کے کہنے پر جھوٹ بولنا پڑا تھا۔“

میں کچھ کے بغیر ہی اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھے بے حد حسین لگ رہی تھی، میرے دل میں کئی طرح کے خیالات لہرانے لگے۔ دل چاہا کہ اسے اپنی باتوں میں بھر لوں..... لیکن یہ پہلی ملاقات تھی اور مجھے ابھی محبت

کی منزل تک پہنچنے کے لئے طویل راستہ طے کرنا ہائی تھا..... چنانچہ میں نے کہا۔  
 ”میں تمہیں کیسا لگا ہوں.....؟“  
 ”کیا مطلب.....؟“ اس نے مجھے دیکھا۔  
 ”مطلب یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو چکی ہے.....“ میں نے کہا۔  
 ”کیا تم میری محبت کو قبول کرتی ہو.....؟ کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہو.....؟“  
 ”میں کل بتاؤں گی.....“ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔  
 ”ابھی تم چلے جاؤ..... کیونکہ چندا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے..... میں ابھی کسی سے بھی تمہارا ذکر نہیں کرنا چاہتی ابھی ہماری اس ملاقات کو پوشیدہ ہی رہنا چاہئے۔“  
 میں نے سر ہلادیا اور اٹھ کھڑا ہوا، وہ فور سے میری طرف دیکھ رہی تھی، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔  
 ”دل تو نہیں چاہ رہا کہ تم جاؤ..... لیکن مجبوری ہے..... تم کل صبح ضرور تائیں انتظار کروں گی۔“  
 پھر شالا نے مجھے بڑی اپنائیت سے الوداع کہا اور میں وہاں سے نکل آیا۔  
 میں گم مسم تھا..... قدرے پریشان اور عجیب طرح کی سوچوں میں گم..... ایک طرف شالا سے ملنے کی خوشی تھی، تو دوسری طرف شالا کی پٹائی ہوئی داستان نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔  
 بہر حال فی الوقت تو یہی کافی تھا کہ مجھے شالا مل گئی تھی..... ابھی کسی اور سمت میں ذہن کو دوڑنا فاضل تھا۔  
 دوپہر کے وقت میں حویلی میں داخل ہوا تو بھوک کے مارے برا لگا تھا..... میں نے فوراً اس اماں جی کو دیکھ کر کھانے کا نعرہ لگایا اور ہاتھ روں میں چا گھسا۔  
 تنہا دھوکر باہر نکلا تو خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا..... میں کمرے میں داخل ہوا تو اماں جی کھانا لے کر میرے انتظار میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔  
 میں کھانے پر ٹوٹ پڑا..... اماں جی خاموشی سے

مجھے دیکھ رہی تھیں جب میں پیٹ پر کھڑکھا چکا تو وہ بولیں۔  
 ”روچی آئی تھی۔“  
 ”یہ کون ہے ماں جی.....؟“ میں بے خیالی میں پوچھا۔  
 ”وہی..... جس نے ہمارا گھر کرائے پر اٹھوایا تھا..... تمہیں بتایا تو تھا۔“  
 ”اوہ..... اچھا۔“  
 ”ہاں..... اس نے کرائے داروں سے بات کی تھی..... لیکن وہ لوگ اب کسی صورت بھی یہاں رہنے کو تیار نہیں ہیں..... اور اسی مہینے وہ مکان خالی کر دیں گے۔“ ماں جی نے بتایا۔  
 ”اچھا..... لیکن انہوں نے وجہ تو بتائی ہوگی.....؟“  
 ”نہیں.....“ وہ بولیں۔  
 ”روچی نے فراغت علی سے بھی بات کی تھی، لیکن وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔“  
 ”اُسے تو جانے دیں ان لوگوں کو.....“ میں نے منہ ہٹا کر کہا۔  
 ”جب ان لوگوں کے غرے نہیں مل رہے تو پھر منت سماجت کرنے کا کیا فائدہ..... چھوڑیں..... کوئی اور آ جائے گا کرائے پر.....“  
 ”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں.....“ وہ سر ہلا کر بولیں۔  
 ”دیے میرا ارادہ تھا کہ میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں۔“  
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے ماں جی.....“ میں نے کہا۔  
 ”ان کو گھر خالی کرنے دیں۔ میں اب سدا سے بات کروں گا وہ کوئی اچھا سا کرائے دار بتا دے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“  
 ”اچھا..... ٹھیک ہے..... جیسے تم کہو.....“ یہ کہہ کر انہوں نے برتن اٹھانا شروع کر دیے۔  
 اس وقت میرے دل میں آئی کہ میں انہیں مثلاً

میں نے حلق بتا دوں..... لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اتنی جلدی اماں جی کو بتا دینا مناسب نہیں تھا، ابھی دوست کی ابتداء تھی۔ ابھی مجھے شالا سے ایک خصوصی گفتگو کرنی تھی۔

میں تو اسے اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے کے لئے تھا تھا، لیکن مجھے اس کے دل کا حال بھی تو جاننا تھا..... کیا اسے بھی مجھ سے محبت ہوگئی تھی.....؟

یہ بات معلوم کرنے کے لئے مجھے صبح کا انتظار کرنا تھا..... کیونکہ شالا نے مجھے دوسرے دن بلا لیا تھا۔

☆☆☆☆

شام کے وقت ایک بار پھر دیان سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ کیرم کھیل رہا تھا۔

اس وقت سندو میرے ساتھ نہیں تھا، دیان نے مجھے دیکھا اور پھر فوراً ہی اشارہ کیا۔

میں رک گیا تھا، دیان جلد ہی کھیل ختم کر کے میرے پاس آ گیا۔ اس نے کافی گرم جوش سے مجھ سے بات چلی۔

”کیا حال ہیں میرے دوست.....؟“ اس نے مجھے غلوں سے پوچھا تھا۔

میں نے تڑپتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”دوست بھی بولتے ہو اور غیروں والا سلوک بھی کرنا کہتے ہو..... بہت خوب.....“

”کیا مطلب.....؟“ وہ چونکا۔

”میں سمجھا نہیں.....“

”چھوڑو..... کیا کرو گے سمجھ کر.....“ میں مسکرایا۔

”آؤ ہوں گے میں چلتے ہیں.....“

”ضرور!“ اس نے قدم اگے بٹھائے۔

”لیکن اگر تمہاری مراد شالا سے ہے، تو میں اس حقیقت سے نہیں بچاؤں گا..... تم نے اسے جس ہستی کے مشابہہ کیا ہے، وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔“

یہ سن کر میں معنی خیز اعجاز میں مسکرایا اور بولا۔

”اور اگر میں یہ کہوں کہ میں شالا سے مل چکا ہوں۔“  
”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔  
”وہی شالا..... جسے میں نے چندا کے ساتھ دیکھا تھا۔“  
”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ دیان نے کہا تھا۔  
میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس دوران ہم ہوٹل پر پہنچ گئے، ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد دیان نے میری طرف محسوس انداز میں دیکھ کر کہا۔  
”مجھے بتاؤ..... تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“  
”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں..... اسے تم اچھی طرح جانتے ہو.....“ میں نے کہا۔  
”اب اتنے انجان مت بنو۔“  
اس سے پہلے کہ دیان کچھ کہتا ہمدرد ہوٹل میں داخل ہوا وہ شاید ہماری ہی تلاش میں تھا، وہ فوراً ہماری میز کی طرف لپکا اور پھر دور سے ہی پکارا تھا۔  
”اچھا..... اکیلے اکیلے پارٹی ہو رہی ہے..... بھائی کو پوچھا بھی نہیں۔“  
مجھ پر بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔  
”ابھی آئے ہیں ہم دونوں.....“ میں نے ہمدرد سے کہا۔  
”میں بھی اتفاق سے ابھی گھر سے نکلا تھا.....“  
ہمدرد نے جواب دیا۔  
”یار..... بچوں کو پڑھا پڑھا کر دماغ خشک سا ہو جاتا ہے۔ جانو بھائی کے کیرم پر آیا تو ارشد سے تمہارے بارے میں معلوم ہوا میں نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ تم دونوں ہوٹل پر ہی آئے ہو گے اور پھر میں یہاں چلا آیا۔“  
”تمہیں تو جاسوس ہونا چاہیے۔“ دیان مسکرایا۔  
”کوئی خاص بات ہو رہی تھی؟“ اس نے غور سے ہمیں دیکھا۔  
”میرا خیال ہے کہ بہت ہی خاص تھی.....“ دیان

نے میری طرف دیکھ کر کہا۔  
 ”زیادہ بہتر تو کھیل ہی بتا سکتا ہے۔“  
 اتنی دیر میں چائے آگئی، آج میرا کچھ پوچھے  
 بغیر ہی تین کپ لے آیا تھا، پھر اس نے انہیں میز  
 پر سجایا اور خیر انداز میں ہم لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا  
 واپس پلٹ گیا۔  
 ”بھئی واہ.....“ سدو نے فوراً ایک کپ اپنی  
 طرف کھٹکایا۔  
 ”میرا کافی عقل مند ہے۔“  
 ”ہاں تو کھیل میاں..... اگر مناسب سمجھو تو ہمیں  
 بھی بتاؤ۔“  
 ”ضرور.....“ یہ کہہ کر میں نے شمالا سے ملاقات  
 کی مختصر تفصیل بتادی۔ بہت سی باتیں میں گول بھی  
 کر گیا تھا خاص طور پر وہ باتیں کہ جن کا تعلق ہستی کے سردار  
 اور دیان سے تھا۔  
 یہ سن کر سدو نے کہا۔  
 ”بھئی بہت خوب..... عشق نے حسن کو آ کر کار  
 پایا لیا..... اسے کہتے ہیں حیرت۔“  
 ”لیکن اس بات پر مجھے حیرت ہے۔“ دیان نے  
 دخل دیا۔  
 ”کیسی حیرت.....؟“ سدو نے سوالیہ انداز میں  
 اس کی طرف دیکھا۔  
 ”شالانا ہی کسی لڑکی کا وجود ہی نہیں ہے۔“  
 دیان بولا۔  
 ”ارے.....“ سدو کے ہاتھ سے چائے کا کپ  
 چھوٹے چھوٹے رہ گیا۔  
 ”یہ کیا بات ہوئی.....؟“  
 ”میں کھیل کو یہی بات سمجھا رہا ہوں۔“  
 دیان بولا۔  
 ”اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ شمالا سے ملا  
 ہوں.....“ میں تیز لہجے میں بولا۔  
 ”کیونکہ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ دیان شمالا  
 سے انکاری کیوں ہے؟“

”ارے بھئی..... آپس میں بے وجہ کیوں بحث  
 کر رہے ہو.....“ سدو نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”ہوسکتا ہے کہ دیان اس لڑکی کھرے سے  
 جانتا ہی نہ ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم شمالا سے کہاں ملے تھے؟“  
 ”جنگل میں.....“ میں نے جواب دیا۔  
 ”جنگل میں کہاں.....؟“ دیان نے پوچھا۔  
 میں نے ایک انداز سے اس کی طرف دیکھا  
 اور پھر آہستہ سے بولا۔  
 ”وہ وہاں ایک خیمے میں رہتی ہے..... میں نے  
 کافی دیر اس سے بات چیت کی ہے۔“  
 ”حیرت ہے.....“ دیان بڑبڑایا۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہستی سے اس کا کوئی  
 تعلق نہیں ہے..... شاید اسی لئے میں اس سے ناواقف  
 ہوں۔“  
 ”شاید یہی بات ہو.....“ میں طنزیہ انداز میں  
 ہنسا۔  
 ”اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری ہستی سے اس کا  
 بہت خاص تعلق ہو۔“  
 ”تم ابھی ہوئی باتیں کیوں کر رہے ہو.....؟“  
 دیان نے غور سے مجھ دیکھا۔  
 ”صاف صاف ہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“  
 ”میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ میں نے طویل  
 سانس لی۔  
 ”میں صرف یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں شمالا  
 سے ملاقات کر چکا ہوں..... وہی شمالا..... جس سے چندا  
 بھی انکاری ہے۔“  
 دیان نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا وہ کچھ  
 کہنا ہی چاہتا تھا کہ سدو ہاتھ اٹھا کر بولا۔  
 ”آپس میں بحث بازی سے کوئی فائدہ نہیں.....  
 اگر کھیل اس لڑکی سے مل چکا ہے تو یہ خوشی کی بات  
 ہے..... اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے۔“  
 ”واقعی کوئی عیب نہیں ہے۔“ دیان بولا۔

”لیکن میں کھیل کی اس شمالا سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
 یہ سن کر میں نے کہا۔  
 ”میں تمہیں شمالا سے ضرور ملواؤں گا..... تمہوڑا سا  
 ابراہم..... بس..... تمہوڑا سا انتظار۔“  
 ☆.....☆.....☆  
 وہ رات میں نے بڑی بے چینی کے عالم میں  
 گزاری تھی۔ دوسرے دن میں صبح ہی صبح گھر سے نکل  
 نکلا ہوا۔  
 ”آج کہاں چل دیئے۔“ ماں جی نے پوچھا تھا۔  
 ”کالج جا رہا ہوں ماں جی۔“ میں نے جھٹ  
 کھا۔  
 ”اچھا.....“ ماں جی نے سر ہلادیا۔  
 میں کان دبا کر وہاں سے نکل آیا، میں پھر کہیں  
 ابراہم کا نہیں تھا۔ میرے قدم تیزی سے جنگل کے اس  
 کھلے طرف اٹھ رہے تھے، جہاں شمالا میری منتظر تھی۔  
 وہ واقعی خیمے سے باہر نہیں رہی تھی..... آج اس  
 خیمہ پر رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ گزشتہ دن  
 کی زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔  
 وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور میرے نزدیک  
 آکر بولی۔  
 ”ت..... تم آگے.....؟“  
 ”ہاں شمالا.....“ میں نے محبت بھرے انداز میں  
 دیکھا۔  
 ”مجھے تو آنا ہی تھا۔“  
 ”میں رات بھر جاگتی ہوں.....“ اس نے مہر  
 ی سے مجھ دیکھا۔  
 ”آؤ..... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“  
 میں اس کے ساتھ چلا ہوا خیمے کے اندر  
 گیا..... پھر ہم دونوں آئے سانسے بیٹھ گئے تھے، نہ  
 کوئی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد شمالا کے  
 ہاتھ.....  
 ”کیا دیکھ رہے ہو.....؟“  
 ”میں سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے پہلے کیوں نہ

ملیں.....“ میں نے کہا۔  
 ”نہ جانے زندگی کے کتنے دن بے کیف ہی  
 گزر گئے۔“  
 ”میں بھی رات میں یہی سوچتی رہی۔“ شمالا نے  
 کہا۔  
 ”اور تمہاری محبت میرے دل میں اور بھی بڑھتی  
 چلی گئی۔“  
 ”شمالا..... ایک بات کہوں.....؟“  
 ”ہاں..... کہہ دو.....“ وہ پیار سے بولی۔  
 ”میں تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں.....“  
 میں نے کہا۔  
 ”میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد تمہیں اپنی ماں  
 جی سے ملوا دوں۔“  
 ”اچھا.....“ اس نے سر ہلادیا۔  
 ”تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟“  
 ”ماں جی کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے۔“  
 میں نے بتایا۔  
 ”اور بھی لوگ تھے، لیکن وہ اب اس دنیا میں  
 نہیں ہیں۔“  
 ”کیوں..... کیسے.....؟“ شمالا حیران ہو کر بولی۔  
 ”کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟“  
 ”کوئی ایک حادثہ نہیں تھا.....“ میں نے بات  
 سمجھائی۔  
 ”بس یہ اتفاق ہی تھا کہ مختلف حادثے ہوئے  
 اور پہلے میری دو بیٹیاں انتقال کر گئیں اس کے بعد ایک اور  
 حادثے نے میرے باپ کی جان لے لی۔“  
 ”اوہ..... مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔“ شمالا  
 نے کہا۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت دکھی ہو۔“  
 ”ہاں شمالا۔“ میرا لہجہ کھرا تھا۔  
 ”میرے سینے میں بہت سے غم ہیں۔“  
 ”تم پریشان نہ ہو.....“ شمالا نے مجھے دلاسا دیا۔  
 ”میں اب تمہاری زندگی میں آ چکی ہوں.....“



میں سارے زخم بھردوں گی۔ میں تمہیں اتنی محبت دوں گی کہ گزرتے ہوئے وقت کے غموں کو تم بھول جاؤ گے۔  
 ”جی“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔  
 ”ہاں ٹھیک۔۔۔۔۔“ مثالا نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیے میرے وجود میں شعلہ شعلہ کی سی لہریں گزرتی گئیں۔  
 میں اس کے قریب ہو گیا۔ اور میں نے اپنا سر اس کے چہرے پر رکھ دیا، اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو نے میری روح کو محط کر دیا۔  
 ”ٹھیک۔۔۔۔۔“ اس نے دیرے سے مجھے آواز دی۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ مثالا۔۔۔۔۔ کہو۔۔۔۔۔ میں نے مخمور لہجے میں کہا۔  
 ”کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ۔۔۔۔۔ زندگی بھر میرے ساتھ رہو گے؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ میرا وعدہ ہے۔۔۔۔۔“ میں نے اس کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حامی بھری۔  
 ”دیکھو۔۔۔۔۔ سوچ لو۔“ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔  
 ”اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے فوراً کہا۔  
 ”میں یہ بات ایک وجہ سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔  
 ”کیا وجہ ہے۔۔۔۔۔؟ بتاؤ میری جان۔“  
 ”چھوڑو۔۔۔۔۔ تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے گی۔“ اس نے کہا۔  
 ”کیوں۔۔۔۔۔؟ ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔  
 نہ جانے کیوں مثالا اس ہو گئی۔ یہ بات میں نے صاف طور پر محسوس کی تھی۔  
 ”بس۔۔۔۔۔! مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔“

”تم بتاؤ۔۔۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“  
 ”میں تمہیں اب بھی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ اور تمہاری بات معلوم ہو جانے کے بعد بھی یہ محبت اپنی جگہ قائم رہے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ مثالا نے کہا۔  
 ”میں تمہیں بتا دوں گی۔۔۔۔۔ سب کچھ بتا دوں گی۔“  
 ”بس۔۔۔۔۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔۔۔۔۔ میں جلد ہی اپنی کہانی تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں گی۔“  
 ”ابھی بتا دو۔۔۔۔۔ میں بے تاب بنی سے بولا۔  
 ”میں سننے کے لئے بے چین ہوں۔“  
 ”ابھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”میں موقع دیکھ کر تمہیں رات میں بلاؤں گی۔۔۔۔۔ پھر ہم بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے۔“  
 ”رات میں۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”تم۔۔۔۔۔ رات میں مجھ سے کس طرح ملو گی۔۔۔۔۔؟ کیسے ملو گی؟“  
 ”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”میں کل رات میں یہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم آ جانا۔“  
 یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔  
 ”اب تم جاؤ۔۔۔۔۔؟“ چند آنے والی ہے۔  
 ”لیکن یاد ہے۔۔۔۔۔ کل رات میں ضرور آنا۔“  
 پھر مثالا میرے ساتھ کچھ دور تک آئی تھی، پھر اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے رخصت کیا اور درختوں کے عقب میں چلی گئی۔  
 میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جب ”میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں ایک طویل سانس لے کر مڑ گیا۔  
 لیکن ابھی میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک

”میرے کانوں سے ٹکرائی۔“  
 ”ٹھیک۔۔۔۔۔“  
 جانی پہچانی آواز تھی، میں نے محسوس کر دیکھا کہ وہاں سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔  
 ”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“  
 ”میں۔۔۔۔۔ میں بولتے بولتے رک گیا۔  
 ”میں یہاں مثالا سے ملنے آیا تھا۔“  
 ”تو پھر۔۔۔۔۔ ملاقات ہو گئی؟“ اس نے عجیب انداز میں پوچھا۔  
 ”مجھے قصہ آ گیا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق مارتا ہو۔“  
 ”دیکھو دیان۔۔۔۔۔ تم چاہے کتنی ہی حقیقت مجھ سے چھپاؤ۔ لیکن مجھے ساری باتوں کا علم ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے کچھ کچھ ہو گے۔“  
 ”میں تم کھاتا ہوں کہ اس قدر عقل مند ہرگز نہیں ہوں۔“ دیان نے جیسے پر غلوں لہجے میں کہا۔  
 ”تم ساری بات مکمل کر مجھے بتا دو۔“  
 ”مثالا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ساری باتوں سے واقف ہو۔“  
 ”چلو میں نے مان لیا۔“ دیان نے طویل سانس لی۔  
 ”لیکن میں تمہاری مثالا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟“  
 ”اسی خیمے میں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”جہاں تم لوگوں نے اسے رکھ چھوڑا ہے۔“  
 ”یار۔۔۔۔۔ تم مجھے ابھی اس سے ملاؤ۔“ دیان ہٹ کے عالم میں بولا۔  
 ”میں اس سے خود ہی بات کر لوں گا۔“  
 ”میں تمہیں اس سے ملاؤں؟“  
 ”ہاں۔۔۔۔۔“

”چلو پھر۔۔۔۔۔“ میں کچھ سوچ کر بولا۔  
 دیان کو ساتھ لے کر میں خیمے والی جگہ کی طرف چل پڑا۔ دیان میرے ہم قدم چل رہا تھا۔  
 لیکن پھر ہم دونوں ہی ٹھٹھک کر رک گئے۔ اچانک ہی ایک رخت کی آڑ سے کالے رنگ کا ایک خوف ناک اور بھاری بھر کم کتابرا مدھوا تھا۔  
 اس کا رخ ہماری طرف ہی تھا، وہ آگے نہیں بڑھتا تھا۔ لیکن خون خوار انداز میں ہمیں دیکھ رہا تھا۔  
 ”یہ کتا کہاں سے آ گیا۔؟“ دیان بڑبڑایا۔  
 ”یہ تو بے مکی بہت خطرناک۔“  
 دفعتاً کتے نے زوردار آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتا ہو۔  
 ”یہ کیا مصیبت ہے؟“ میں پریشان ہو گیا۔  
 ”واقعی۔۔۔۔۔ دیان نے کہا۔  
 ”جے تو یہ مصیبت ہی۔“  
 ”میں نے بھی اس جنگل میں اسے دیکھا نہیں ہے۔“  
 ”چلو پھر۔۔۔۔۔“ مجھے اب گمراہ ہٹ ہونے لگی تھی۔  
 ”میں تمہیں کسی اور دن مثالا سے ملوا دوں گا۔“  
 دیان خاموش تھا، پھر ہم دونوں ہی واپس پلٹ گئے تھے۔  
 ☆☆☆☆  
 گھر پہنچا تو جیم بابا میرے منتظر تھے، اماں جی نے انہیں ایک کمرے میں بیٹھا دیا تھا۔  
 مجھے دیکھتے ہی وہ بول اٹھے۔  
 ”ارے بھئی ٹھیک میاں۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟“  
 ”جی۔۔۔۔۔! میں ذرا کام سے گیا تھا۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔  
 ”ہوں۔۔۔۔۔! اور سناؤ کیا حال ہیں۔۔۔۔۔؟ کافی دنوں بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔“  
 ”بس میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”گزر رہی ہے زندگی۔“

دہشت سے بھرپور پراسرار کہانیوں کا انتخاب

# خوفناک کہانیاں

کراچی

نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔

جس میں شامل ہے۔

ملک کے مشہور و معروف رائٹراؤیم۔ الیاس کی قسط وار کہانی  
**”پراسرار ہمزاد“** اور ایم اے راحت کی قسط وار کہانی **”کفارہ“** اس  
 کے علاوہ بیچ پرینی خوفناک، دہشت ناک، لمحہ دل کی دھڑکنیں تیز کرتی کہانیاں۔  
 آپ کے مسائل اور ان کا حل۔ رنگ دھتک۔ پراسرار دنیا۔ کھٹی میٹھی باتیں۔ اور بھی  
 بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک اسٹال یا باکس سے نام لے کر طلب فرمائیں۔

اپنی قیمتی رائے ہمیں ضرور ارسال کریں۔

## ماہنامہ خوفناک کہانیاں

نورانی آرکیڈ۔ رتن تلاؤ نمبر ۳، کراچی

Email: Khofnakahaniya@gmail.com

”چلو..... اچھی بات ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔  
 ”ویسے میں بھی آپ کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے  
 دو دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا..... لیکن مجھے شک ہے کہ  
 وہ خواب ہی تھا۔“  
 ”کیا مطلب؟“  
 ”میں نے انہیں اس دن کی کہانی سنا دی، جب  
 دوپہر کے وقت جان لیوا سے میری ملاقات ہوئی تھی  
 اور پھر اس کے ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھے تھے۔  
 لیکن پھر وہ سب کچھ ایک خواب کی مانند رہ گیا تھا اور مجھے  
 امان جی نے بے ہوشی کے سے عالم میں چلاتے ہوئے  
 دیکھا تھا۔“  
 یہ سن کر رحیم بابا کے چہرے پر فکر کے بادل  
 چھا گئے..... پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولے۔  
 ”ڈراوا..... صرف ڈراوا۔“  
 ”کیا مطلب رحیم بابا.....؟“  
 ”مطلب یہ ہے کہ وہ شے جسے صرف ڈراوی  
 ہے..... اور..... اگر تم اس سے ڈر گئے تو اس کی جیت  
 ہو جائے گی۔“  
 ”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“  
 ”میں نے حساب کتاب لگایا ہے۔“ رحیم بابا نے  
 کہا۔  
 ”اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ شے تمہیں  
 کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ تم اپنے باپ دادا  
 کی طرح کالے اور گندے علم سے پاک ہو۔“  
 ”اگر یہ بات ہے، تو میری بہنوں نے کیا قصور  
 کیا تھا.....؟“ میں نے جرح کی  
 ”وہ بے چارے کون سا علم جانتی تھیں.....؟“  
 ”اس وقت تمہارا باپ زندہ تھا۔“ وہ بولے۔  
 ”اور گندے علم کے اثرات تمہارے پورے  
 گھر پر موجود تھے۔ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہی  
 وہ اثرات ختم ہو گئے تھے۔ اسی لئے اب وہ شے تمہیں جانی  
 نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“  
 ”لیکن وہ مجھے کسی وقت بھی دھمکا سکتی ہے.....“  
 ”میں نے تو اسے کہا۔“ میں نے تو اسے کہا۔  
 ”اور میں نے ہی سے اس کا تماشہ بنا ہوں گا۔“  
 ”ابھی کچھ نہیں ہوگا۔“ رحیم بابا نے اعتماد سے کہا۔  
 ”میرا ہاتھ تمہارے سر پر ہے۔ اور میں تمہیں اس  
 کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا۔“  
 یہ سن کر میرے دل میں ہلچل مچ اٹھی..... ضبط کا بندھن ٹوٹا اور  
 میری آنکھیں بھرا گئیں یہ دیکھ کر رحیم بابا اٹھے اور مجھے  
 اپنے سینے سے لگا کر بولے۔  
 ”میرے بچے رو کیوں رہے ہو.....؟ یہ بات  
 غلط ہے۔“  
 ”کیا کروں رحیم بابا..... میں تو اب ایک نئی اور  
 اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ لیکن اپنے مقدر سے مجھے  
 ڈر لگتا ہے۔“  
 ”تم فکر مت کرو..... خدا نے چاہا تو سب کچھ  
 ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 اس وقت میرے دل نے چاہا کہ میں انہیں مثالا  
 کے متعلق بھی بتا دوں۔ کیونکہ اب وہ میری زندگی کی نویہ  
 بن چکی تھی۔  
 مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔  
 ”کیا ہوا.....؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“  
 ”جی ہاں.....“ میں نے قدرے ہچکچاتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”دراصل مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔“  
 ”یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ مسکرائے۔  
 ”کون ہے وہ.....؟ کہاں رہتی ہے۔“  
 ”یہ ڈرائیو ہے مسئلہ.....“ میں نے سر کھپایا۔  
 ”میری محبت کی داستان بھی میری زندگی کی طرح  
 عجیب و غریب ہے۔“  
 ”اچھا.....“ انہوں نے کہا۔  
 ”تم مجھے ضرور بتاؤ..... میں سمجھ جاؤں گا۔“  
 اب میں نے انہیں مثالا کے متعلق بتا دیا، وہ  
 غور سے سن رہے تھے، کئی جگہ انہوں نے مجھے روکا بھی  
 تھا، اور کچھ سوالات بھی کئے تھے۔

جب میں خاموش ہوا تو وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے، میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بولے۔

”تم اس سے ملنے کب جاؤ گے؟“

”اس نے مجھے کل رات میں بلایا ہے۔“

”اچھا.....“ انہوں نے سر ہلایا۔

”تو پھر ایک کام کرو۔“

”جی ہاں۔“

”تم وہاں آ کیسے نہیں جاؤ گے۔“ انہوں نے کہا۔

”میں بھی وہاں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”آپ..... لیکن.....! میں بولتے بولتے

رک گیا۔

”تم فکر مت کرو..... میں تم سے فاصلے پر موجود

رہوں گا۔ دراصل رات میں جنگل کا تنہا سفر کرنا ٹھیک نہیں

ہے اور میرا خیال ہے کہ میری موجودگی تمہارے لئے

مناسب رہے گی..... میں دور کھڑا رہوں گا، جب تم اس

سے ملاقات کرو گے تو میرے ساتھ واپس چلے آنا..... کیا

خیال ہے؟“

”لیکن آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوگی۔“

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ انہوں نے

مسکرا کر جواب دیا۔

”دراصل میں تمہیں آ کیا نہیں بھیجنا چاہتا۔“

یہ کہہ کر وہ پھر کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ چودھویں کی رات تھی۔

چاندانی آب و تاب پر تھا اور میں صحن میں کھڑا ہوا رحیم بابا

کا انتظار کر رہا تھا۔ آج انہوں نے میرے ساتھ جنگل میں

چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور مجھے شالا نے رات میں ہی وہاں

بلایا تھا۔

اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رحیم بابا نے بالکل

درست فیصلہ کیا تھا، میں نے جذبات میں آ کر شالا سے

وعدہ تو کر لیا تھا، لیکن رات کے وقت جنگل میں جانا کافی

دل گروے کا کام تھا..... مجھے اس بات پر حیرت بھی

ہو رہی تھی کہ اس وقت شالا وہاں کیسے پہنچ سکے گی۔

بہر حال وہاں جانا ضروری تھا..... اور میں رحیم بابا

کا منتظر تھا..... وعدے کے مطابق تو انہیں آنے میں

دیر ہو چکی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نہ آ سکیں..... اس صورت میں

مجھے تنہا جانا پڑتا..... اور شالا کی خاطر شاید میں یہ ہمت

کر ہی بیٹھتا۔

آخر کار دروازے پر دستک ہوئی اور میں جلدی

سے آگے بڑھا۔ اماں جی سوچتی تھیں..... اور ان کی اسی

غفلت میں ہمیں اپنا کام پورا کرنا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی رحیم بابا کی شکل دکھائی دی۔

”کیا تم تیار ہو.....؟“ انہوں نے فوراً ہی پوچھا۔

”جی.....!“

”چلو پھر.....“ وہ بولے۔

”تمہاری والدہ سو رہی ہیں؟“

”جی ہاں.....“

”یہ بہتر ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”مجھے امید ہے کہ جلد ہماری واپسی ہو جائے

گی۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“

”اور میں بھی۔“ رحیم بابا عجیب سے انداز میں

مسکرائے جسے میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر رہا۔

”آپ کو دیر ہو گئی.....“ میں نے قدم بڑھاتے

ہوئے پوچھا۔

”ہاں.....! مجھے تمہارے قاسم ماموں نے ایک

کام کے سلسلے میں روک لیا تھا، اسی لئے میں دیر سے

پہنچا۔“

”جی اچھا..... ویسے ان کا کیا حال ہے؟“

”کیا ہو گا..... اداس اداس رہتے ہیں بے

چارے۔“ انہوں نے بتایا۔

”یوں بھی دگر میں کتنے ہی کب ہیں۔“

”اداس تو ہوں گے ہی.....“ میں نے طویل

سانس لی۔

”ان کے ساتھ بہت ہی غلط ہوا ہے۔“

”لیکن زندگی بہت طویل ہے..... اب ان

گناہانہا ہم سفر جن لینا چاہئے..... آخر کب تک تنہا

ہو جائیں گے۔“

”ماں جی نے انہیں سمجھا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن انہوں نے شاید کان نہیں دھرے۔ اب

میں کسی دن انہیں ساتھ لے کر ماموں کے پاس آؤں گا،

گھر وہ خود ہی ان کی خبر لیگی۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ رحیم بابا نے ہنس کر کہا۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ رات کا اندھیرا سناٹا

دور در تک پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں حشرات الارض کی

آوازیں گونج رہی تھیں، خاص طور پر جھینگروں کی جھانگیں

اتھانیں عجیب سا ساں پیدا کر رہی تھیں۔

میرے ہاتھ میں تارچ تھی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں تارچ تھی۔ ایسے میں مجھے اس کتے کا

ظہاں آیا جس سے گز کر شرور ”ملاقات“ ہوئی تھی۔

میں نے رحیم بابا سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے۔

”وہ اس وقت نہیں ملے گا..... تم پرواہ مت کرو۔“

میں ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا..... وہ اتنے یقین

کے کہہ رہے تھے جیسے اسے اچھی طرح جانتے ہوں۔

ان سے دوبارہ استفسار کرنے کی جرأت نہیں

ہوئی، میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس وقت بات کرنے کے

مقام میں نہیں ہیں۔

واقعی دور دور تک کسی کتے یا اور کسی جانور کا وجود

انہی نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار میں رحیم بابا کو اس جگہ

لے آیا، جہاں درختوں کے دھری طرف شالا کا خیمہ

تھا۔

میں رکا اور رحیم بابا کی طرف دیکھ کر بولا۔

”منزل آگئی ہے رحیم بابا.....“

”اچھا.....“ انہوں نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔“ تم جاؤ..... میں یہاں تمہارا

گھر رہا ہوں۔“

”آپ یہ تارچ رکھ لیں۔“

”نہیں اسے ساتھ لے جاؤ.....“ وہ بولے۔

”میں اندھیرے میں بھی آسانی سے دیکھ

سکتا ہوں..... اب جاؤ۔“

میں نے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ سامنے

شالا کا خیمہ اپنی جگہ پر موجود تھا، اور اس سے روشنی

پھوٹ رہی تھی۔

میں خیمے کے قریب آ گیا، دروازے کی صورت

میں ملتے ہوئے پردے سے ہی شالا کا وجود کسی سائے کی

مانند دکھائی دے رہا تھا۔

شاید اندر کیرو سین لیمپ روشن تھا۔ میں نے آواز

لگائی۔

”شالا..... میں آ گیا ہوں.....“

فورا ہی شالا کا وجود متحرک ہوا اور اس کی آواز

میرے کانوں سے نکل گئی۔

”اندرا آ جاؤ کھیل۔“

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا..... ایک طرف

واقعی کیرو سین لیمپ روشن تھا اور پیال پر شالا سگری ہوئی

بیٹھی تھی۔

میری طرف دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”مجھے ڈرگ رہا تھا..... اس لئے اٹھ کر تمہارا

استقبال نہیں کر سکی..... میں معافی چاہتی ہوں۔“

”یہ تو حقیقت ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”رات کے اس پہر تمہاری یہاں موجودگی واقعی

بہت دل گروے کا کام ہے۔“

”میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔“ وہ دواؤں

ہو کر بیٹھی۔

”آؤ..... میرے قریب آ جاؤ۔“ میں تم سے مل

کر سارے غم بھلا دینا چاہتی ہوں۔“

میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا..... لیمپ کی روشنی

میں اس کا چہرہ اور بھی حسین دکھائی دے رہا تھا..... ماتھے

پر اٹھ کر آنے والی زلفوں نے گویا قیامت ڈھادی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اٹھایا اور میرے ہاتھ



ہوں..... اس نے بدستور سمرائے ہوئے کہا۔

فرقہ ہیں۔

میں نے تو یہی سوچا تھا کہ اسی وقت جان لیوا کی اس چال کو سمجھ

یہ سن کر مریم بابا سکرائے اور بولے۔



رحیم بابا کے آنے سے ہمارے گھر میں رونق سی آگئی تھی، انہوں نے اماں جی کے ہاتھ میں جب ایڈولاس کی نرم رکھی چائی تو وہ خورا بولیں۔  
 ”میں یہ ہرگز نہیں لوں گی کیونکہ یہ آپ ہی کا گھر ہے اور آپ میرے بھائی ہیں۔“  
 ”جب بھائی کہہ دیا تو یہ بہن کا حق ہے، جوش دے رہا ہوں۔“ رحیم بابا بولے۔

”میں نے قاسم میاں کے یہاں جب سے نوکری کی ہے، میری تنخواہ میرے پاس جمع ہوتی رہی، کیونکہ میرا ہے کون کہ جس میں خرچ کرتا..... اب تو موقع ہاتھ لگا ہے کہ میں اس رقم کو کسی کام میں لاسکوں..... ورنہ میرے لئے تو اتنی رقم کافی ہے کہ میرا فن آ جائے۔ اور مجھے اب کیا کرتا ہے۔“

”خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ ایسی باتیں نہ کریں۔“  
 ”مرنا تو ہے ایک دن..... اور یوں بھی موت  
 کو یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے خیر..... ابھی آپ یہ رکھ  
 لو بہن..... اور میں باہان نہ کرائی بھی دوں گا میں یہاں رات  
 میں آیا کروں گا، کیونکہ دن میں قاتم میاں کے گھر کا کام  
 سنبھالنا ہے.....“

یہ کہہ کر انہوں نے اچھی خاصی رقم زبردستی اداں  
جی کے ہاتھ پر رکھ دی مکان خالی ہو چکا تھا، چنانچہ وہ  
میرے ساتھ اسی جے میں آ گئے..... اور ہال نما کمرے  
میں بیٹھ کر بولے۔

”بس..... یہ کمرہ ہی ہمارے کام کا ہے..... یہیں  
سے ہمارے مشن کا آغاز ہو گا۔ اور مجھے امید ہے کہ جلد ہی  
چان لیوا سے آ مناسبانہ ہو جائے گا۔“

”جتنی جلدی ممکن ہے رحم فرمایا.....؟“  
 ”جتنی جلدی تم..... عملیات پر عبور حاصل  
 کر لو گے..... کیونکہ صرف عملیات ہی کے ذریعے اسے  
 قابو میں کیا جاسکتا ہے۔“

اور پھر..... میں نے عملیات کی دنیا میں قدم رکھ دیا..... رحیم بابا کسی ڈیوٹی کی طرح اپنی آمد و رفت

نبحار ہے تھے..... دن بھر قاسم ماموں کے گھر میں رہتے  
اور رات کے وقت حویلی آ جاتے۔

میں ابتدائی عملیات سے گزر رہا تھا..... رحیم بابا میرا ذہن اس طرف مائل اور مرکوز ہونے کے طریقے استعمال کر رہے تھے۔

لیکن یہ سب کچھ حیر کے سنے تھے، یعنی شہر سے  
ملکر لینے کے لئے خیر کی پرورش ہو رہی تھی۔

مجھے آج بھی یاد تھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں میرے  
باپ کی جان گئی تھی اور جس نے ان کی جان لی تھی میں اب  
خود اس کی جان کے درپے تھا۔

مختلف عملوں کے ساتھ ساتھ رحیم بابا خود اعتمادی پر بھی بے تحاشہ زور دیتے تھے..... اور پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔

”اب تم تیار ہو جاؤ..... آج رات میں تمہیں ایک اہم چل بتاؤں گا..... اور اسے تم کو نگار تین دن تک کرتے رہو گے..... اس کے بعد تم میرے ساتھ قبرستان چلو گے جہاں تم نے آخری چلہ کاٹنا ہے“

”قبرستان میں.....؟“  
 ”ہاں.....!“ انہوں نے گردن ہلائی۔

”اس کے بارے میں وہیں بات ہوگی.....“  
 ”بہر حال آج رات سے تمہارا مقابلہ شروع ہو جائے گا۔“

رحیم بابا چلے گئے، اور میں سوچ میں ڈوب گیا..... میں جس راستے پر چل نکلا تھا، اس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میرا باپ بھی عملیات کا ماہر تھا، لیکن اس کی وقتی  
 محبت اور شفقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اس حصے میں  
 بلا آ آتا تھا، ورنہ ذاتی طور پر مجھے ان سب چیزوں سے کوئی  
 بچہ نہیں تھی۔

لیکن آج میں اسی حصے میں بیٹھ کر رحیم بابا سے  
ملیات سیکھ رہا تھا.....

رجیم بابا کو گئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ  
ماں جی آ گئیں۔

مجھے ان کے تیور کچھ ٹھک نہیں لگ رہے تھے، وہ

مجھے خون خوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں، پھر اچانک ہی مجھ پر برس پڑیں۔

”میں نے تجھے منع کیا تھا کہ اپنے باپ کے نقش قدم پر مت چلنا۔ لیکن تو نے میری ایک نہ سنی۔ اب تو زندگی بھر مجھ سے بات نہ کرنا۔۔۔۔۔ ہاں۔“

”لیکن اماں جی..... میں تو آج کی اجازت سے  
میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ کام کر رہا ہوں..... میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔“  
 ”ہاں..... میں جانتی ہوں..... تم نے مجھے  
 بتایا تھا.....“ وہ قدرے نرم ہو گئیں۔

”لیکن میں اس وقت شاید ہوش میں نہ ہوں  
 گی..... اب میں اپنے ہوش و حواس میں تھیں حکم دے  
 رہی ہوں کہ تم ان چیزوں سے دور رہو..... کیا تم نے اپنے  
 باپ کا انجام نہیں دیکھا تھا.....؟ کیا تم وہ سب کچھ بھول  
 گئے.....؟“

”جہیں..... اماں جی..... مجھے سب کچھ یاد ہے..... اور ان ہی یادوں نے مجھے اس بات پر مجبور کیا ہے کہ میں اس راستے پر چلوں۔“

”چھوڑ دو یہ راستہ.....“ انہوں نے سخت لہجے میں  
 ”نہیں۔“

”اور رحیم بابا کو بھی بھگا دیا یہاں سے۔“  
یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور میں انہیں نہ تکتا رہ گیا تھا۔  
تھوڑی دیر بعد میں خود بھی اماں جی والے حصے

میں چلا آیا تھا، لیکن خلاف توقع ان کا موڈ نارمل تھا جب انہوں نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا تو میں سمجھ گیا کہ یہ اسی ”جسم بے وجود“ کی کارستانی رہی ہوگی۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں کھانا کھاتے ہی گھر سے باہر نکل گیا..... سدا سے بھی کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

چنانچہ اس کی طرف جالکا..... سدو نے مجھے  
مکھتے ہی شکایتوں کے ٹوکے کھول دیے۔

”بیٹا..... اتنے دنوں بعد شکل دکھا رہے ہو.....“

”اے کبھی محبت کہاں کی محبت.....“ میں نے  
سر جھٹکا۔

”شالا میرے لئے صرف اور صرف ایک ڈراؤنا خواب تھا۔“

”کیا مطلب.....؟ میں سمجھا نہیں۔“ اس نے حیرت سے مجھ دیکھا۔

”اور مڑے کی بات یہ ہے کہ میں سمجھا بھی نہیں سکتا.....“ میں نے ایک طویل سانس لی، پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا:

”میں شالا کو بھلا چکا ہوں، تم بھی بھول جاؤ.....  
وہ صرف ایک دھوکا تھا، فریب تھا۔“

”کیا بات کر رہے ہو یا ر.....؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”وہ دراصل ایک بدروح تھی.....“ میں سنجیدگی سے بولا۔

“ف.....عزوزي”

”ہاں..... میں جس سے ملاتھا، اس لڑکی کا اصل وجود تو کئی سال پہلے دنیا سے ہی رخصت ہو چکا تھا..... اس بدروح نے اسی لڑکی کا روپ دھار لیا تھا۔“

”کیوں ڈر رہے ہو مجھے.....“ وہ ہلکچا کر بولا۔  
 ”تم تو اس کی محبت میں دیوانے ہو چکے تھے،  
 پھر یہ راز کیسے کھلا؟“

”مجھ دیان نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی مر چکی ہے۔“  
”کیا تم مذاق کر رہی ہو؟“

”کیا تم کو کسی آ رہی ہے.....؟“ میں نے اسے  
 مگھوڑا۔

”میں دیان سے پوچھوں.....؟“

کرو..... اب کوئی اور بات کرو.....!“

یہ بتاؤ کہ ارشاد نہیں ملی تو پھر م  
کہاں غائب تھے؟

اسی لئے میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے تو یقین نہیں ہونی



کہ تم خود آ کر میرا سال چال پوچھ لیتے؟“  
”میں نے سوچا کہ رنگ میں بھگ کیوں ڈالوں  
جب عشق کا بھوت اترے گا تو خود ہی تمہیں میری  
یا دوستائے گی۔“  
”وہ واقعی بھوت تھا۔۔۔۔۔ میں نے ایک طویل  
سانس لی۔“

”لیکن عشق کا نہیں بلکہ۔۔۔۔۔ حقیقی بھوت۔“

☆ ☆ ☆  
رجیم بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق  
میں نے چھری پر پھونک مار کر اپنے گرد حصار کھینچنا شروع  
کر دیا۔

میں اس وقت کمرے کے صحن وسط میں موجود تھا  
اور میرا منہ دروازے کے رخ پر تھا۔۔۔۔۔ اسی کمرے کے  
ایک کونے میں رجیم بابا آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔

یہ حصار دراصل میرے اپنے گرد کا حفاظتی حصار  
تھا۔۔۔۔۔ رجیم بابا نے مجھے عمل شروع کروانے سے پہلے  
بہت کچھ سمجھا تھا اور پھر آخر میں کہا۔

”کچھ بھی ہو جائے، لیکن تمہیں اس دائرے سے  
باہر نہیں نکلتا۔۔۔۔۔ خود میں بھی اگر تمہارے سامنے دم  
توڑ رہا ہوں تو بالکل پرواہ مت کرنا۔۔۔۔۔ کیونکہ مجھے پورا  
یقین ہے کہ تمہیں اس عمل سے روکا جائے گا۔۔۔۔۔ یہ عمل  
تمہیں یہاں تین دن مسلسل کرنا ہے اور پھر ایک آخری  
مرحلہ ہوگا جو کافی کھن ثابت ہوگا۔“

”اس میں کیا کرنا ہوگا رجیم بابا۔۔۔۔۔؟“ میں  
قدرے پریشان ہو گیا۔

”وقت آنے پر بتاؤں گا۔“ انہوں نے کہا۔  
”ابھی جو کل تم حصار کھینچ کر کرنے والے ہو۔۔۔۔۔

یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس کے دوران تمہیں کچھ  
ایسی چیزیں نظر آ سکتی ہیں، جو تمہیں ڈرا کر یا پھر پریشان  
کر کے اس عمل سے روکنے کی بھرپور کوشش کریں گی۔۔۔۔۔  
لیکن تم نے کسی بات کا کوئی اثر نہیں لینا۔۔۔۔۔ جو کچھ بھی  
ہوتا رہے۔۔۔۔۔ تمہارا دھیان صرف اپنے درد

پر ہونا چاہیے۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔“ میرا  
لہجہ مضبوط تھا۔  
”کیونکہ میں نے اپنے دل سے ڈر نکال دیا ہے  
میں اب جان لیوا کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔“  
”شباباش۔۔۔۔۔ مجھے تم سے یہی امید ہے۔“ وہ  
بولے۔

”بارہ بیٹے میں صرف تھوڑی دیر باقی ہے جیسے ہی  
میں اشارہ کروں، تم عمل شروع کر دینا۔“

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی میں نے رجیم بابا کا بتایا ہوا  
ورد لیوں پر جاری کر لیا۔

ابھی مجھے پڑھتے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی  
کہ میرا حلق خشک ہونے لگا۔ اچانک ہی شدید قسم کی  
پیاس کے احساس نے مجھے جھک کرنا شروع کر دیا۔

اب کیا کروں۔۔۔۔۔ میرا ذہن جھٹکنے لگا۔ لیکن  
اس عمل کو ابھی کئی گھنٹے جاری رکھنا تھا اور اس پیاس کے

ہاتھوں مجھے کچھ دیر بھی ورد کرنا بھاری لگ رہا تھا۔۔۔۔۔  
میں نے خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش صرف کر دی۔۔۔۔۔

ممکن تھا کہ اس عمل کی بدولت ہی میرا یہ حال ہو رہا ہو۔۔۔۔۔  
چنانچہ میں نے حلق میں پڑنے والے کاشٹوں کی طرف  
سے اپنا ذہن یکسر ہٹا لیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ حیرت انگیز طور پر میری  
پیاس کی شدت خود بہ خود کم ہوتی چلی گئی میں کافی حیران  
تھا۔

ایک بار پھر میں اپنی یکسوئی کے ساتھ عمل میں  
مصروف ہو گیا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ پیاس عمل  
کی تکمیل میں پہلی رکاوٹ تھی۔ جسے میں نے قدرے  
مشکل سے دور کر لیا تھا۔

میں پڑھ رہا تھا۔۔۔۔۔ مسلسل پڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔  
میں کبھی آنکھیں کھول لیتا اور کبھی بند کر لیتا۔۔۔۔۔ کئی بار نیند  
نے بھی مجھ پر حملہ کیا، لیکن میں نے کمال ضبط سے اسے  
بھی خود سے دور بھگا دیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد مجھے پیاس کی شدت اس طرح  
محسوس ہونے لگی کہ اگر اس سہارا بھی سامنے نہ ہو تو میں اسے

ہلا جاؤں۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اس پیاس کو مسلسل کھست دیتا  
رہا۔

آخر کار میں اپنا عمل مکمل کرنے میں کامیاب  
ہو گیا۔

یہ تین دن کا عمل تھا جو میں نے رجیم بابا کی مگرانی  
میں کامیابی سے پورا کر لیا تھا۔

چوتھے دن رجیم بابا آئے تو ان کے چہرے پر  
محممیر قسم کی سنجیدگی طاری تھی وہ مجھے کسی سوچ میں کم  
دکھائی دینے تو میں پوچھ بیٹھا۔

”کیا ہوا رجیم بابا۔۔۔۔۔ آپ کچھ پریشان دکھائی  
دے رہے ہیں۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔! وہ قدرے مسکرائے۔  
”میں پریشان نہیں ہوں۔۔۔۔۔ البتہ تمہارے لئے  
گرمند ضرور ہوں۔“

”میرے لئے۔۔۔۔۔؟“  
”ہاں۔۔۔۔۔؟“

”کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ جان لیوا مجھے کوئی  
گرمند پہنچا سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولے۔  
”دیکھو۔۔۔۔۔ جو اس وقت تم کر رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ

ایک کھلی جنگ ہے اور جنگ میں دشمن کو کمزور سمجھنا بے  
فائدہ ہے۔ اب تم جس اسکے عمل کا آغاز کرنے والے ہو

وہ کسی حملے سے کم نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مقابل بھی  
کار کر سکتا ہے۔“

”اب تو اوکلی میں سروے دیا ہے رجیم  
بابا۔۔۔۔۔! میں نے طویل سانس لی۔

”اب موسلوں سے ڈرنے کا کیا فائدہ۔۔۔۔۔؟“  
”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔! انہوں نے سر ہلایا۔

”اب پیچھے ہٹنا بزدلی ہے۔۔۔۔۔ گویا میدان چھوڑ  
کر بھاگنے کے مترادف ہے۔“

”بالکل۔۔۔۔۔! میں نے سر ہلایا۔  
”اس لئے آپ کی اور طرف سے سوچیں اور مجھے  
گیں کہ اب کیا کرنا ہوگا۔“

”اب ذرا مشکل مرحلہ ہے۔۔۔۔۔! انہوں نے اپنی  
سفید داڑھی میں انگلیوں سے خدایا۔

”ہمیں پرانے قبرستان جانا ہوگا۔۔۔۔۔ جہاں متواتر  
چالیس دن تک تمہیں چلہ کاٹنا ہے۔۔۔۔۔ اور سن ممکن ہے

کہ چالیس دن سے پہلے ہی وہ تمہارے سامنے  
آ جائے۔۔۔۔۔ کیونکہ اس چلے کے مکمل ہوتے ہی میں اس

سے تمہارا مقابلہ کروادوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کامیابی  
سے چلہ کاٹنے کے بعد تم اسے آسانی سے زیر کر سکتے ہو۔“

”ہوں۔۔۔۔۔! تو کیا ہمیں چالیس دن تک  
قبرستان میں ہی رہنا ہوگا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن رات بارہ بجے سے پہلے وہاں  
موجود ہونا لازمی ہے۔۔۔۔۔ اور پھر وہاں سے فجر کے

بعد ہماری واپسی ہوگی۔“ انہوں نے بتایا۔  
”اوہ۔۔۔۔۔! میرے منہ سے نکلا۔

”تو یہ بات ہے۔۔۔۔۔“  
”ہاں۔۔۔۔۔! اب تم کمر کس لو۔۔۔۔۔! وہ بولے۔

”کیونکہ آج تمہیں اس چلے کے بارے میں  
تفصیل سے بتانے کے بعد میں کل سے تمہیں وہ عمل

شروع کروادوں گا۔“  
”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں تیار ہوں۔“

”شباباش۔۔۔۔۔! وہ جوش سے بولے۔  
”کسی بھی موقع پر ہراساں نہ ہونا۔۔۔۔۔ میں

تمہارے ساتھ ہوں۔“  
☆ ☆ ☆

دوسرے دن رات کو میں رجیم بابا کے ساتھ گھر  
سے نکل کھڑا ہوا تھا، میرے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس

میں رجیم بابا کی ہدایت پر کچھ ضروری سامان رکھا گیا تھا۔  
اس روانگی سے اہل جی لفظی لاعلم تھے کیونکہ رجیم

بابا نے اس سلسلے میں کافی رازداری سے کام لیا تھا، اور ماں  
جی کے نیند کی آغوش میں جانے کے بعد ہی ہم دونوں باہر  
نکلے تھے۔

وہ رات نہ جانے کچھ زیادہ ہی تاریک تھی، یا پھر  
مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا ویسے آسمان کافی حد تک بادلوں

سے ڈھکا ہوا تھا اور اسی وجہ سے شاید چاند کی روشنی انہی بادلوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

پرانہ قبرستان یہاں سے کافی دور تھا، چنانچہ ایک رکشے میں بیٹھ کر ہم وہاں تک پہنچے تھے البتہ رحیم بابا نے تھوڑے فاصلے پر کھڑکوا لیا تھا۔

یہ ایک نوا آباد علاقہ تھا۔۔۔۔۔ جہاں قبری کام جاری تھا اور کئی گھر اور بڑے بڑے ہوتے تھے۔۔۔۔۔ شاید اسی بناء پر ان میں ابھی رہائش نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔ یہاں لائٹ کا انتظام بھی ابھی بہتر نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس کے باوجود لوگ یہاں کافی تعداد میں آباد ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ابھی خالی مکانوں اور ادھوری ادھوری چار دیواریوں کا تناسب زیادہ تھا۔ اس علاقے سے ذرا ہی دور پرانا قبرستان موجود تھا۔

بھونکنے والے کتوں کی آوازیں گویا چاروں طرف سے گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن رحیم بابا ان سے لاپرواہ تھے اور نپے تلے ہوئے قدموں سے اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

میں ان کے عقب میں چل رہا تھا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ہی پرانا قبرستان شروع ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ کیروسین لیمپ کی روشنی میں یہ قبرستان مزید ہیبت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

کیروسین لیمپ رحیم بابا کے ہاتھ میں تھا۔۔۔۔۔ اور چند لمبے پہلے ہی انہوں نے اسے روشن کیا تھا۔ کیونکہ اب چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔۔۔۔۔ دور دور تک سوائے کتوں کی بھڑائی یا آوازوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یہ وہ قبرستان تھا جسے پرانے قبرستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ اب یہاں کافی عرصے سے کسی کو دفنایا نہیں گیا تھا۔۔۔۔۔ اڑی اڑی خبر تھی کہ یہ قبرستان کچھ عرصے بعد سار کا دریا جانا گئے۔

اب میں مکمل طور پر رحیم بابا کی ہمراہی میں قبرستان کے اندر داخل ہو چکا تھا جیسے گروں کی خوف ناک ”جھانکیں جھانکیں“ اب اور زیادہ گونجنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کانوں میں سوئیاں چھو رہی ہوں۔

”کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟“ فختار رحیم بابا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں چونک اٹھا۔

”جی۔۔۔۔۔ نہیں رحیم بابا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ پھر اتنے خاموش کیوں ہوں؟“

”ماحول کا اثر ہے جناب۔۔۔۔۔“ میں طویل سانس لے کر بولا۔

”چاروں طرف اس قدر سناٹا اور خاموشی ہے کہ میری زبان بھی چپ ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”انسان پر ماحول کا بھی بہت اثر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خیر آؤ۔۔۔۔۔ اس طرف آ جاؤ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہموار جگہ کی طرف اشارہ کیا جو قدرے وسیع تھی اور اس کے قریب ایک بوڑھا اور گھٹا رنگہ گدا درخت موجود تھا۔

”کیا آپ یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے چلتے چلتے پوچھا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں یہاں متعدد دفعہ آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور اس کے چبے چبے سے بہ خوبی واقف ہوں۔۔۔۔۔ میں نے کئی گھنٹا میں یہاں گزار دی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔؟“ میرے منہ سے نکلا۔

”لیکن یہاں اکیلے رہنا تو بڑے دل گردے کی بات ہے۔“

”میں یہاں وہی چلے کاٹ چکا ہوں جواب تم کاٹنے جا رہے ہو۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”میں تمہارے دشمن کو زیر کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ کام خود کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ تم خود اپنے آباؤ اجداد کا بدلہ لوگے تو اسی طرح تمہارے دل کو غمزدگ مل سکتی ہے یوں بھی میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے رحیم بابا۔“ میں نے سر ہلایا۔

”میں تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس کا قصہ پاک

کر سکتا چاہتا ہوں۔ مجھے اسی ارادے نے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔“

”تمہاری بات سن کر میں خوش ہوا۔“ وہ بولے۔

”اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور کامیابی حاصل کر گے۔“

☆ ☆ ☆

اب صورت حال یہ تھی کہ رحیم بابا اسی بوڑھے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے اور میں ان سے قدرے فاصلے پر کھینچے ہوئے حصار میں آلتی پالتی مادر بیٹھا ہوا تھا۔

میں ان کا تانا بواؤ دیکھ کر شروع کرنے ہی والا تھا کہ رحیم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”ٹھیک بیٹا۔۔۔۔۔ میری ایک بات گروہ میں باندھ لو۔ اسی حالت میں بیٹھے رہو اور میری بات غور سے

سنو۔۔۔۔۔ تمہارے سامنے کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن تم اس دائرے سے مت نکلو۔ جو حصار کھینچا ہے اگر کسی بنا پر تم

نے اپنے جسم کا کوئی بھی حصہ اس حصار سے باہر نکالا تو کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ اگر تم یہ بھی دیکھ لو کہ

گوئی مجھے یعنی تمہارے رحیم بابا کو قتل کر رہا ہے تو تب بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا مجھے امید ہے کہ تم میری باتوں پر عمل کرو گے بس اب عمل شروع کرو۔“

میں نے اپنی آنکھیں قدرے نیم وا کر لیں۔

اور پھر میرے اور درختوں کے درمیان یہ وظیفہ اس سے کافی مختلف تھا

اور میں نے حویلی میں بڑھا تھا کافی دیر تک میں بڑھتا رہا

اور کوئی واقعہ وارد نہ ہوا لیکن پھر اچانک ہی کسی کے رونے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں بری طرح

ٹپک اٹھا۔ میرے جسم کے رونے کھڑے ہو چکے تھے

وہ۔۔۔۔۔ کچھ ایسی ہی سوائی قسم کی آواز تھی۔ بے حد

ناگ اور۔۔۔۔۔ کچھ عجیب سا تاثر تھا اس آواز میں۔۔۔۔۔

ہاں کرتا میرے بس سے باہر ہے۔

ہاں وہ بین تھا۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

میں چھوٹا تھا تو محلے میں نصرت خالہ کے شوہر کا انتقال

تھا اور خود نصرت خالہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسی طرح رویا

کرتی تھیں۔

میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تھا کیونکہ یہ آوازیں اب بڑھتی ہی جاری تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت روتی ہوئی اسی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔

اور تیز۔۔۔۔۔ اور تیز میں بے چین سا ہو گیا البتہ میں بدستور وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

میں اسی وقت رحیم بابا کی آواز مجھے اپنے قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”دھوکا ہے ٹھیک۔۔۔۔۔ اب سب دھوکا ہے۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔۔۔۔۔ لمحہ بھر کے لئے بھی غافل نہ ہونا۔“

خبردار۔

میں مزہ کر دیکھ نہ سکا، کیونکہ اس حرکت سے بھی انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ میں کسی بت کی

مانتھا اپنی جگہ جما ہوا تھا۔

شاید کوئی تصور کر سکے۔۔۔۔۔ اس شگفتہ حال قبرستان میں آدمی رات کے وقت اس عورت کی آواز کس قدر

بسیا تک اور لرزہ خیز محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ آواز اچانک ہی بند ہو گئی اور چاروں طرف موت کا سناٹا چھا گیا۔

یوں بھی یہاں موت کا ہی راج تھا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ یہ پرانی اور بوسیدہ ٹوٹی پھوٹی قبریں مجھے موت کی کہانیاں

سنارہی تھیں۔

ایک بار پھر اس فضا پر جیسے گروں کی جھانکیں جھانکیں غالب آ گئی اور میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

میرے ہونٹوں پر بدستور وظیفہ جاری تھا۔

میں نے وظیفہ ختم کیا تو صبح کا نور چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔

میں اسی وقت رحیم بابا اٹھ کر میرے سامنے آ گئے اور بولے۔

”کامیابی کی بیڑھی پر پہلا قدم مبارک ہو۔“

”جی رحیم بابا۔۔۔۔۔ شکریہ۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”چلو اب کھر کا رخ کرتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”اس وقت سواری بھی ذرا مشکل سے ہی ملے



ایس اتیار احمد - کراچی

## شب

نوجوان کے پاس اب قطعی وقت نہیں تھا اس کا تھکے رات کے اندھیرے میں قرب و جوار کو دھلا کر رکھ دیا، وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا تھا اسے پتا تھا کہ اصل سراغ لگاتے لگاتے پولیس تھک جائے گی۔

دوسروں کو بے وقوف سمجھنے والا..... خود بڑا بے وقوف ہوتا ہے..... ایک حقیقی کہانی

شوہر خون آشام چکا ڈرکی مانند ہو گیا۔ اس نے وقتاً خون نہیں پیا تھا بلکہ اس نے بھیاک منظر کی فلم بند کی تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ مردہ جسموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا معمولی ٹرک پولیس سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ پولیس نے اسے شہر میں ہر طرح کی مصروفیت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ایک گھر کیمرہ میں تھا۔ اسے توقع تھی کہ ایک دن اس کی کہانی نہ صرف اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گی بلکہ اس کے لئے بڑے خوش حال اور دولت مند آدمی بھی بن جائے گا۔ اس کی کہانی کا آغاز نصف شب کے بعد سے صبح کے بجے تک ہونا ضروری تھا۔ اس وقت تمام ٹی وی اسٹیشنوں کے نیوز روم بند ہو جاتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ٹی وی والوں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے وہ ایسے ہی مناظر خود بھی فلم بند کر سکتے تھے۔ وہ ہر رات دعا کرتا کہ ٹی وی اسٹیشن سے متعلق ہر آدمی خواب خرگوش میں کھو جائے تاکہ وہ جو کچھ منظر عام پر لانا چاہتا ہے اس کی بھونک بھی کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔ وہ اس کام میں مسلسل جدوجہد کر رہا تھا اور اب اسے اپنے کام کے تمام شب و فراز کا علم ہو گیا تھا۔ ٹرک پر اپنی یادداشت پر ہنستا اور خوف ناک مناظر اس کے دماغ میں رقص کرتے رہتے تھے۔ ابھی یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنی چادر کے نیچے دبکا بیٹھ رہا تھا۔ رول

ناساز ہو گئی۔

اس چلے کے دوران وہ مستقل حویلی میں ہی رہ رہے تھے..... انہوں نے قاسم ماموں سے ڈیڑھ ماہ کی باقاعدہ چھٹی لے رکھی تھی۔

انہیں بخار نے آلیا تھا..... جو کہ تھا بھی زوروں پر..... اپنی طبیعت سے زیادہ انہیں اس بات کی فکر لاحق تھی کہ میرے چلے کا کیا ہوگا..... کیونکہ اس میں ایک دن کی بھی غیر حاضری ساری محنت پر پانی پھیر دیتی۔

کافی دن چلے وہ کہہ کر نیند سو رہے تھے..... میں آتے جاتے ان کا جسم چھوتا تو یوں لگتا جیسے میرا ہاتھ جل جائے گا۔

اس نئی صورت سے میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ شام ہوتے ہی میں ایک ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔

اس نے رحیم بابا کا باقاعدہ چیک اپ کیا، فوری طور پر ایک انجکشن لگانے کے بعد اس نے کچھ دوائیں دیں اور بولا۔

”کافی تیز بخار ہے، اور اس وقت اسی کی وجہ سے ان پر نیم بے ہوش طاری ہے..... خیر..... میں نے انہیں ڈوز دے دی ہے جلد ہی بخار ہلکا ہوگا اور پھر انہیں یہ دوا دینی ہے..... پھر مجھے بتانا..... اگر طبیعت بہتر ہو جائے تو مجھے کل پھر بلوالین..... کم از کم تین دن علاج کرانا ہوگا۔“

”جی بہتر.....“ میں نے سر ہلایا۔  
”..... اور جب یہ ہوش میں آجائیں تو انہیں کچھ کھلا کر دوائی دے دینا میں اب چلا ہوں۔“  
ڈاکٹر چلا گیا..... تو میں رحیم بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا..... تھوڑی دیر گزری تھی کہ رحیم بابا کے جسم میں حرکت ہوئی اور پھر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”تھکیل..... کیا وقت ہو گیا.....؟ ہمیں قبرستان جانا ہے.....“  
(جاری ہے)

کی..... آؤ۔“

میں نے انہیں کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے پورا جسم اکڑ کر رہ گیا ہو۔ ہڈیاں کڑکڑانے لگیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان باقی نہ رہی ہو..... میں پھر پورے جسم کی کوشش کے بعد انہیں کس کامیاب ہوا تھا۔

میں نے اپنی کیفیت رحیم بابا سے چھپائی تھی..... پھر ہم دونوں نے سامان سمینا اور قبرستان سے باہر نکل آئے۔

اتفاق سے آبادی میں داخل ہوتے ہی ایک درکشہ سامنے سے آنا دکھائی دیا۔

جلد ہی ہم حویلی کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ راستے میں رحیم بابا نے دھیمی آواز میں کہا۔

”تم نے کمال حویلی سے وظیفہ ختم کیا ہے.....“

آج تمہارا پہلا دن تھا..... میں جانتا ہوں کہ عورت کے تین کی آوازوں نے تمہارے وظیفے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی..... بس..... تم ایسی تمام چیزوں کی

طرف ہرگز دھیان مت دینا..... اسی میں تمہاری کامیابی ہے..... جیسے جیسے دن گزریں گے تو رکاوٹوں کے کئی پہاڑ تمہارے سامنے کھڑے ہوں گے..... تمہیں ان کو سر کرنا ہے۔“

”میں پھر پورے کوشش کروں گا رحیم بابا.....“ میں بھی آہستہ سے بولا۔

رحیم بابا نے امید بھرے انداز میں سر ہلادیا تھا۔ اور پھر دن آہستہ آہستہ گزرتے چلے گئے.....

میں اب اس قبرستان میں کافی حد تک نائوس ہو چکا تھا..... ایک بے حد طاقتور قسم کی دلیری تھی..... جو نہ جانے کہاں سے میرے اندر نمودار آئی تھی۔

اس دوران مجھے کئی طریقوں سے غافل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی..... ڈرا گیا..... دھمکا گیا..... لیکن رحیم بابا کے دست شفقت نے مجھے کسی بھی موقع پر گھبرانے اور کوئی چوک ہونے کا موقع نہیں دیا۔

وہ میری کامیابی کا آخری ہفتہ تھا..... اب میری منزل زدیاہ دور نہیں تھی کہ اچانک ہی رحیم بابا کی طبیعت



کرو۔ رول کرو۔ کمرہ سے متعلق افراد اس منظر پر ہر وقت نہیں پہنچتے تھے ایک حادثے کا منظر تھا اور اسے دوبارہ حقیقی انداز میں سامنے لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اس قسم کے حادثات کی اس کے ذہن میں کی نہیں تھی وہ بچپن میں بہت سے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس کے ذہن میں ایک مکمل کہانی تھی۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے اس کی اپنی تھی اور اس سے وہ منافع کمانے کی فکر میں تھا۔ وہ پوری قوت سے تہقیر مار کر نرس پڑا۔ اس کام میں مہارت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

وہ بے شرارت گزارنے کے بعد گھر جا رہا تھا کہ پولیس ریڈیو سے اسے ایک لاش کے متعلق معلوم ہوا لاشوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ ان کی فلم بندی میں صرف چند منٹ فلم کا زیاں ہوتا تھا۔ لیکن وہ اس حادثے کے مقام سے ایک میل دور تھا۔ اس لئے وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ”کیا مصیبت ہے۔“

وہ پہلی میٹرول کار سے پہلے اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔

اب وہ خوش دلی سے سیٹی بجاتا ہوا ہالی ووڈ کی طرف بارہا تھا۔ جب اس نے جینٹیل کے سامنے گاڑی روکی تو مارے جوش کے اس کی بری حالت تھی۔ اس نے اپنی پک اپ کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور گاڑی کی طرف دیکھ کر زندہ دلی سے چیخ پڑا لیکن۔ گاڑی کو شاید اس انداز سے کوئی دیکھی نہیں تھی وہ اس کی طرف سخت نگاہ سے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نمودار نہیں ہوئی تھی حالانکہ وہ اس سے پہلے بارہا مل چکے تھے اور اس طریقہ کار سے بھی وہ کئی بار گزر چکے تھے۔

”تمہیں کیا کام ہے؟“ گاڑی نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”نیوز روم کے لئے فلم لایا ہوں۔“ ٹریکر ہمیشہ یہی جواب دیتا تھا۔

”کس سے ملنا چاہتے ہو؟ مجھے اپنے رشتہ میں نام درج کرنا پڑتا ہے۔“

”واٹن کوسٹ“ انچارج نیوز ایڈیٹر۔

”وہ مجھ سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔“

”بہر حال میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“ ٹریکر نے کہا۔

زیادہ باز پرس کے بغیر گاڑی نے بڑی سرسری کے ساتھ اسے آگے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور سیدھا نیوز بلڈنگ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں پارکنگ ممنوع تھی۔ اس نے بڑی کابلی سے اسٹینرنگ کے نیچے دبا ہوا سیٹ نکالا اور کوسٹ سے ملاقات کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

انچارج نیوز ایڈیٹر اسے ایک نوکر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی۔ جیسے ہی اس نے ٹریکر کو دیکھا وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ وہ ٹریکر جیسے آدمی کو انتظار کی زحمت دے کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اس لئے یہ بات اس کی عادت میں شامل ہو گئی تھی۔

ٹریکر نے سگریٹ کا ایک کھرا کش لگایا اور دھوئیں کا بادبل سا اڑوایا۔ وہ جانتا تھا کہ نیوز ایڈیٹر تقریباً سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں جب سے ٹریکر نے فلم بندی کا کام شروع کیا تھا۔ اس نے ان طویل برسوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہر فلم خریدنے کو ایک ایسا مسئلہ بنا دیتے تھے کہ ٹریکر کو کسی خطرناک جنگ کا گمان ہوتا تھا۔

ٹریکر بولا۔ ”میرے پاس ایک اہم فلم ہے۔“

کوسٹ نے اشارہ کیا اور پھر ٹریکر کی طرف پشت کر کے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹریکر تھلا کر رہ گیا۔ پرانے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا اس جیسے آزادارہ کرکام کرنے والوں کی بہت مانگ تھی۔ ان دنوں رات کے وقت حادثات کی فلم بندی کرنے والوں کی کمی تھی اس لئے ٹریکر کو کسی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اب اس کے پاس ذیلی قلمہ تھا جن میں ساؤنڈ میں سے لے کر باقی ضروری آدھیوں تک سب ہی موجود تھے۔

پہلے تو لوگوں نے کبھی ہی وی نیوز کے متعلق سنا بھی نہیں تھا۔ سوائی میٹر کمرے کی کارکردگی کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ ان دنوں ٹریکر کی مانگ

تھی۔ رپورٹر اسے نام کے پہلے حصے سے پکارتے تھے اس کے لئے دوپہر کا کھانا خرید کر لانا ان کے معمول میں شامل تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر کھل کر ہنستے تھے جیسے صرف اسی طرح اس کی خوشنودی حاصل ہو سکتی تھی۔ نہ معلوم کب ان کا مستقبل ٹریکر کی فلم سے وابستہ ہو جائے۔

ٹریکر زیرب بڑبڑایا اور اس یونین کو کون سے لگا جس کی وجہ سے فی وی کے محکمے میں اس قدر انقلاب آ گیا تھا۔ آج کل تو وہ بہ مشکل پیٹ مہرنے کی حد تک کما رہا تھا۔ بوی کی ضرورتوں کو پورا کرنا تو محض خیال ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی لئے وہ بالکل تنہا کوئی اسے ایک عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا جس کا نام ٹریکر تھا۔ نیوز روم میں اسے برواشت کرنے کی صرف ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ ٹریکر رات کے ان لمحات میں حادثات کی فلم بندی کرتا تھا۔

بہت ساری کائنات ٹھہری تیرسوٹی ہوتی تھی۔ وہ اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ماضی واپس آ جائے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی لاڈل روشن کے ہنگاموں سے ہمکنار ہو جائے۔

کوسٹ نے فون بند کیا اور ٹریکر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے آج دن بھر کے لئے جن فلموں کی ضرورت تھی ان میں سے پہلے سے خرید چکا ہوں۔“

ٹریکر نے ایک نگاہ گلاس کی طرف ڈالی جہاں ایک درجن خروں کے نشانات موجود تھے وہ جانتا تھا کہ اس تعداد سے دو گنا زیادہ خبریں بھی آجائیں تو صرف ایک گھنٹے کا پروگرام مکمل ہو سکتا ہے۔

”اس وقت میں جو کچھ لے کر آیا ہوں تمہیں اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔“ ٹریکر نے کہا۔

”تمام لوگ یہی کہتے ہیں، پھر بھی بتاؤ کیا خاص ہے؟“

”یہ ایک قتل کی واردات ہے۔“ ٹریکر نے کہا۔

کوسٹ کی آنکھیں سرک گئیں لیکن اس نے لاش کی چمک ظاہر نہیں ہونے دی۔

”گا ایک کان سے دوسرے کان تک کاٹ

دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوف ناک باتیں بھی موجود ہیں۔“ ٹریکر نے کہا۔

کوسٹ نے ایک دروازے جھلکے سے کھولی اور فلم خریدنے کا فارم نکالا ہر ٹریکر کا نام پر کرنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

”اس کے علاوہ تمہارے کیا کچھ معلوم کیا ہے؟“

”شکار ایک ساٹھ سال کا بوڑھا آدمی تھا۔ مین اسٹریٹ پر واقع ایک کینے کی عقی کچی میں اس کی لاش دریافت کی گئی ہے۔“

”مین اسٹریٹ۔“ کوسٹ نے مداخلت کی۔

”آ خر وہ کون تھا؟ کیا کوئی بدعاش؟“

”شرابی۔۔۔۔۔۔ ٹریکر نے کہا۔

ایڈیٹر زیرب بڑبڑایا۔ ”اس دور میں ایک یا دو پیگ شراب پینا عام بات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی وحشیگی کی کیا بات ہے؟“

”میں وہ واحد آدمی ہوں جس کے پاس لاش کی فلم موجود ہے۔“

کوسٹ نے غیر دلچسپی کا اظہار کرنے کے لئے انکار میں گردن ہلائی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔“

”حادثے کے بعد میں واحد کمرہ مین تھا جہاں جگہ موجود تھا۔ میرا کام ختم ہوا تو پولیس نے لاش اٹھوا دی تھی میرا خیال ہے اس وقت کا روم لاش پر کام کر رہا ہوگا۔ اس طرح کسی اور فلم کا ہر امکان از خود ختم ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تمہاری فلم کو دیکھیں گے۔“

ٹریکر نے انتہاء میں سر ہلا دیا وہ جانتا تھا کہ آدمی جنگ ختم ہو گئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جب فلم کو تکنیکی مراحل سے گزارنے کے لئے منظور کر لیا جاتا ہے تو عموماً وہ فلم خرید لی جاتی ہے ورنہ اس قدر دوسری مول لینے سے کیا فائدہ؟

”ادا کی کیا ہوگی؟۔۔۔۔۔۔“ ٹریکر نے سوال کیا۔

”مگر ہم نے اسے قابل استعمال سمجھا تو حسب معمول 75 ڈالر کی ادائیگی ممکن ہے۔“

”یہ ایک اہم فلم ہے۔ اس کی قیمت بھی زیادہ ہونی

چاہئے۔

”رات بھر کے کام کا معاوضہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے میرا خیال ہے میں نے پہلے ہی زیادہ پیش کش کر دی ہے۔“ ایڈیٹر نے روکھائی سے کہا۔

”گویا اگر میں ایک ہفتے میں ایسی فلم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میری ضرورتوں کے لئے کافی ہوگی۔“ ٹریکرنے تلخ لہجے میں کہا۔

گوسٹ نے لاپرواہی سے کندھے جھٹک دیئے۔ ”قل کی وارداتوں کا صاف مطلب ہے ڈیجر سارا خون۔ رات کے کھانے پر دکھائے جانے والے پروگرام میں ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا منظر دیکھ کر ہمارا پروگرام دیکھنے والے اپنی ہجوک ہی کھو بیٹھیں۔“

”میں اپنے کام میں محتاط ہوں۔“ ٹریکرنے کہا۔

”میں نے ان زاویوں سے فلم بندی کی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ گوسٹ نے ڈرامائی انداز میں اپنے ڈیسک آئیگر پر ہاتھ مارتا کہ ٹریکرنے بھی صورت حال سے آگاہ ہے۔ ایڈیٹر کا دوسرا حربہ تھا۔ جس سے وہ ٹریکرنے جیسے کسمپوش مینوں پر قابو پالیتا تھا۔ بعض اوقات پولیس والے اس واردات کی کہانی کو انتہائی بے زار کن بنا دیتے تھے اس لئے فلم کا تاثر بھی کم ہو جاتا تھا۔

لیکن اس بار جاسوس غیر متوقع طور پر باتونی ثابت ہوا۔ ”یہ ٹریکرنے تو خون آشام ہے۔ اس نے لاش کے معاملے میں ہم سے بھی اولیت حاصل کر لی۔ کیا ہم اس وقت آئیگر پر ہیں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ ایڈیٹر نے کہا۔

”تجربہ کار ٹریکرنے بھی تمہارے پاس ہی موجود ہے؟“ ایڈیٹر کے مطلق سے بے معنی آواز نکلی جو غراہٹ سے مشابہ تھی۔

”اس سے کہو کہ فلم کا بخور شاہدہ کرے۔ اس بار ایک عجیب قاتل ہے سے پالا پڑا ہے۔ اس نے لاش پر کچھ اس قدر کام دکھایا ہے کہ ہم تفصیلات کو زیادہ پھیلانا

نہیں چاہتے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔“ جاسوس کی آواز سنا دی۔

”ہم اسے احتیاط سے پیش کریں گے۔“ گوسٹ نے وعدہ کیا۔

”کیا تم اس واردات کے بارے میں کوئی سرکاری بات بتا سکتے ہو۔“

”ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال شناخت بھی عمل میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ آٹھ ایک ریزر تھا لیکن تمہیں کاروبار کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے کوئی بات نشر نہ کرنا۔“

”چونکہ ہم اس واردات کے بارے میں کوئی خیالی بات نہیں کہہ سکتے اس لئے فلم کی قیمت 75 لاکھ سے زیادہ ہونی چاہئے۔“ ٹریکرنے شکایت کی۔

”اب پرانے وقتوں کی جیسی بات نہیں ہے، کیا تمہیں کینڈی کی وہ کہانی یاد ہے جس نے میلی بیوی میں جنم لیا تھا؟“

”وہ بات دوبارہ منظر عام پر نہیں آ سکتی۔“ ٹریکرنے آکھیں جھپٹے لگیں۔ ”یہ 2006 کا واقعہ ہے۔ ممکن ہے 2007 میں پیش آیا ہو۔ ان دنوں کینڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گاڑی چلا رہا تھا کہ چانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چند لمحے سمندر کی جھاگ میں جہل قدی کر کے محفوظ ہو۔ اس وقت صرف ایک کسمپوش مین وہاں اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے فلم بندی کی اور بعد میں اسی فلم کا اسے ایک ہزار لاکھ معاوضہ ملا تھا۔“

”وہ ایک اتفاق تھا۔“ گوسٹ نے کہا۔

”اب ایسا اتفاق دوبارہ کبھی پیش نہیں آ سکتا۔ اب اسٹیشن بہت بڑے ہو گئے ہیں۔ اور فلم کا عملہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔“

”تمہیں۔“ ٹریکرنے احتجاج کیا۔

”اب بھی میرے پیشے کے لوگ کوئی اہم کہانی منظر عام پر لاسکتے ہیں۔“ گوسٹ تہمتہ مار کر ٹپس پڑا۔

ایک ہفتے بعد ایک اور لاش پائی گئی۔ اس لاش کا گلا بھی بری طرح کاٹ دیا گیا تھا اور اس منظر کی فلم بندی میں

بھی ٹریکرنے پر سبقت لے لیا گیا تھا جیل نے اسے اس فلم کی ایک سو لاکھ کی پیشکش کی تھی۔

ناگنر اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرشتی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی پر سرشتی ٹریکرنے کے لئے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لئے بہر حال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خبر اب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

جب تیسری لاش دریافت ہوئی تو ٹریکرنے ایک ہم پیشہ کسمپوش کسٹما ملا۔ اس بار اگرچہ فلم زیادہ اہم نہیں تھی لیکن ایڈیٹر پر بھروسہ ڈال دینے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے جیل سوڈے بازی پر آمادہ ہیں۔

ٹریکرنے ایک اہم کسمپوش مین بن چکا تھا۔ اس نے مقابلے کی کبھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے کے ساتھ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ قاتل کی اگلی واردات اس کے لئے چادری کسری کا حامل ہوگی۔ ایک ایسا چادری عدد جو اس کے لئے خوش قسمتی کا مظہر ہوگا۔ ایک ایسی واردات جس کے ذریعے وہ بہت زیادہ کمائے گا۔ ممکن ہے اس واردات کی فلم کینڈی کی کہانی سے بھی سبقت لے جائے۔ اس نے یہ بات دل کی گہرائیوں سے محسوس کی تھی۔ خلاف توقع صورت حال بگڑ گئی۔ ٹی وی اسٹیشن نے پولیس سے ساز باز کر لی۔ ان کے درمیان ایک معاہدے نے جنم لیا۔ پولیس اس معاہدے کے مطابق بیمار دست ٹی وی کے عمل کو ترجیح دے گی۔

”بہر حال۔۔۔۔۔“ گوسٹ نے ٹریکرنے کہا۔

”زیادہ قاتل روزانہ ہی وارداتیں نہیں کرتے۔

اس کے علاوہ تم آزاد کسمپوش مین نہیں لوگوں کے تاثرات اراہم نہیں کر سکتے۔ اس حادثے کے دوران بعد میں کاشانیوں کی آوازیں بھی فلم کے ساتھ موجود ہوں تو فحشی عناصر میں حقیقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے مجھے انہوں نے ہرگز کم نہ سودے بازی کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اب

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔“ ایڈیٹر غرایا۔

ٹریکرنے دل میں سوچا اور پیشانی پر سلوش ڈال کر ایڈیٹر کو گھورنے لگا۔ اس بات سے بھی اسے جتنی سکون حاصل نہ ہو سکا۔ وہ بچپن برس کا ایک پیشہ ور پورٹ تھا اس عمر میں عموماً دوسرے لوگ ریٹائر ہوئے کا منصوبہ بناتے ہیں جبکہ وہ ایک دیوانے قاتل اور اس کے شکار کا ستلائی رہتا تھا۔

”مجھے مددگار رپورٹر بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ ٹریکرنے سوچا نہ سمجھے میں کہا۔

”تم جانتے ہو کہ کبھی تم ہی تمہارا عملہ بھی ناکام ہو سکتا ہے۔“

کشتادہ آنکھوں سے ایڈیٹر نے اسے گھورا۔

”تم۔۔۔۔۔؟“ ٹریکرنے۔۔۔۔۔ اگر میرا ایک عملہ ناکام

رہتا ہے تو میرے پاس ان کی مدد کے لئے دوسرے آدمیوں کی کئی فیکٹس ہیں اور پھر تم یونین کے ساتھ وابستہ بھی نہیں ہو۔ جب وہ نیو زروم سے باہر نکلا تو اس کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹی وی کے محلے کو ہر حال میں نچا دکھائے گا۔

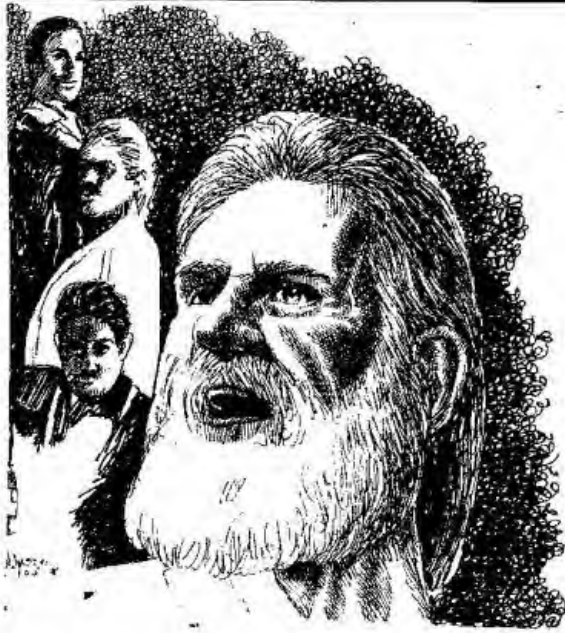
وہ تھا کہ اس کا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری سلوشیں تھیں۔ اور وہ غور کر رہا تھا کہ رات شروع ہونے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے۔ کئی بیزار کن گھنٹے گزارنے کے بعد کھیل کام کا وقت شروع ہوگا۔ ایسے میں گھر جانے سے کیا فائدہ؟ صورت حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ پیشہ ور رپورٹوں کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ٹریکرنے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔

”میں بھی ان شریہوں کی طرح آوارہ گرد ہو گیا ہوں۔“ وہ زریب بڑبڑایا۔

”بہر حال اب مجھے کسی نئے انداز سے کام شروع کرنا پڑے گا۔“ اس نے شہر کی طرف اپنی گاڑی پوری رفتار سے اڑانی شروع کر دی۔

اگلے روز صبح چارن کر تیں منٹ پر اس نے گوسٹ کے گھر فون کیا۔

”تمہیں میرے گھر کا نمبر کہاں سے ملا ہے؟“



## آخری وقت

مہر پر وزیر احمد دولو۔ میاں چنوں

رات کے اندھیرے میں نشہ آور اشیاء کھلا کر خاتون کو مدھوش کیا گیا اور پھر اس کے بعد خاتون کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اندھیرے کا ہر سوراج تھا کہ اچانک ظلم کی دیوار گر گئی اس کے بعد.....

اچھائی بھلائی اور نیکی کبھی بھی رانیکاں نہیں جاتی..... حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

چن پہاڑوں کے درمیان وادی میں انہوں نے جنم لیا تھا وہ ان کی سوچ و فکر سے بھی بلند تھے۔ پورے علاقے کے لوگ دین کا علم حاصل کر کے دینی اور دنیاوی آسائش کو حاصل کرتے تھے۔ شعور کی حدود میں قدم رکھتے ہی ان کو گاؤں سے دور حصول علم کے لئے مدرسے میں داخل کروا دیا گیا۔

ابراہیم شاہ شروع سے ہی سختی تھا جبکہ باقر شاہ کو چن پہاڑوں کے کشتے میں کسا گیا تو وہ بہت کمسایا لیکن مقدر میں لکھی پابندیاں ختم نہ ہو سکیں۔

دلوں بھائیوں کے لئے دیگر رشتے داروں کی طرح دینی تعلیم لازمی قرار دی گئی، اس کے صدر نے ان پر روزی کے دروازے ہوتے تھے، پورا گاؤں عالموں اور حافظ قرآن پر مشتمل تھا۔

یہاں کے بڑے لکھے نوجوان ملک کے طول و

”اس بات کو چھوڑو۔“ ٹیکر نے کہا۔  
 ”میں ایک فیصلہ چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت۔“  
 ”کیا کوئی نئی واردات ہوئی ہے؟“  
 ”تم ایک دوپہرے قتل کی فلم کا کیا معاوضہ دو گے۔“  
 ”دوستوں جن کے گلے کئے ہوئے ہیں؟“  
 ”تم جانتے ہو کہ میرا عمل کام کر رہا ہے۔“  
 ”دوہر قتل اور قاتل سے مخصوص انٹرویو؟“  
 ”ہیں..... کیا کہا انٹرویو کیا تمہیں یقین ہے؟“  
 ”میں دوہر معاوضہ چاہتا ہوں۔“ ٹیکر نے کہا۔  
 ”کیڈی کی فلم کا دو گنا معاوضہ.....“  
 ”گوسٹ کی طرف سے جواباً ایک غراہٹ سنائی دی۔“ میں اتنا بڑا فیصلہ ذاتی طور پر نہیں کر سکتا۔“  
 ”گوسٹ نے کہا۔“  
 ”مجھے انتظامیہ سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔“  
 ”میں صرف پانچ منٹ انتظار کر سکتا ہوں۔“  
 ”تمہارا نمبر کیا ہے؟“  
 ”ٹیکر نے فون کا نمبر دیکھا اور گوسٹ کو بتا دیا۔  
 ٹھیک چار منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور  
 ”گوسٹ کی آواز سنائی دی۔“  
 ”ایک ہزار بہت بڑی قیمت ہے ہم اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔“  
 ”میں اس سے زیادہ مانگا سکتا ہوں۔“  
 ان کے درمیان سودے بازی شروع ہو گئی۔  
 بلا خرابی بیڑے کہا۔  
 ”بارہ سو سے زیادہ نہیں۔ یہ انتہائی معاوضہ ہے۔“  
 ”ٹیکر مسکرایا۔“ بارہ سو کا معاوضہ اسے وقت کا سب سے ہرگز پورے پڑا دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ کئی وی نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم ادا نہیں کی۔“ اس نے گوسٹ کو ایڈریس دیا اور کہا۔  
 ”تمہارا عمل وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟“  
 ”چندہ منٹ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ مجھے منظور ہے۔“ ٹیکر نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا، وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور





عرض میں دینی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ان دنوں بھائیوں پر بھی بزرگوں کی پیروی لازمی قرار دی گئی۔ امیر شاہ نے محنت اور ایماندار سے تعلیم حاصل کی اور دور کے ایک گاؤں میں جا بسا، جہاں امامت کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ بھی شروع کر دی۔ باقر شاہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا، لیکن اسے بھی ایک گاؤں میں امامت مل گئی۔

انسان اور خاص کر مسلمان بڑے ہی اہل پسند، جلد باز اور بغیر محنت کے منزل کے حصول کے خواہاں ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق سب سے زیادہ موہاں فون پاکستان اور بھارت میں استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ یورپی ممالک میں اس کا استعمال بہت کم ہے۔ وہ اس لئے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کے جس فرمان پر ہم پاکستانیوں نے عمل کرنا تھا کہ ”کام، کام اور کام اس فرمان پر انگریز کاربند ہیں۔“ فضول سرگرمیوں کے بجائے وہ کام، کام اور کام کرتے ہیں۔

یہ ان کا احسان ہے کہ آئے روز کی ایجادات سے مہینوں کا کام گھنٹوں میں دنوں کا سفر گھنٹوں میں ہو رہا ہے۔

کپڑے سینے والی سوئی سے لے کر جہاز تک ایجاد ہو چکے ہیں۔ لیکن انہوں ہمارے سربراہ بڑے فخر سے بیانات دیتے ہیں کہ ہم تیسری دنیا کے ممالک میں شامل ہیں۔ پاکستانی قوم کام کرنا تو ہیں اور جبری مشقت سمجھتی ہے۔

شہروں سے لے کر ٹاؤن، ہستی، گاؤں، ڈیرے، محلے، قصبے تک فارغ لوگوں کی فوج ظفر موج نظر آتی ہے۔ چوک، بازار اور دیکھو، رکشوں کے اشاہوں پر چائے کے ہٹوں، پلیئر ڈسکے پھٹوں پر نو جوانوں کا جم غفیر نظر آتا ہے۔

فیکٹری، کارخانوں اور سرکاری وغیرہ سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے جیلوں، بہانوں، قلم چھوڑ چکیوں اور ہڑتالوں کے اسباب تلاش کر کے فارغ رہنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

ہماری خواہشات غریب کی دکھ بھری زندگی کی طوالت کی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ خوشحال زندگی کے حصول کے لئے کام کرنا سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ چور دروازے سے ترقی کے زینے طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بے شک محنت زیادہ کرنی پڑے، پیسے کا بے دریغ استعمال کرنا پڑے۔ اس کی پروا نہیں۔

☆.....☆.....☆

باقر شاہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے تو معصوم بچہ تھا۔ ایک خاتون سامنے آ گئی۔ ”حضرت صاحب! بچہ بہت روتا ہے، رو دھ نہیں پیتا، اسے دم کر دیں۔“

حضرت صاحب نے دم کیا جبکہ دیگر نمازیوں نے پچھلیں ماریں۔

اگلے دن جب حضرت صاحب نماز سے فارغ ہو کر نکلے تو کل والی عورت مٹھلی کا ڈبہ لئے سامنے آ گئی۔

”باباجی! آپ کے دم سے میرے بچے کو آرام آ گیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے یہ مٹھلی کا ڈبہ لائی ہوں، ڈبے کے ساتھ سو کاٹ بھی تصادیا۔“

جبکہ اس کے ساتھ آنی عورت بچے کو دم کروانے کے لئے باباجی کے سامنے لائی۔ دم کرنے سے وہ بچہ بھی ٹھیک ہو گیا اور ایک بار پھر مٹھلی کا ڈبہ اور سو کاٹ مل گیا۔ حضرت صاحب مسجد سے شعل گھر پہنچے تو چار، پانچ عورتیں وہاں موجود تھیں، جو مختلف امراض میں مبتلا ہو کر دم کروانے کے لئے آئی تھیں۔

حضرت صاحب پڑھ پڑھ کر پچھلیں مارنے لگے۔ جبکہ خواتین پچاس، سو کے ٹوٹوں کی صورت میں ہدیہ پیش کرتے لگیں۔

باباجی کے دم سے خواتین کو آرام آنے لگا، بچے خوشی سے قلقاریاں بھرنے لگے۔ اور بدلے میں نذرانے کی مد میں ٹوٹوں کی بارش ہونے لگی۔

آئے روز کی مجبور خواتین اور بچوں کے دل نے بابا جی کو باقاعدہ تحویف گنڈے پر مجبور کر دیا۔

ایک کمرے کو حجرے کا دھبہ دے کر اسے باقاعدہ آنے والے حاضرین کے لئے لے کر منتقل کر دیا۔

ہر آنے والے دن تحویف گنڈے سے شفا یابی کا عمل پانے والی خواتین میں اضافہ ہونے لگا۔

نذرانہ مانگنے کے بجائے کھی کا خالی کنٹر لے کر اسے چندہ بکس کا نام یا در حجرے کے درمیان رکھ دیا۔

ہر آنے والی خاتون اپنی حیثیت کے مطابق تحویف اور دم رو رو کر دوانے کے بعد حسب حیثیت کام کی اہمیت کے حساب سے نذرانہ ڈالے میں ڈالتی، باباجی نے خاص مرید اور مریدیاں بھی بنا لیں جو آنے والے نازنین کو جلد کام اور تحویف سے جلد اچھا اور زیادہ نتیجہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ نذرانہ دینے پر آمال کرتیں۔ جتنا زیادہ نذرانہ کام جلد ہونے کے لئے زیادہ چانس کے دعوے کئے جاتے۔

رات کو جب چندہ بکس کھول کر نذرانہ شمار کیا جاتا، ایسی چوڑی رقم برآمد ہوتی۔

عوام کو عید قائل اور آگاہ کرنے کے لئے باباجی نے بہت بڑا بیٹا نکھو لکھوا کر دروازے کے ساتھ دیوار پر لٹا کر دیا۔

”من چاہی مراد گھنٹوں میں پوری، بے لولاد عیارات بچوں کی قلعاریوں سے مملو ہوں، محبوب آدموں میں، دنوں میں لکھ پتی نہیں، پرانز بانڈ پر پہلا تمام پائیں۔“

جھوٹ بچ کا لہا چوڑا مضمون لکھ دیا جو پڑھنے والے کو بہت کرات خواتین پہلے ہی مرعوب تھیں۔ اب من لکھی مرضی کے نذرانے کے عوض لوگوں کی بہو، بیٹیوں کو ہوسہ کرنے لگے۔

چاہت کے پھول پھٹنے کے خواہش مند در پر ابھری دے کر تسکین کے غوطے کھانے لگے۔ باباجی سے ہر ایک کی دیوی سنبھالی مشکل ہو گئی۔

شہر سے پلاٹ لیا، گاؤں سے رتہ خرید، دھوم دھماکے سے شادی کی، کاروبار خوب چل نکلا۔ بات تحویفوں سے بھری مریدی تک جا پہنچی، بیہوش

کاروں کا جم غفیر صبح شام در پر حاضری دینے لگا۔ وقت کی دوڑ دھوپ میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ بن گئے۔

بڑا بیٹا نو جوانی کی عمر کو پہنچا تو اسے بھی اپنے نقش قدم پر چلانے کے لئے ساتھ بیٹھا کر آئے خواتین و حضرات کو بیوقوف بنانے کے گر سکھانے لگا، ساتھ ہی امام مسجد کے فراموش بھی سرانجام دینے لگا جبکہ چھوٹا بیٹا اسکول سے پڑھ کر کالج میں جا پہنچا۔

باقر شاہ اور بیٹوں کی شہرت نے دور دور تک لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ امیر شاہ بھی بھائی اور بیٹیوں کے کروت سے آگاہ تھا۔ وہ اکثر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا، لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرتا مگر اب وہ لوگ اس میدان میں بہت آگے نکل چکے تھے۔

وہ خود اکثر لوگوں کو ہدایت و رہنمائی سے بد اعمال سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا۔

باقر شاہ دولت کی گاڑی پر زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی بیوی چند دن پیارہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔

بیوی کے فوت ہوتے ہی اس کی امامت پر پابندی لگا دی گئی، بڑا بیٹا باقاعدہ امام بن گیا، جبکہ باقر شاہ اب گھر تک محدود ہو گیا، صرف تحویفوں کی کمائی سے گزارہ چلانے لگا۔

گاؤں والے لکھ سادہ سہی، لیکن انہوں نے ایک عقل مندی کا فیصلہ کیا کہ باقر شاہ کے تحویفوں اور امامت پر پابندی لگا دی۔

”باقر شاہ اگر تم کو امامت کرنی ہے اور تحویفوں کا وعدہ کرتا ہے تو شادی کرو، ورنہ ایک رتہ دے کے پاس ہم اپنی خواتین نہیں سمجھیں گے۔“

باباجی نے کاروبار بچانے کے لئے اور دولت کی بہتی ندی کے سامنے باندھا گیا، بند کرانے کے لئے ایک خاص مریدی سے شادی رچا کر ایک طرف تو مریدی کی پرانی خواہش پوری کر دی اور دوسری طرف گاؤں والوں کی

بولتی بند کر دی۔

شادی کرنے کی دیر تھی کہ مریوں اور سائین نے بارش کے دلوں کی طرح برسات شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

ابیر شاہ ایک انتہائی نیک، پارسا اور مبلغِ فطرت انسان تھا۔

خدا ترس، معصوم، مجبور لوگوں کا ہمدرد، غمگسار، دکھ درد کے صحرا میں ابرِ رحمت کی طرح برسنے لگا۔

جس مسجد میں امام تھا، مسجد کی آمدنی بڑھانے، اسے وسیع کرنے، حفظ و ناظرہ پڑھنے والے بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ساتھ ہی ایک مارکیٹ

بنادی۔ دکانیں کرائے پر اٹھا دیں، جن کے کرائے سے مسجد کے اخراجات پورے ہونے لگے۔ اس مارکیٹ میں نہ تو

کسی نانی کو شید کرنے کے لئے دکان دی گئی اور نہ ہی کسی ویڈیو بی ڈی کا کاروبار، گیت، نغمے، ڈرامے، فلمیں اور مجرا

وغیرہ کی ریکارڈنگ کرنے والے کو دکان کرائے پر دی گئی۔

ابیر شاہ کا بیٹا بھی باپ کی طرح صوم و صلوة کا پابند، انتہائی نیک اور پارسا تھا۔ ابیر شاہ اکثر ملک کے طول

و عرض تبلیغ کے سلسلے میں سفر کرتا۔

رشد و ہدایت سے لوگوں کی بھلائی کا فریضہ سر انجام دیتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کر کے

لوگوں کو نیکی طرف مائل کرتا جبکہ گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتا۔

مقامی شریک، چور، ایچے، بگڑے نوجوان، نشی اور اوباش نوجوان ابیر شاہ سے نفرت کرتے۔ جب وہ

تبلیغ کے سلسلے میں دورے پر چلے جاتے تو یہ لوگ سکھ کا سانس لیتے۔

اب کی بار جب شاہ کی تبلیغ پر جانے لگے تو مسجد کی مارکیٹ کے دکاندار بھی تیار ہو گئے۔ ان کے روانہ ہوتے

ہی مارکیٹ کی دکانوں کو تالے لگ گئے۔ یہ اطلاع جب اوباش نوجوانوں کو ملی تو وہ خوشی سے

جھوم اٹھے، نشے کے لئے روپوں کی آمد کا سلسلہ چلنے کا امکان پیدا ہو گیا۔

پروگرام کے مطابق چند نوجوانوں نے آدمی رات کے وقت مارکیٹ کا رخ کیا۔

تالا توڑنے کے لوازم، ہتھوڑے، سریے وغیرہ سنبھالے جب قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر دکان کے

سامنے ایک سفید لباس اور پگڑی باندھے بزرگ کھڑا ہے، جس کے ہاتھ میں بڑی لمبی لاشی ہے۔ وہ ذکر اللہ کرنے

کے ساتھ پھر دسے ہا ہے۔ ان لوگوں نے کافی دیر ان کے جانے کا انتظار کیا،

مگر بے سود۔ صبح جب مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی تو یہ لوگ

ناکام گھروں کو لوٹے۔ اس ناکامی کے بعد ایک بزرگ کی ہمیش تھی جس

کو چارہ اس کی بیوی ذاتی تھی جبکہ شاہ جی کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔

ان نوجوانوں نے وہ ہمیش رات کو چوری سے کھولی، ڈالے میں ڈال کر دور ایک ساجھی کے گھر چھوڑ

آئے۔ اس دوست نے ہمیش بیچنے کی بہت کوشش کی لیکن جرائم پیشہ لوگ تھے اس لئے کوئی بھی بیوپاری

خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ”چلے“ چالیس دن پورے ہونے میں دو دن باقی

تھے کہ ایک بیوپاری ہمیش خریدنے آیا۔ ہمیش کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”یہ تو فلاں بزرگ کی ہمیش ہے جو ابیر شاہ کے ساتھ تبلیغ پر گیا ہوا ہے۔“ اتنا سننا تھا کہ وہ شخص سخت

پریشان ہو گیا۔ بیوپاری کے روانہ ہوتے ہی ہمیش لانے والوں

سے رابطہ کیا، وہ لوگ آ کے ہمیش کو اپس گاؤں لا کر متعلقہ بزرگ کے دروازے پر چھوڑ کر دو بجکر ہو گئے۔

صبح جب وہ بزرگ گھر پہنچے تو ہمیش کو دروازے پر کھڑے پایا۔

☆.....☆.....☆

باقر شاہ کی بیوی جب باقاعدہ زوجیت میں آئی تو اس کے تئیں بدل گئے۔ پہلے تو وہ اچھے پاؤں چوستے نہ تھے

اب پاؤں کی دھول کو بھی روپوں کے عوض بیچتی، اور شان کرتے ہوئے زمین آسمان کے قلابے بھلا دیتی۔

گھر کی مالک بننے ہی باقر شاہ کا چہرہ اور کردار سکر دہ آنے لگا۔ گھر پر حق جتانے لگی۔ نذرانے کا ڈبر سرشام

آجاتی اور اپنے کمرے میں روپوں کو گڈیوں میں بستی۔ جبکہ باقر شاہ کو روپوں کا نشہ ہو گیا تھا۔ جب تک

کلوٹوں کی گڈیاں بند لکھتا سے نیند نہ آتی۔ شام کو نذرانے کا ڈبر اٹھانے پر میاں بیوی میں

جھگڑا شروع ہوا۔ جو دونوں کو الگ الگ حرم کے زندان قید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

میاں بیوی کو ایک دوسرے سے سخت نفرت ہو گئی۔ سالک کروں میں سوئے اور ساری رات ایک دوسرے

الٹا لٹکانے کے منصوبے بناتے۔ باقر شاہ کے چھوٹے بیٹے نے کالج پہنچنے ہی پر

سکالے لئے شروع کر دیے۔ روپے پیسے کی ریل ریل نے اسے بگاڑنے میں

کامیاب کر دیا۔ پہلے تو سکرٹ پٹنے کا عادی بنا۔ پھر جس بھر کر پینا

عمر کر دیا اور آخر کار وہ ہیر وئن پٹنے لگا۔ کافی عرصہ تو خرید کر دوستوں کو بھی پلاتا اور خد

کھاتا پیتا نوجوان دیکھتے ہوئے سپلاز سے بھی ہانپتے پر آمادہ کرنے لگا۔ چھوٹے شاہ جی نے اب

میں باقاعدہ ہیر وئن پہنچنا شروع کر دی۔ بیٹی میٹرک میں تھی کہ ایک ساجھی سے عشق کا پتیا

پائی اور ایک دن اسکول گئی اور وہیں سے آشا کے ساتھ گئی اور پھر واپس گھر نہ آئی۔

کالج میں ہیر وئن کے چرچے ہونے لگے، کئی بار شاہ کے بعد آخر کار چھوٹے شاہ جی کو ہیر وئن سمیت

لا کر لیا گیا، دو کلو ہیر وئن برآمد ہوئی۔ دفعہ 9-C کے ایک آئی کار کاٹی گئی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے گئے

اور میں آزادی گئیں مگر پولیس نے اس سے نہ ہوئی۔

☆.....☆.....☆

ٹاکسٹوں، جیکمول، ماہرین طب کی ہدایات لکھی گئی مفید کتاب

## دل کی بیماریاں

قیمت: 100 روپے

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی سختی و ہائی بلڈ

پریشر، غذائی تبدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی

تلخیاں اور ہارٹ ایک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، دل کا دورہ زندگی بچانے،

خواتین میں ہارٹ ایک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں بچوں میں دل

کی بیماریاں، بائی پاس سرجری اور فرائیڈ چکن، امیر جنسی تدابیر، صحت مند دل کے لئے

دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن

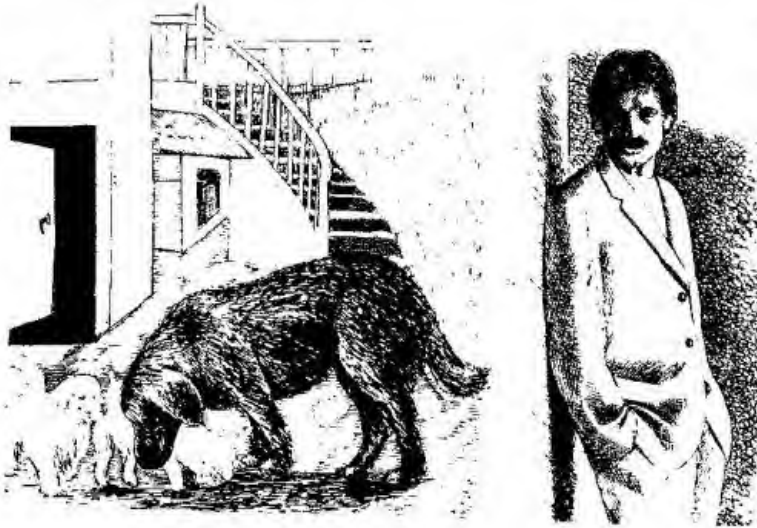
بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے غلاف کی سوچن، دم غلاف

القلب بیماری کا رڈائیس، دل کی سوچن، دم قلب، دل کی عضلہ کی سوچن کا رڈائیس۔ اور

بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں جاننے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

دعابک کارنر 5 فیصل آباد



## شیطان کی روح

فلک زاہد - لاہور

خونی عفریت نے اچانک نوجوان پر حملہ آور ہو کر نوجوان کو بے بس کر کے اس کے نرخرے کو بہنبھوڑ ڈالا اور بہتا ہوا خون بڑی رغبت سے پینے لگا اور پھر.....

حقیقت سے چشم پوشی کرنے والا..... نہ مگر کا رہتا ہے..... نگاہات کا سبق آموز کہانی

بچھلنے کے باعث اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی اسے اسپتال لے جانے کی بھی نوبت نہ آ سکی تھی۔

میں گھنٹوں اس کا سراپائی گود میں رکھے دھواں دھار رو رہا تھا۔ ہم دونوں کی شادی محبت کی تھی، ہماری شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مجھے یوں چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔ یہ سانحہ

مارچ میری بیوی کا نام تھا جس سے میں محبت کرتا تھا۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے ہمیں کچھ ضروری اشیا کی خریداری کے لئے قریبی دکان گیا تھا مگر میرے واپس آنے تک میری کل ایک اجڑ چکی تھی۔ میری پیاری بیوی، میری محبت، میری جیوں سے پھسل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے

ہمیشہ میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میری جیوں سے

قبرستان میں دفن کرنا، کبھی اینٹوں کی قبر بنانا، کوئی کتبہ بنانا نہ رکھنا، تمام گاؤں کے لوگوں کو میرے حق میں دعا کے لئے کہنا۔ میرے بعد گاؤں کا پیر بننے کے بجائے ان کا خادم اور دین کا اولیٰ خدمت گزار بن کر لوگوں کی خدمت کرنا، رزق کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنا، تعویذ گنڈے کو روزی کا ذریعہ نہ بنانا۔

باباجی جب نصیحت کا قرض اتار چکے تو صاف آسمان سے نلک نلک ہوندا باندی ہونے لگی۔

بارش سے بچنے کے لئے جب بیٹا باپ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ دم بھگم کے دوران غسل اور جنازہ کروایا گیا۔

دفن کے وقت ہوندا باندی خراج عقیدت پیش کرنے لگی۔

جب لوگوں نے ثواب کی غرض سے قبر پر مٹی ڈالنی شروع کی تو ماحول یوں ہو گیا جیسے چینی کے پھولوں کی خوشبو کی بارش ہو رہی ہو۔

پورا قبرستان خوشبو سے مہک اٹھا۔ جن لوگوں نے مٹی ڈالی ان کے ہاتھ یوں معطر ہو گئے جیسے گلاب کے عرق سے دھوئے ہوں۔ قبر پر موجود ہر شخص خوشبو کے سحر میں مدھوش ہو گیا، وہ لوگ معطر فضاؤں کے باسی لگنے لگے۔ دفن سے فارغ ہوتے ہی ہوندا باندی ہتھم گئی، سورج چاند کی طرح دھیمی روشنی سے منور ہونے لگا۔ لوگ باباجی کی وفات سے غمگین اور قبر کے استقبال پر خوش تھے۔

آج وہ گاؤں مثالی ہے، وہاں کے بڑے لکھے نوجوان، بچ اور گورنر کے عہدے تک پہنچے ہوئے ہیں۔ خوب صورت، خوشحال گاؤں کے ہر گھر میں درجہ چہارم سے لے کر سیکرٹری تک کے عہدے آفیسر پائے جاتے ہیں۔ باباجی کے نسل کے لوگ آج بھی دین کی شمع جلا کر اندھیری راہوں کو روشن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔



میاں بیوی کے تعلقات خراب سے خراب ہوتے گئے۔

آخر تک آ کر باقر شاہ نے بڑے بیٹے سے مشورہ کر کے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ”بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی جیل میں بند ہے، بہن منہ کالا کر کے چلی گئی، میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اگر مر گیا تو زری رقبہ، شہر کا پلاٹ اور دیگر جائیداد کا بٹوارہ ہوگا۔ تمہاری سوتیلی ماں کو بھی حصہ ملے گا۔

حالانکہ وہ ایک فاحش بیوہ خاتون تھی، لوگوں سے اس کے معاشرے چلتے تھے، جالاک عورت تھی مجھے پھانسنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور آخر کار گھر کی مالک بن گئی۔

میں نہیں چاہتا ہماری خون پسینے کی کمائی اس بدکردار عورت کو ملے، جس کے ساتھ میرا سوائے بیوی کے کوئی خونی رشتہ نہیں۔

حریس باپ کے حریس بننے کو بات سمجھا گئی۔ ایک دن رات کو نشہ آور اشیا کھلا کر اس خاتون کو مدھوش کیا گیا اور پھر اس دوران اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہمسائے والے اکوڑ بھگڑے کے دوران ثالث کا کردار ادا کرتے تھے، قتل کی خبر محلوں میں پھیل گئی۔

ہمسایوں کی گواہی پر باقر شاہ اور بیٹے کو اقدام قتل میں گرفتار کر لیا گیا۔ مرحوم کے گھر والوں نے کسی کی پیروی کی، باقر شاہ کو عمر قید اور بیٹے کو سزائے موت سنائی گئی۔

جس دن قاتل بیٹے کو سزائے موت ہوئی، اس کے ایک ہفتے بعد غشیات فروش بیٹے کو سزائے موت دی گئی۔

جیل میں بیٹوں کی سزائے موت کی اطلاع ملی تو دل کا دورہ پڑنے پر باقر شاہ بھی زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔

☆.....☆.....☆

ابرار شاہ ولی اللہ تھے، ان کے زیر تربیت نوجوان، بچ اور گورنر کے عہدے تک پہنچے، جب آخری وقت قریب آیا تو بیٹے کو بلایا۔

”میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میری موت کے بعد بارش ہوگی، بارش میں میرا جنازہ اٹھانا، اسی گاؤں کے



میرے لئے کسی موت کے پروانے سے کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میرا اس دنیا میں تھا ہی کون۔ وہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ جن لوگوں کو مارچ کی موت کی اطلاع ملی وہ تیزی سے لئے آنے لگے۔ مارچ کی تدفین میرے جانے والوں نے ہی کی ورنہ میں اس حالت میں کہاں تھا۔ میرے تو دل و دماغ نے دور دور تک اب بھی اس کی موت کو قبول کر لینے پر آمادہ نہیں تھے۔

بار بار اس کا ہنسا مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور میں پاگلوں کی طرح اسے "مارچ" "مارچ" کہہ کر نکلانے لگتا۔ ہم میاں پوی ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔

جس قدر مارچ کو میں چاہتا تھا اسی قدر وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔ ہماری محبت مثالی تھی کی دیکھنے والے عیش عیش کراٹھتے تھے لہذا اس کے یوں اچانک چلے جانے سے میرے دل و دماغ کو شدید دھچکا لگا تھا۔ میرا خود پر کوئی اختیار نہ رہا تھا۔ میں دن بدن جنونی اور ذہنی مریض ہوتا جا رہا تھا۔

مارچ کو جب میری نظروں کے سامنے قبر میں اتارا جا رہا تھا تو میں اس کے جسد خاکی سے لپٹ کر چیخنے چلانے لگا تھا۔ بڑی مشکلوں سے مجھے میرے دوستوں نے سنبھالا اور مارچ کی آخری رسومات بھی ادا کر دی گئیں۔ کافی دن گھر پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا جو سب ہی میری دیکھ بھال کرتے رہے مگر مجھ پر آہستہ آہستہ سب ہی اپنی اپنی مصروفیات میں مصروف ہو گئے۔ اور میں اس بڑے سے گھر میں جسے میں نے اور مارچ نے اپنی محبت سے تعمیر کیا تھا بالکل اکیلا رہ گیا اب یہاں صرف میں اور میری تنہائی تھی بے شک میری نگاہوں کے سامنے مارچ کو قبر کے اندر اتارا گیا تھا اور میں ہر روز باقاعدگی سے اس کی قبر پر تازہ پھول چڑھا کر آتا تھا۔ اس کے باوجود میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ مارچ مجھے اتنی جلدی اکیلا کیسے چھوڑ کے جاسکتی ہے۔ ایک ہی تو خواب تھا میرا کہ میری مارچ

میرے پاس ہو اور ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا تھا۔

مارچ کے سوا میں کسی اور عورت کا خیال اپنے دل میں لایا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت تھی جسے میں نے دل و جان سے چاہا تھا اور اب بھی اسے ہی چاہتا تھا۔ لہذا مارچ کو دوبارہ حاصل کرنے کا جنون مجھ پر دن بدن سوار ہونے لگا۔ اب میں ہر پل ہر لمحہ بس یہی سوچتا رہتا تھا کہ میں کس طرح اپنی مارچ کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں۔

چنانچہ مارچ کی محبت میں اندھا ہو کر میں کسی طرح "بلیک میجک" کرنے والوں کے پاس جا پہنچا۔ کس طرح میں نے ان کے بتائے گئے طریقوں پر عمل کیا جو کہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں جانے کے بجائے صرف مطلب کی بات کر دوں گا۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ پورے چاند کی رات جس دن میں نے اپنے ہاتھوں سے مارچ کی قبر کو دھڑک اس کے تالوت کا ڈھلکا کھولا تھا۔ یہ سب میں نے نہایت احتیاط اور راز داری سے کیا تھا۔ چاند کی دھیمی روشنی میں جب میں نے اس کے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا تو چند ساعتوں کے لئے اس کی زندگی سے عاری چہرے کو دیکھتا ہی رہ گیا وہ گویا بہت گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھی اس کے چہرے سے بلا کا اطمینان جھلک رہا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اس پر بے حد پیار آیا اور میں سے اپنی ہانہوں میں اٹھا کر گھر چلا آیا۔

یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کاش..... کاش..... مجھ سے وہ غلطی نہ سرزد ہوتی ہوتی..... مجھے جو کچھ جیسے بھی کرنے کو کہا گیا تھا میں نے ان کے مطابق عمل کیا اور ٹھیک چند لمحوں بعد میری مارچ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا ہمارے خوشی کے میں کسی چھوٹے بچے کی طرح زور زور سے تالیاں بجاتا رہا۔ مجھے میرا کھویا ہوا کھلو تامل گیا ہو۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر مارچ کو گلے سے لگا لیا۔ مارچ کا جسم نہایت سرد اور سخت تھا۔

میرے جسم میں پہلی جیسی وہ حرارت اور زندگی مجھے نہیں نہ ہوئی جو میں پہلے بھی کیا کرتا تھا۔ مارچ کی کالی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ بڑی تھیں جن میں اس کی سفیدی معدوم ہو کر رہ گئی تھی۔ لہذا ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری کسی میری محبت مجھے واپس مل گئی تھی۔ جس کے لئے میں نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی اور پیسہ پانی کی طرح لپٹا تھا، تو اور مجھے کیا چاہئے تھا۔

میں مارچ کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا اور اسے دنیا والوں کی نظروں سے بچا کر رکھتا۔ آفس کے بات پر اور جب بھی مجھے کسی کام سے کسی دوست کے پاس یا پھر سامان کی خریداری کے لئے بازار تک جانا ہوتا تو مارچ کو گھر کے اندر لاک کر جاتا یا خطرے کے پیش میں میری عدم موجودگی میں مارچ کہیں باہر نہ چلی جائے۔ کوئی بڑی گھر کھلا دیکھ کر بے دھڑک اندر نہ چلا گئے۔ میں دیسے بھی بلا وجہ اسے اکیلا چھوڑنے سے باز رہتا اور اتنا سا وقت اس کے ہمراہ گزارتا۔

مارچ پہلے بے حد محبت کرنے والی نرم دل لڑکی تھی جو ہر وقت ہنسی مسکراتی کھلکھلاتی رہتی تھی مگر اب والی صبح کے زرد چہرے پر مسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی ویرانی تھی اور بے دھڑک چھائی تھی۔ میں ہمد وقت اسے خوش کرنے کی کوششوں کر رہا تھا مگر وہ خوش ہو کر نہ دیتی۔

ایک روز اچانک مارچ نے مجھ سے عجیب بات کر کے مجھے سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ کافی دیر اس کے احساسات سے عاری چہرے کو دیکھ کر میں ان نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ جہاں پہلی بار میں اس کے ہونٹوں پر زبردست مسکراہٹ دیکھی تھی۔ اب اس نے مجھ سے انسانی گوشت کھانے کی فرمائش کی۔

میں نے اس کی فرمائش کو مسترد کر دیا۔ اس نے میری بڑھک بڑھک میں سنسنی آمیز دوڑ لگائی۔ وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے انتہائی غور سے دیکھ رہی تھی۔ گویا مجھ سے میری محبت کا ثبوت مانگ رہی تھی۔

رہی ہو۔ تجھ نے کس طرح میں نے مارچ کو خوش کرنے کے لیے حافی بھری اور وہ خوشی سے منہ بھاڑ کر ہنسنے لگی۔ میں اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ ایک عرصے بعد میں نے اسے اس قدر ہنسنے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرے لئے یہ سب بہت عجیب و غریب تھا۔ یہ سب تو مجھ سے مائلوں نے بھی نہ کروایا تھا جو میں اب کرنے جا رہا تھا، تجھ نے کس طاقت کے زیر اثر آ کر میں ہاں کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شاید یہ میری مارچ سے شدید محبت ہی تھی جس میں اس کے لئے ہر وہ کچھ کرنے کو تیار رہتا تھا جو اس کے حسیلیوں پر مسکراہٹ بکھیر دے۔

میں نے مارچ سے ایسی فرمائش کرنے کی وجہ بھی نہ پوچھی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک طویل نیند سے جاگنے کے بعد شاید یہ سب اس کی ضرورت تھی۔ میں مارچ کو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ جب سے وہ مجھے دوبارہ ملی تھی وہ خوش نہیں تھی، چپ چپ سی رہتی تھی اور اسے خوش کرنے کے لئے ہی میں نے جبراً دل پر پتھر رکھ کر اس کام کی حافی بھری تھی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا مگر پھر بھی مارچ کے لئے میں نے یہ سب کرنے کی تھانی اور ایک روز اپنے ایک دوست کو بھانے سے گھر پر رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ وہ خوش خوش میرے ساتھ ہو گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مارچ کے بعد میں کتنا اکیلا ہو گیا ہوں۔ تنہائی مجھے کاٹی ہے۔

لہذا مجھے کسی سماجی کی ضرورت ہے اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنی محبت واپس حاصل کر لی ہے اور آج وہ اسی کی خوراک بننے میرے گھر مدعو ہے۔ میں مارچ کی محبت میں اتنا خوش غرض ہو جاؤں گا مجھے نہیں پتہ تھا۔ کھانے کے دوران وہ مجھ سے دوستانہ انداز میں کسی مذاق کی گپ شپ کرتا رہا اور میں بظاہر اس میں اس کا بھرپور ساتھ بھی دیتا رہا۔ مگر اندر ہی اندر کوئی ناہیدہ طاقت بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی "میں جو کرنے جا رہا ہوں وہ صحیح نہیں ہے غلط ہے انسانیت کا قتل ہے۔" یہ تمام آوازیں اس وقت دب کے رہ جاتیں

جب کمرے کے اندر کھڑی مارج کی طرف دیکھتا جو دروازے کی آڑ سے مجھے رحم طلب لگا ہوں گے مگر وہ یہی تھی۔ گویا یہ خود اک اس کے لئے ایسے ہی ضروری تھی جیسے زندہ انسان کے لئے سانس۔ اسے اپنی جانب یوں گھورتا یا کمرے میں میری درستی پر مارج کی محبت پر غالب آجاتی، آخر کو میں نے اسے بڑی مشکوں سے دوبارہ حاصل کیا تھا کیونکہ اس کے لئے یہ سب بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر نہیں کر سکتا تھا تو میری محبت پر رخصت تھی۔

لہذا اگر یہی میری محبت کا امتحان تھا تو مجھے اس امتحان پر پورا اترنا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک نئے عزم ایک نئے حوصلے کو محسوس کیا اور اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ مارج بے چینی سے کمرے کے اندر ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی جس بات کا مجھے اندازہ وقفے وقفے سے ابھرنے والی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ جب وہ اپنا ہاتھ بے صبری سے دروازے پر مار رہی تھی گویا اپنی بے بسی کا مظاہرہ کر رہی تھی کیونکہ میں نے اسے بہت زور دے کر اپنے دوست کے سامنے آنے سے منع کر رکھا تھا اور اب ایک طویل انتظار اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا وہ میرے اشارے کی منتظر تھی۔ میرے دوست نے ابھرنے والی ان آوازوں پر زیادہ غور نہ کیا کیونکہ میں نے اسے سمجھا رکھا تھا کہ گھر پرانا ہے۔ لہذا کوئی چوہا بھی گزرے تو کڑیوں کے چرمانے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ میرا بے حد پرانا دوست تھا۔ میری بات پر یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کے ذہن کے کسی کوئے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں اس کے اور میرے علاوہ بھی کوئی تیسرا تھا اور وہ کوئی اور نہیں مارج تھی۔

کھانے کے بعد میں نے دوست کے سامنے دو پیگ رکھے جنہیں وہ غٹا غٹا حلق سے اتارنے لگا۔ گلاس خالی ہونے کے بعد میں نے اسے دو پیگ مزید پلائے جس کی بدولت وہ جلد ہی نشے میں دھت ہو گیا اور اول فول کینے لگا۔ میں نے پیگ کا ایک گلاس بھی نہیں پیا تھا۔ لہذا مجھے نشہ نہیں تھا۔ کچھ ہی محول بعد میرا دوست نشے میں ڈوبا زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ اور

میں نے آگے بڑھ کر مارج کو کمرے سے باہر آنے کی اجازت دے دی جو نہانے کب سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ میرے اجازت دینے پر اس کے چہرے پر خوشی کی طویل مسکراہٹ رقص کر گئی جس نے میرے جسم و جاں میں نئی زندگی دوڑا دی، اس مسکراہٹ کے لئے ہی تو میں نے یہ سب کیا تھا اور ایسی مسکراہٹ کے لئے میں ایسی ہی کئی زندگیوں کی قربانی دے سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے مارج کو اپنا کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے ہی وہ کمرے سے باہر آ گئی اور میں ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ مارج نے اپنا منہ اس کے زخروں سے لگایا اور پھر ہالاب اس کا خون چوسنے لگی۔ میں بیٹھی بیٹھی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مارج مجھے مارج نہیں کوئی اور ہی شیطان نما بدروح لگ رہی تھی۔ جو بڑے حُرے سے اپنے گرد و نواح سے بے نیاز ایک انسان کا خون پینے میں مشغول تھی۔

میرا دوست خند میں ہی نہانے کب زندگی کی بازی ہار گیا اور مارج اس کا گوشت نوج نوج کر کھانے لگی۔ اپنے پیارے دوست کو میں نے اپنی محبت پر قربان کر دیا تھا، نہیں معلوم تھا کہ میں مارج کو خوش دکھ کر خوش تھا یا نہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر سوار ہو چکی تھی۔ میرا دماغ سنسنار ہوا تھا۔ آنکھیں مارج پر جمی تھیں جو میرے دوست کا گوشت کسی جنگلی جانور کی طرح بھنجوڑ کر چبا رہی تھی۔ مجھ سے مزید اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھنا نہ کیا اور وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نہانے تھی دیر میں بستر پر چٹ لیٹا رہا، ذہن مختلف سوچوں کی زد میں تھا۔

نجانے مارج کو کیا ہو گیا تھا یہ وہ مارج بالکل نہیں تھی جسے میں کبھی جانتا تھا یا پھر یہ میری مارج تھی ہی نہیں۔ میں اکثر مارج کو اس کا ماضی یاد کرواتا رہتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کیا کرتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ کتنے خوش تھے تم میرے لئے

مے حُرے کے کھانے بنایا کرتی تھی۔

مگر پھر اچانک سفاک موت جنہیں مجھ سے مل کر لے گئی اور اب میں نے جنہیں داپس حاصل کیا موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا ہے۔ میری ان سب باتوں پر مارج مجھے چپ چاپ ساٹھ چہرے کے ساتھ غامبی لگا ہوں سے غور کر رہی تھی۔ گویا اسے اپنے ماضی کی بات یاد نہ ہو۔

طرح طرح کے خیالات دل و دماغ میں سر اٹھا رہے تھے۔ دل محبت کے ہاتوں بھجور تھا اور میرے اس کوچ کہہ رہا تھا۔ جبکہ اس کے برعکس دماغ مجھے بار بار کہہ رہا تھا۔ دل و دماغ میں جنگ کی سی کیفیت قائم تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مارج کے جسم کے مارج کی ہی روح تھی یا پھر کوئی اور شیطانی روح ال کر گئی تھی۔

مارج کی سر و مہری اور اب یہ شیطانی عمل۔

یہ سوچ سوچ کر دماغ پھنسا جا رہا تھا۔ مجھے مارج اس رویے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اب اس جاننے کے بعد ایسی کوئی چیز طلب کرے گی۔ میں نے میری خواہش کے مطابق مجھے میری مارج کی لٹا دی تھی۔ گویا ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب اس آگے میں جانوں یا پھر میرا رب جانے۔ نہانے تھی میں شش و پنج کی سی کیفیت میں رہا۔ ہوش تب آیا مارج کو کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے پایا کہ چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں میرے ڈالہا نہ محبت غالباً وہ میرے اس عمل پر مجھ سے خوش تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میرے متھے ہوئے اعصاب ڈھالے ہو گئے اور کچھ دیر تک والی عجیب سی کیفیت ختم ہو گئی۔ غالباً دل ایک بار پھر دماغ پر سبقت لے گیا۔ اس کی اس خوشی کی ہی خاطر تو میں نے یہ سب کیا اور اب اس کے چہرے سے وہ خوشی اور پیار اتر رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی مجھے خواہش اب اس کا میں منتظر تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اب میرے قریب چلی آئی۔ وہ میرے سینے سے آگئی

تھی۔ ایک عرصے بعد میں نے مارج کو خود میں محسوس کیا تھا۔ جس کی مجھے بے انتہا خوشی تھی اس کی نرم گرم سانس مجھے خود میں اترتی محسوس ہوئیں۔ وہ رات میرے لئے کسی خوب صورت خواب جیسی گزری۔ میں گویا ساری رات ہواؤں میں اترتا رہا تھا۔ میں کہاں ہوں کہاں نہیں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

کچھ دن تک تو مارج میرے ساتھ بہت اچھی رہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا مجھے میری پرانی مارج داپس مل گئی ہو۔ وہ مجھ سے اسی طرح محبت کرنے لگی تھی جیسے پہلے بھی کیا کرتی تھی۔ پہلے ہر روز آفس سے آ کر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کر کے خود بھی کھاتا تھا اور اسے بھی کھلاتا تھا مگر اب تو وہ خود میرے لئے ناشتہ اور رات کا کھانا اپنے ہاتھوں سے بنانے لگی تھی۔ میرے کپڑے دھو کر انہیں پریس کرتی میرا ہر کام وقت پر کرتی غرض یہ کہ میرا اور میری ضرورتوں کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگی۔ مارج میں یہ تبدیلی میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھی۔ ایک انسان کی جان قربان کر کے مجھے میری مارج داپس مل گئی تھی۔ تو بھلا اس میں کیا غلط تھا؟ اب میں اپنی اس حرکت پر ذرہ بھر کو بھی نادم نہیں تھا۔ اللہ میرے دل کو سکون اور اطمینان نصیب ہو گیا تھا ساتھ میں اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ میری مارج ہی ہے نہ کوئی شیطانی بدروح اس دن خود بخود میں اپنی مارج کے بارے میں نہانے کیا کچھ سوچتا رہا تھا۔ جس پر میں خود سے شرمندہ تھا۔

یقیناً موت کے بعد جاننے پر وہ خود کو ماحول سے ہم آہنگ نہیں کر پائی تھی اور اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایٹم جسٹ ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میری یہ خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔

مارج کی یہ کیفیت صرف عارضی تھی کچھ دنوں بعد اسے پھر سے انسانی گوشت اور خون کی پیاس لگی تو اس نے مجھ سے اس کی ایک بار پھر فرمائش کر ڈالی کہ میں اس کے لئے آج رات ایک اور شکار لے کر آؤں، میں یہ سن



## القرآن

اور اے ایمان دارو! تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو تاکہ تم قلاح پاسکو۔ (النور: 31)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ (البقرہ: 222)

اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو قبول کرتا ہے۔ (المائدہ)

وہ جو بدکاریوں سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (المومنون: 5)

البتہ میں اپنی نشانوں سے زمین پر ناحق تکبر کرنے والوں کو پھیر دوں گا (الاعراف: 126)

اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے پختہ عہد کی بدولت ثابت قدم رکھتا ہے (ابراہیم: 27)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک پر موت وارد ہو تو کہتا ہے، اے میرے رب مجھے واپس لوٹا تاکہ میں نیک عمل کروں جہاں سے ادھورا چھوڑ آیا ہوں۔ (المومن: 99، 100)

(حافظ سحان احمد - کراچی)

کافی دن آرام و سکون سے گزر گئے کوئی خاص تہہ بلی روزانہ نہ ہوئی۔ مارچ نے بھی دوبارہ مجھ سے ایسی ویسی کوئی فرمائش نہیں کی جس وجہ سے میں خوش اور مطمئن زندگی کے دن اس کے ہمراہ گزارتا رہا اور وہ اپنی تمام تر محبت مجھ پر نچھاور کرتی تھی اور میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ جسے اس کی بیوی دوبارہ مل گئی تھی اور اب وہ اسے بالکل اسی طرح سے چاہنے لگی تھی۔ جیسے مرنے سے پہلے چاہا کرتی تھی۔

مجھے تو اب ذرا بھری بھی یہ احساس نہیں ہوتا تھا جیسے میں نے اسے دوبارہ موت کے منہ سے نکال کر

اپنی زندگی میں آکر دیکھا تھا۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس پر ضرور کروں گا۔

وہ بڑی رغبت سے کھانا کھانے میں مشغول تھا۔ وہ کھانا کھا کر فارغ ہو گیا تو میں نے اسے چائے لے کر کھانا کھا کر روک لیا اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

میری اس عنایت پر بے حد مشکور تھا۔ یقیناً مجھ سے یہ سب کسی نے نہ کیا ہوگا۔ اس کے لئے میں خالی اٹھا کر کھن میں چلا آیا اور انہیں دھونے لگا تاکہ اتنی دیر ہوئی کی دوا میں نے کھانے میں ملائی تھی وہ

پر اثر کر جائے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب میں واپس آ تو وہ بڑے آرام سے کرسی پر ایک طرف گردن لگا کر سو رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ دوا کا اثر تھا یا

میرا کرم کرسی کا جو اسے پہلی مرتبہ میسر آئی تھی جیسی جلد نیند نے آ لیا تھا۔ اسے آرام سے سوتا دیکھ کر

میں نے مارن کو کمرے سے باہر آنے کے لئے کہا اور وہ موت ملتے ہی خوشی سے جھومتے گئے۔ اس نے آگے

کر میری پیشانی چوم لی اور مسکراتی ہوئی اپنے شکار کی

آگے کا منظر دیکھنا میرے لئے کال تھا لہذا میں مارن کو اس کا کام کرنے دیا اور خود اپنے کمرے میں

آ گیا۔ آج میرے دل میں پہلے دن کی طرح نہ کوئی اٹھانہ ہی ذہن میں کوئی ایسی سیدھی سوچ۔ اس وقت صرف اپنی مارن کو دیکھ کر خوش تھا کیونکہ وہ خوش تھی۔

نجانے کتنی دیر مارن کو اپنا کام کرنے میں لگی، میں جانتا تھا کہ اس نے اپنا کام مکمل کر کے

میں آئے گا۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے پاس میرے بیٹے کو لے کر آئی تھی۔

کپڑے اس کی زندگی کے تمام پردے فاش کر رہے تھے۔ وہ غربت کی جتنی جاگتی مکمل تصویر تھا۔

میں اس کے پاس چلا گیا اور اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بھو کے ہو؟“ اس نے حیرت سے گردن گھما کر میری جانب دیکھا۔ یقیناً مجھ سے پہلے اس قدر

بیٹھے لہجے میں شاید ہی کسی نے اس سے بات کی ہوگی۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے جلدی سے ہاں میں سر ہلا کر کہا۔ ”دو دن سے۔“

”آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کھانے کے لئے کچھ دیتا ہوں۔“

میں نے اس سے کہا اور آگے ہی آگے چلے گا۔ میرا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ وہ مجھے حسرت بھری

نگاہوں سے دیکھتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ یقیناً وہ اس وقت شدید بھوکا تھا۔ میں دو تین بار رک کر اسے

پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا تھا کہ وہ میرے پیچھے آگیا رہا ہے یا نہیں مگر ہر بار اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر میں واپس

آگے کی جانب چلے لگتا۔ بلا آخر میں اسے لئے اپنے گھر چلا آیا۔ جہاں مارن ہمارے چینی سے انتظار کر رہی

تھی۔ میں نے اسے ڈانٹتے نکیل پر بٹھایا اور خود کچن میں آ کر اس کے لئے کھانا گرم کرنے لگا۔ جس میں

میں نے بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی، اور پھر وہ کھانا اٹھا کر اس کے پاس چلا آیا۔

جیسے ہی میں نے اس کے آگے کھانا رکھا وہ کسی وحشی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا اور کسی بھوکے شیر کی طرح

چڑچڑ کھانے لگا، اسے اس طرح سے کھاتے دیکھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے دروازے

کے پیچھے کھڑی مارن کی جانب دیکھا تو وہ بھی میری جانب دیکھ کر مسکراتی تھی اسے اپنی طرف یوں مسکراتا

دیکھ کر میری مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور دل میں ایک اطمینان سا دوڑ گیا کہ میری مارن مجھ سے خوش ہے۔

ویسے بھی یہی گلی سونے والا بھورا انسان غالباً اپنی زندگی سے تنگ ہوگا۔ لہذا اسے زندگی سے محروم کر کے میں ایک طرح سے مارن پر تو کوئی احسان نہیں کروں گا ہاں

کر سناٹے میں آ گیا، میں تو سمجھا تھا کہ وہ دوبارہ مجھ سے ایسا کچھ نہیں مانگے گی مگر وہ تو جیسے میری خدشیں کر کے

بدلے میں مجھ سے ان کا صلہ مانگ رہی تھی۔ مرنے کا یہ دہشت گردی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اب

دوبارہ کھانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ اب جب وہ مجھے پہلے کی طرح واپس مل ہی گئی تھی مجھ سے بے تحاشہ

محبت کرنے لگی تھی میرا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی تو کیا میں اس کے لئے ایک اور انسانی جان کی قربانی نہیں دے سکتا۔

لہذا اس دفعہ میں نے راہ چلتے کسی مجبور اور غریب شخص کو اپنا شکار بنانے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں نہیں

چاہتا تھا کہ اپنے ایک اور دوست کو نشانہ بنا کر اپنے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کروں پہلے ہی اس دوست کی گمشدگی پر

اس کے گھر والے پریشان تھے اور پولیس کی مدد سے اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھ سے

بھی وہ کچھ نہ گئی تھی مگر کوئی بات نہ سننے کی تھی تو اچھا تھا کہ اسے کسی نے میرے ساتھ میرے گھر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا نہ ہی وہ گھر بنا کر آیا تھا کہ وہ میری

طرف جا رہا ہے۔ یہ تمام باتیں میرے حق میں بہتر تھیں اور مجھے

ایک طرح سے اس طرف سے کوئی فکر بھی نہیں تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ مارن نے اس کی لاش کی ایک بوٹی بھی

نہیں چھوڑی تھی تو وہ تا قیامت بھی اس کی تلاش میں گھرے ہیں تو اسے ڈھونڈ نہیں پائیں گے نہ ہی کوئی مجھ پر

ہلکا سا بھی شک کر سکتا تھا اس کی موت کا ثبوت اس کی لاش کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس رات جب میں کسی شکار کو پھانسنے کے لئے گھر سے نکلا تو اسے میری خوش قسمتی کہیں یا اس کی بد قسمتی مجھے جلد ہی گلی کی ایک گلو پر ایک نوجوان لڑکا

مل گیا جو پاس پڑے ہوئے کوڑے دان سے اپنے لئے غالباً کچھ کھانے کے لئے تلاش کر رہا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ بے چارہ کوئی بے بس ولا چار غریب اور بھوکا معلوم

ہو رہا تھا۔ اس کا حالات کا مارا چہرہ اور کندھے سے میٹھے کیلے



زندہ کہا ہے بلکہ اب بھی احساس رہتا تھا گویا وہ مجھ سے کبھی پھڑکی ہی نہیں تھی۔ ان سب کے باوجود میں نے کبھی کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اب کس قدر خوش رہتا ہوں۔

دنیا کے سامنے میں وہی بد قسمت شوہر تھا جس کی بیوی بھری جوانی میں اس سے پھڑکتی تھی اور مجھ سا دیوانہ شوہر آج بھی اس کی یاد میں کل رہا ہے۔ حقیقت میرے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی کہ میں اپنی مارج کو واپس حاصل کر چکا تھا اور اب میری زندگی میں کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔ بچوں کی خواہش بھی نہیں۔ مارج مل گئی تھی اس سے بڑھ کر اب کوئی اور خواہش معنی نہیں رکھتی تھی۔

بہر حال یونہی ایک ماہ مزید گزر گیا اور اب میں آہستہ آہستہ مارج کی بدلتی کیفیت میں کچھ تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کچھ چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ بات بات پر مجھ سے اچھے لگتی تھی اور کہتی تھی کہ ”مجھے اس کا خیال نہیں ہے۔“ اس کے ایسا کہنے پر میں سوچوں کی گرفت میں جکڑا جاتا تھا۔ ”احساس نہیں ہے مجھے؟“ یہ الفاظ مجھے سوچوں کے پھور میں پھنسا دیتے۔ ہر طرح سے تو میں مارج کا خیال رکھتا تھا۔

چھٹی کے دن اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتا تھا سارا کام خود کرتا حتیٰ کہ کھانا بھی اسے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھاتا پر یہ کہ ہر طرح سے اس کے آرام و سکون کا خیال رکھتا جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا اس کے لئے وہ سب کرنے کی کوشش کرتا کسی چیز کی محسوس نہ ہونے دیتا جو مانتی تھی اس کے قدموں میں لا کر رکھ دیتا تھا۔ میرے دل پر تو روز اول سے اس کا راج تھا تو پھر ان سب کے باوجود وہ مجھ سے ایسا کیوں کہتی تھی؟؟؟

باوجود پوچھنے کے نہ بتاتی کہ میں کس طرح سے اس کا خیال نہیں رکھتا وہ بس اتنا کہہ کر خاموش ہوتی کہ ”جب تمہیں خود سے کوئی احساس نہیں ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اور یہ الفاظ مجھے سوچوں کی آفتاب گہرائیوں میں گرا دیتے۔ یہ ضرور تھا کہ میں نے اسے گھر میں قید

کر کے رکھ دیا تھا، باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل منقطع ہو چکا تھا اور ایسا کرنا میری مجبوری تھی اسے دنیا والوں کی نظر اور کے سامنے لا کر ہم دونوں کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کرنا چاہتا تھا۔ جو مانتی تھی خود جا کر بازار سے لا دیتا تھا۔

یوں ایک عرصہ بیت گیا تھا اسے باہر کی دنیا دیکھے ہوئے لیکن اگر اس وجہ سے اس کا موڈ خراب رہتا تھا تو وہ مجھ سے اس بارے میں بات کر سکتی تھی لیکن اس نے تو ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ وجہ ہرگز نہیں تھی وہ گھر میں میرے ساتھ خوش اور مطمئن تھی تو پھر کیا وجہ تھی؟؟؟

بالاخر ایک دن حسب معمول وہ مجھ سے بنا کسی وجہ کے جھگڑنے لگی اور یوں اصل بات اس کی زبان پر آئی گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے کافی دیر سے تم سے خود انسانی گوشت اور خون کی فرمائش نہیں کی تو تم نے بھی اس کا احساس نہیں کیا۔ اپنی بھوک تو مالتیے ہوتی میری بھوک کا کیا ہے۔“

مارج کے منہ سے نکلے ان الفاظ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے حیرانی سے اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔ ”مارج مجھے تو لگا تھا کہ تم سدھ گئی ہو اب۔ اس لئے تمہیں ان سب کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنے دن سے تم مجھ سے اس وجہ سے ناراض ہو۔ صاف صاف کہہ دیجیے بھلا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تمہیں خود احساس ہونا چاہئے اس بات کا۔ جب میں ہر طرح سے تمہارا خیال کرتی ہوں تو تمہیں بھی میرا خیال میرا احساس کرنا چاہئے۔“ مارج نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”مارج جو کبھی مجھ سے اونچے لہجے میں بات نہ کرتی تھی۔ آج اس کا لہجہ مجھے انگشت بدندان کر رہا تھا۔“ میں بھی تو تمہارا ہر طرح سے خیال کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں میری جان بس اب میں اس بات کا ثبوت دینے کے لئے تمہاری روز روز کی فضول فرمائشیں نہیں پوری کر سکتا۔ تم انسان ہو جاؤ تو نہیں اس لئے انسانوں کی طرح رہنا سیکھو آدم خور مت بنو۔“ میں

درشتی سے کہا تو مارج نے شدید غصے میں آ کر حلیف بننے لگے شیشے کے گلاس زور سے زمین پر ٹڑے سمیت کھڑے ڈالے جو زمین پر گر کر ہی چپکنا چور ہو گئے۔

مارج کی اس حرکت پر مجھے اتنا شدید غصہ آیا کہ میں نے زور سے اس کے گال پر تھپڑ بڑا دیا اور وہ لڑکھڑا کر حلیف پر جھک گئی۔ اپنے اس شدید غصے پر میں خود کی حیران رہ گیا۔ میں نے اس سے پہلے اس پر ہاتھ لگایا تو درکنار اس سے اونچے لہجے میں بات تک نہ کی تھی مگر آج اس نے بدتمیزی کی حد کر دی تھی۔ لہذا میں لاگو روک نہ سکا۔

مارج حیرت سے اپنے گال پر ہاتھ رکھے مجھے دیکھنے لگی گویا اسے مرنے سے پہلے کی تمام باتیں یاد آ رہی ہیں۔ میں نے بھی اس پر غصہ نہیں کیا تھا۔ میں اسے ان چھوڑ کر چکن سے باہر نکل آیا اور گھر کو تالا لگا کر کئی پارک میں جا بیٹھا۔ دماغ سنسنار رہا تھا اور بدن پر لڑش طاری تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں مارج کو زندہ کر کے کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ جانے کتنے چلے جاتے ہیں ان کا دوبارہ اس زندہ لوگوں کی اہم کوئی کام نہیں رہتا۔

مارج کو خوش رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا رو دن بعد ایک انسانی جان کی سمیٹ جو کہ اب بے بس میں نہ رہا تھا اسے میری محبت میری وقا کچھ نہیں آتی تھی اگر اسے مجھ میں کچھ دکھائی دیتا تھا تو وہ ایک شکاری تھا جو اسے ہر دو دن بعد شکار لا کر کھاتا تھا۔

میں کافی دیر خالی بیچ پر بیٹھا ہر کتنے پر غور کرتا رہا بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اب میں کسی طور بھی اس کی فرمائش پوری نہیں کروں گا۔ چاہے وہ کسی ہی ضد کی جان ضائع نہیں کروں گا اس بار میرا ضمیر میری سے جیت گیا تھا۔

شام ڈھلے میں گھر واپس آیا تو مارج دوڑ کر آ کر بیٹھنے سے آگئی اور مجھ سے اپنے گزشتہ رویے کی

معافی مانگنے لگی۔ میں نے اس کی نادانی سمجھ کر اسے معاف کر دیا۔ یوں کچھ دن مزید سکون سے گزر گئے۔

تاہم چند دنوں بعد میں پھر محسوس کرنے لگا تھا کہ مارج کی طبیعت بگڑنے لگی تھی اس کی طبیعت میں عجیب سا اضطراب اور بے چینی اند آتی تھی۔ جو اس کی حرکات و سکنات سے واضح ہوتی تھی کہ اس نے مجھ سے دوبارہ انسانی گوشت اور خون کی فرمائش نہیں کی تھی مگر میں اس کی دل کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس کے منہ کو انسانی گوشت اور خون لگ چکا تھا۔ جس کے بغیر رہنا اب اس کے لئے مشکل تھا۔ لہذا ان سب کی ایک بار پھر شدید طلب محسوس ہونے لگی تھی۔ کیونکہ بڑی دیر گزر گئی تھی اسے یہ چیزیں میسر نہیں آتی تھیں۔ میں نے اس کی بدلتی کیفیت کو بہ خوبی نوٹ کیا تھا مگر اس سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ میں خود سے عہد کر چکا تھا کہ اب جو مرضی ہو جائے میں یہ گناہ کسی قیمت پر نہیں کروں گا۔ اور پھر میری زندگی میں وہ رات بھی آئی جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا اور جسے یاد کر کے آج بھی میرے روتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس روز کھانا کھانے کے بعد میں ٹی وی کے آگے بیٹھا کوئی بار رمودی دیکھ رہا تھا، مارج بھی میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی کہ یکبارگی فلم کے اندر آدم خوروں کو سفاکی سے انسانی گوشت کھاتے ہوئے دکھایا جانے لگا۔ جنہیں دیکھ کر مارج کی حالت بگڑنے لگی اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور میرے پاس سے اٹھ کر سامنے کسی اور صوفے پر جا بیٹھی۔ میں اس کی حالت سے واقف ہوتے ہوئے بھی انجان بن رہا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کی حالت پر ترس آئے اور میں ایک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں۔

مارج کی حالت اعتدال پر لانے کے لئے میں نے ٹی وی پر چلتی فلم بدل دی اور خبروں کے چینل کو بدلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مارج کی حالت بہتر ہو گئی تھی مگر اس کی آنکھوں کی سفیدی غائب ہو گئی تھی۔ صرف کالی کالی آنکھیں باقی رہ گئی تھیں۔ مجھے اس کی نظروں کی

تپش اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو میں نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر سانس نہ گیا کہ مارچ مجھے یہ ایک بک بکھو رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

میں نے اس سے کوئی بات کرنے کے بجائے اپنا چہرہ واپس ٹی وی کی طرف پھیر لیا۔ مگر میں مسلسل اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا، میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا تو اس بار میرے دیکھنے پر وہ مسکرا دی اور میں نے دونوں کیلئے دانت واضح اس کے ہونٹوں سے باہر دیکھے اور مجھے سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہنسنی ہوئی مجھ پر کسی درندے کی طرح چمپئی۔

یہ حملہ میرے لئے غیر متوقع تھا لہذا میں خود کو سنبھال نہ سکا اور مارچ نے اپنے نوکیلے دانت میرے دائیں بازو پر گاڑ دیے۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکلنے لگتی رہ گئی۔ یوں لگا گویا گرم گرم سیسہ میرے اندر اتر گیا ہو۔ یہ مشکل ضبط کر کے میں نے خود کو مارچ کی گرفت سے چھڑایا اور اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ عورت ذات تھی میرے بھرپور دھکا دینے سے پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگی اور زمین پر گر گئی۔ میرے بازو سے گرم گرم خون بہ کر نیچے فرش پر گر رہا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ میرے بازو کا گوشت مارچ کے منہ میں نہ آ سکا تھا اس سے پہلے ہی میں خود کو چمڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے زخم پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اسے دبا دیا تاکہ خون بہنا بند ہو سکے۔

شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔ اسنے دلوں سے مارچ کو کوئی شکار نہ ملا تھا، اپنی بھوک مٹانے کے لئے وہ مجھ پر ہل پڑی تھی۔ لیکن میں ایسا ہرگز ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ میں مارچ کی خوراک بالکل نہیں بن سکتا تھا۔ شاید میری محبت مارچ کے لئے ابھی اس قدر بھی نہیں تھی کہ میں خود ہی اس کا لونا بننا پسند کرتا۔

یوں بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ میری مارچ ہرگز

نہیں تھی۔ جسم مارچ کا تھا مگر اس کے اندر موجود روح کوئی شیطان نما بدروح تھی۔ میری مارچ میرے لئے اپنی جان دے سکتی تھی مگر اپنی خوشی کے لئے میری جان ہرگز نہیں لے سکتی تھی۔ لہذا یہ جو کوئی تھی مارچ بالکل نہیں تھی۔

مارچ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی دیوار کے ساتھ زور سے لگنے کے باعث وہ مزید خوفناک ہوئی تھی اور اس کا چہرہ بھی بے حد بھیانک ہو گیا تھا اور میں کیوں گا وہ میری مارچ کا چہرہ بالکل نہیں تھا۔ وہ کسی شیطان کا چہرہ تھا۔ جسے دیکھ کر میں خود پسینہ پسینہ ہو گیا۔ بڑے بڑے دانت ہونٹوں سے باہر تھے۔ جس سے خون فٹک رہا تھا۔ کالی سیاہ آنکھیں باہر کولی ہوئی تھیں اور چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان تھا۔ وہ کسی طور بھی مارچ کا چہرہ بالکل نہیں تھا ہرگز نہیں تھا۔

آج صبح معنوں میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں نے محبت میں اندھا ہوا کرکشی بڑی غلطی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ مارچ مجھ پر ایک بار پھر حملہ آور ہوئی میں نے کمرے سے باہر کی جانب دوڑ لگا دی اور زور سے چیختر باہر کے کمرے کو بند کر دیا۔

مارچ پالگوں کی طرح دروازے پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس کے حق سے نکلنے والی غراہیں کسی درندے سے مشابہہ تھیں۔

میرا دل بری طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور پسینہ کسی پانی کی طرح پورے بدن پر بہہ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر مجھے کچا چا جائے۔ میں چند لمحے ہراساں لگا ہوں سے دروازے کو ٹھونک رہا۔ جس پر مارچ وحشیانہ انداز میں تابڑ توڑ حملے کرنے میں مصروف تھی۔ میرے جسم پر کچکی طاری تھی، میں اسے کمرے میں بند چھوڑ کر اپنے زخم پر ہر دم لگانے لگا۔ یہ سب کچھ میرے لئے نہایت خوفناک اور دل دہلائیے والا تھا۔ اگر میں پھرئی نہ دکھاتا تو آج مارچ کا نوالہ بن چکا ہوتا۔

شدت غم سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اپنی مارچ کو اس سال میں لانے والا میں خود تھا۔

کاش! میں نے محبت میں اندھا ہو کر یہ سب نہ

ہوتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا دل میں درد کا زہر اٹھا جو آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہنے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

مارچ کی چیخیں مسلسل جاری و ساری تھیں۔ وہ دروازہ توڑ دینے کی کوششوں میں تھی۔ میرا گھر رہائشی تھے سے ذرا فاصلے پر تھا۔ لہذا مجھے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ کوئی پڑوسی شور سن کر یہاں چلا آئے گا۔

ساری رات میرا دل مارچ کی حالت پر رونا بڑھتا رہا۔ صبح کی سفیدی سے پہلے پہلے مارچ کی ہمت آپ دے گئی اور وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ درواری تھی یا کیا کر رہی تھی میں نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی میں خود میں اتنی ہمت جمع کر پا رہا تھا کہ اندر جا کر دیکھ لوں کہ اب وہ کس حال میں ہے۔ میرے زخم سے درد کی تک نہیں گیا تھا اور پھر جو کچھ مجھ پر گزری تھی اسے صبح سویرے کساری رات کا جاگا گوا، میں باہر صوفے پر سو گیا۔ نہ جانے کب تک سوتا رہا۔

آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ مجھے اتنی دیر بھانپنے پر خود برحیرت ہوئی۔ شاید یہ سب میرے زخم کی وجہ سے تھا جس کی وجہ پر غنودگی چھائی رہی تھی۔ میں ہوا دروازے کے پاس آیا اور کان لگا کر دوسری طرف سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اندر کبھی خاموشی ہی تھی۔ شاید مارچ دوبارہ نہیں جیتی تھی ورنہ میری کھانک ٹپٹنی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مارچ کی اس حالت کا فہم دار میں ہی تھا اور اسے ٹھیک کرنا بھی میری ہی ذمہ داری تھی۔ میں پہلے مشکل تمام خود میں تمام ہمت وصول کر لیا اور اس کمرے کی طرف آیا جس کے اندر مارچ بند ہے۔ آخرو کہ وہ میری پیاسی بیوی تھی خواہ اس کے اندر بھی جو ہم تو اس کا تھا نہ۔ اور اس کے اس جسم کو میں اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ بدروح مارچ کے جسم پر ہمیشہ کے لئے قابض آجائے اور خود باہر جا کر لوگوں کو مار کر لے لیتی اس سے پہلے پہلے مجھے اپنی مارچ کے

جسم کو اس سے آزاد کروانا تھا اور یہ کام مجھے کسی پادری کے ہتھیار سرانجام دینا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کیے کلمات پڑھتے ہوئے با آہستگی اندر کی جانب دروازہ کھول دیا۔

لیکن یہ کیا، پورا کمرہ خالی پڑا تھا، مارچ اندر کہیں نہیں تھی، میں نے باہر ہی کھڑے ہو کر کمرے کے چاروں طرف کونوں میں نگاہیں دوڑائیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور نارمل تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ سلیپے سے پڑی تھی۔ پھر مارچ کہاں چلی گئی؟ کمرے میں دوسرا کوئی اور دروازہ بھی نہیں تھا جس سے اندر باہر آیا جاسکتا۔

ایک ہی دروازہ تھا جس کے آگے میں ایسا دہ تھا۔ میں نے جوبھی کمرے کے اندر کا جائزہ لینے کی غرض سے قدم رکھا بلکھٹ مارچ نے مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور اپنے نوکیلے دانت ایک بار پھر میرے اسی زخم میں پیوست کر دیے۔ اس اچانک افتاد پر میں بوکھلا گیا اور درد کی اذیت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ وہ

دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی اس کی اس ہوشیاری پر میں انشت بدحال تھا۔ میں نے ایک تھکے سے اپنا بازو مارچ کے نوکیلے دانتوں سے آزاد کروایا اور اسے زور سے پیچھے کی جانب دیکھا دیا، وہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ میرے زخموں سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا اور درد تھا کہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ مارچ کی وحشت میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔ وہ گزشتہ رات کی ہی طرح گوشت کی بھوکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بدروح اس کے جسم پر حاوی ہوئی جا رہی تھی۔

مارچ نے اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ کرنا چاہا اس بار میں ہر حملے کے لئے بالکل تیار تھا میں نے اپنا فولادی سکا اس کے جڑے پر رسید کر دیا جسے وہ سہ نہ کی اور چیختی ہوئی صوفے سے پیچھے جا گری۔ اگرچہ مارچ کے جسم کو چوٹ دیتے ہوئے میرے اپنے دل کو چوٹ لگ رہی تھی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں مجبور تھا اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے نقصان پہنچانے



## قاتل

احسان الحق

جب کسی وفادار عورت کے جذبات سے کھیل کر اسے کچل دیا جائے تو جیتے جی مرجاتی ہے مخلص عورت اور پھر معاشرے میں ناقابل فراموش کہانیاں جنم لیتی ہیں کہ لوگ انگشت بدندان رہ جاتے ہیں۔

ایک روح کی دیدہ دلیری کے اس نے اپنا انتقام لے کر چھوڑا..... ایک حقیقی کہانی

”مارتھا؟“ اس کے منہ سے ہلکے سے نکلا۔ ”مارتھا؟“ اس نے دوبارہ سے زیر لب یہ نام پکارا۔ پھر اپنا سر جھٹکا۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے پھر سے خودکلامی کی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ کرسی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔“ اس نے بستر کے سائڈ پر رکھی کرسی کی جانب دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ کرسی اپنی سچ سالم حالت میں تھی۔ کرسی کو مسلسل گھورتے ہوئے اس

صبح ہوئی۔ نئے دن کا سورج چمکا۔ سورج کی پہلی کرنوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تو اسے ایک جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے انگڑائی لی اور نیم وا آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے یکدم اپنے ہاتھ کو ڈبل بیڈ کے بائیں جانب پھیرا۔ انداز ایسا تھا جیسے کسی کو ٹولا جا رہا ہو۔ پھر جیسے اسے ایک دھچکے سا لگا!

سے گریز نہ کرتی۔ میں نے مارج کے گرے ہونے کا فائدہ اٹھایا اور بھاگتا ہوا کچن میں آیا۔

میں نے تیزی سے فلیف سے تیز دھار گوشت کاٹنے والا چھرا اٹھایا اور دل میں بچے بچے تمام جذبات کو روند ڈالا۔ یہ میری مارج کا جسم ضرور تھا مگر یہ مارج نہیں تھی اور پھر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

مجھے ہر حال میں مارج کے اندر موجود بدروح کو واپس اسی جگہ بچھانا تھا جہاں سے وہ آئی تھی میں واپس اس کمرے میں آیا تو مارج اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔

میں نے آؤدیکھا نہ تاؤ آنا فانا اس کے گلے پر تیز دھار چھرا پھیر دیا۔ مارج کی آنکھیں مزید باہر کواٹل آئیں اور حلق سے عجیب و غریب غرائش نکلنے لگیں۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ مکر میں نے یہ مشکل خود کو کسی طرح سنبھالے رکھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ایک بار پھر چھرا مارج کے پیٹ میں گھونپ دیا، وہ فرش پر گر کر ترسے لگی اس کی آنکھوں میں میرے لئے خبیہ پناہ نفرت تھی۔ میں بھی سپاٹ چہرے سے اسے دیکھتا رہا۔

چند لمحوں بعد وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ اس کے جسم میں اب کوئی جان باقی نہ رہی تھی، میں کافی دیر تک اس کے چہرے کو گھورتا رہا اس کے چہرے پر زندگی کی رونق تو پہلے بھی نہ رہی تھی اب بس وہ ہلے جلنے سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئی تھی۔

وہ ایک بار پھر موت کی آغوش میں جاسوئی تھی۔ میں نے الماری میں سے صلیب نکال کر اس کے گلے میں ڈال دی تو رفتہ رفتہ اس کے چہرے کے خدو خال بدلنے لگے۔ کچھ ہی من میں میرے سامنے میری وہی معصوم مارج تھی جسے دیکھ کر میں جیتا تھا۔ چند لمحے پہلے جو چہرے پر خوفناکی تھی وہ اب نہ رہی تھی۔

مارج کا خوبصورت چہرہ دیکھ کر میں ایک بار جذباتی ہو گیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھنے لگا۔ کب تک دھواں دھار روٹا رہا۔ یہ جانتا تھا کہ اگر مارج کا روپ





نے پھر سے خودکامی کی۔ ”آہ۔۔۔ ستیا ناس ہو۔۔۔ یہ سب ایک خواب تھا۔ ایک ڈراما ناخواب۔“

”ضروری نہیں کہ سب کچھ خواب ہی ہو۔ ڈارلنگ!“ ایک سوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ یہ مارتھا کی آواز تھی۔ آنجہانی مارتھا ایک ہفتہ قبل کی جانے والی مارتھا۔

مارتھا کی آواز گویا اس کے وجود پر بھاری پڑ رہی تھی۔ ایک ظالم نے اس حین کو مار ڈالا تھا۔ مارتھا جو ایک حسن کا شاہکار عورت تھی۔ آخر کی تھی اس میں۔ ہنسی، نکھری، بھرپور سوانی جسم کی مالک، کھلتی ہوئی مسکراہٹ چہرے پر ہر دم سجائے، مارتھا! کہ جس کی ہر ہر ادا پر مصنف کرخٹ مرے، قابل قبول تو تھی وہ۔۔۔ لیکن افسوس کہ اس کا تصور بتائے بغیر اس کی ہنسی کیلکی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ صداقتیں بھی کسی کو یونہی سزائے موت نہیں سنایا کرتیں تو مارتھا کو تو۔۔۔ کچھ بھی تھا وہ مر چکی تھی۔ ابدی نیند کے ساگر میں کہیں گم کر دی گئی تھی۔

”ڈارلنگ! اٹھو اب صبح ہو چکی ہے، یہ لو میں بیڈ ٹی بھی لے آئی ہوں۔۔۔ جلدی سے اٹھ جاؤ اب۔۔۔“ مارتھا کے الفاظ ایک بار پھر سے اس کے کانوں میں گونجنے تو ایک انجانے خوف کے احساس کے ساتھ اس نے ارد گرد دیکھا۔ کمر خالی تھا لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت بھرے آنسو تھے۔ یقیناً متواتر رونے سے اس کی آنکھیں سو جن کا شکار تھیں۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا تو پھر یہ مارتھا کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟

”اٹھو، فریش ہو جاؤ! انہیں دو دفتر سے بھر دی ہو جائے گی اور تمہارے پاس کوتم سے شکایت بھی!۔۔۔ دوبارہ سے مارتھا کی آواز سن کر اس نے اپنی پچھٹی پچھٹی آنکھوں سے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا لیکن کمر خالی تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ قطعی نہیں ہو سکتا۔ مارتھا مر چکی ہے۔۔۔ ہاں!۔۔۔ مارتھا مر چکی ہے۔“ اس نے اپنے آپ میں خوف و ڈر کے طے جملے احساسات کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے عجب سی خود کلامی کی تھی۔

”بھلا ایک وجود، جسے موت لے جا چکی ہو، جس وجود کی روح کلکڑوں میں کھیر گئی ہوگی، اک بھر پور زندگی کے آچار ختم، ایک ایسا وجود ایک پھر نما کیفیت میں جھلا کر دیا گیا تو اس کی روح کیسے واپس آسکتی ہے۔ لے جانے والا روح لے گیا، تمام تر جذبات و احساسات تو لے گیا، وہ۔۔۔ نہیں!، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ مارتھا مر چکی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے جیسے تیسے بستر سے اٹھتے ہوئے نہایت جھلت میں پیڑے تبدیل کئے اور اس خوفناک آسب زدہ کمرے سے ہی نہیں بلکہ اپنے کمرے سے بھی باہر کی جانب بھاگنے کی، کی۔ باہر آتے ہوئے اس نے گھر کا مرکزی دروازہ مقفل کرنے کی بھی زحمت نہ کی۔ اس کی منزل پیڑ جوہن کا اپارٹمنٹ تھا لیکن اسے پیڑ کے اپارٹمنٹ میں پیڑ سے ملاقات نہیں کرنا تھی۔

نزدیکی ٹیلی فون بوتھ سے کال ملا کر اس نے کسی طرح پیڑ کو قاتل کر لیا کہ وہ جا چے چند منٹوں کے لئے سہی لیکن اس سے ملاقات ضرور کرے۔ پیڑ نے حامی بھری تھی لیکن پیڑ نے آخری جملہ کہتے ہوئے نہایت بے قدری سے فون بند کیا تھا۔

”ٹھیک ہے، نہیں آرہا ہوں، اسٹریٹ پارک کے بیچ پر میرا انتظار کر لیکن دس منٹ سے زیادہ ملاقات کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ only ten minutes۔ اوکے!“ پیڑ نے کہا اور اس نے فوری رابطہ منقطع کر دیا۔ رسیڈر میں سے ”ٹھک۔۔۔ ٹو دو۔۔۔ ٹو دو دو۔۔۔“ کی آواز کو سن کر اس نے جھجھلا کر رسیڈر کی جانب دیکھا اور زور سے اسے بوتھ کے کریڈل پر واپس رکھتے ہوئے ایک بھرپور گالی پیڑ کی نذر کی۔ ”سائلے! فون میں نے کیا ہے اور بند تو خود کر رہا ہے۔ آداب بھول گیا ہے۔۔۔“

تھوڑی دیر میں پیڑ نے اپنا وعدہ وفا کر دیا تھا۔ وہ آگیا تھا۔

”بولو کیا بات ہے؟“ پیڑ نے روکھائی سے پوچھا۔

”یہاں بتانا مشکل ہے!“ اس نے مختصر کہا۔

”تو پھر؟“

”کل میرے گھر آ جانا۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ۔۔۔“

”مارتھا مری نہیں، بلکہ زندہ ہے!“ اس نے پیڑ کی بات کاٹتے ہوئے اپنے مدعا کی بات کی تو پیڑ نے عجیب ٹیز حاسانہ بنا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہاٹ!“

”ہاں یہ سچ ہے، دوسری نہیں ہے ادھر زندہ ہے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ پیڑ ہنسیائی کیفیت میں غرابا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں، دماغ تمہارا ٹھکانے پر نہیں ہے، منہ بھی تھا!“

”اوکے۔۔۔ میں سمجھ گیا! تمہیں ایک اچھے نفسیات دان کی ضرورت ہے، اور کچھ نہیں!“ پیڑ یہ کہتے ہوئے بیچ سے اٹھ گیا۔

”کل رات تو بیچ! ضرور آ جانا، میں اپنی بات پر اب بھی قائم ہوں، مارتھا مری نہیں بلکہ اب بھی زندہ ہے!“ پیڑ اس کی ایک دہنٹے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

بارہ ضرب بارہ کے ایک کمرے میں دو آدمی آپس میں محو گفتگو تھے۔ پہلا دوسرے کو بتا رہا تھا کہ۔۔۔

”رات کو بیچ کر دس منٹ پر تائن و ن و ن پر کال وصول ہوئی تھی کہ اس نے پیڑ کو جان سے مار دیا ہے۔ پولیس، فائر بزنک اور میڈیکل انساف جب عمارت پر پہنچے تو قاتل نے خود سوزی کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی لٹ کر ڈالا تھا لیکن جو کچھ وہاں ہوا تھا، اسے دیکھ کر روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”ایسا بھی کیا ہوا تھا، وہاں؟“ جو جیمز آفسر مارکس نے سوال کیا تو ڈی ٹیکلیو پال نے اس کی آنکھوں میں جھماکتے ہوئے مزید بتانا شروع کیا۔

”کمرے میں داخل ہوتے ہی خون فرش پر پکھرا ہوا تھا۔ ہر شے جیسے سرخ رنگت میں نہلا دی گئی ہو۔ قاتل نے اپنی ہبہ رنگ خود ہی کاٹ ڈالی تھی۔ پولیس والوں نے

وہاں اس کے کمرے میں ایک کرسی پائی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ غالباً دھچکا مٹشی میں ایسا ہوا ہوگا اور بالآخر قاتل پیڑ کے پیٹ، گردے، سینہ، دل اور ماتھا چیرنے میں کامیاب رہا۔ پیڑ پر پتھر کے پے در پے وار کئے گئے تھے۔ بے چارے کا قہر کر دیا گیا تھا۔“

”یہ سب کچھ کہنے کی اسے کیا ضرورت پیش آئی تھی؟“ ٹھیکے سے قد کے جو جیمز آفسر مارکس نے سوال کیا۔ ”بلاوج تو کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا!“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مارکس!“ ڈی ٹیکلیو

پال اینڈرسن نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”تفیشی ٹیم سے معلوم ہوا ہے کہ پیڑ نے تقریباً ایک ہفتہ قبل مارتھا کو طلاق دے دی تھی۔ اور طلاق کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مارتھا ایک موٹل اور خوبصورت عورت تھی لیکن اس اچانک حادثے نے اس کی بی بی بانی دنیا آ جاڑ دی تھی۔ پیڑ اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کے ساتھ تخلص تھی۔ اس واقعہ نے مارتھا کو جیتے جی مار ڈالا تھا۔ وہ پراگندگی ذہنیت کی وجہ سے مانچ لیا، اسکیزوفرینیا اور مسٹر یا جیسے سے قابو نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ نشہ آور ادویات نے اور بھی کھاڑا نکال دیا۔“

مارتھا کو پیڑ کے ساتھ جیتے لحوں میں اپنی ہی کبھی باتیں سنائی دیتی تھیں، لیکن اپنے تئیں وہ خیال کر چکی تھی کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے، یہ نیوروسز کی خوفناک قسم ہے۔ ان امراض کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مارتھا نے اپنے بے وقاشہر پیڑ کے ساتھ کیا۔ جب کسی وفادار عورت کے جذبات سے کھیل کر اسے بھل دیا جائے تو جیتے جی مر جاتی ہے تخلص عورت! اور پھر معاشرے میں ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے جو جیمز آفسر کی جانب افسوس سے دیکھا۔ ”ہاں مارکس! ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں!!! جیسی مارتھا اور پیڑ کی یہ غولی کہانی!“



# اندھیرے سے اجالا

ملک فہیم ارشاد- ڈجکٹ فیصل آباد

پانچویں قسط

خوف کی وادی میں انکھیلیاں کرتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی، جسم و جان کے روگنٹے کھڑے کرتی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش پل پل لمحہ لمحہ اچنبھے میں ڈالتی خیر و شر کی کہانی

حقیقت سے روشناس کر لئی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب دماغ سے نمونہ ہونے والی روداد



”تم نے صاف اور کھر راستہ چنا ہے اب اوپر والا تہہ راستا تھوڑے گا کیونکہ جب انسان اوپر والے کا راستہ چن لیتا ہے تو پھر ہر منزل آسان ہو جاتی ہے راہوں میں بچھے سارے کانٹے صاف ہو جاتے ہیں۔“ سنٹوش نے ساسھی کو سمجھاتے ہوئے کہا اور پھر اسی ہمت مردوں مدد خدا دلی بات ہوئی کچھ دنوں بعد ساسھی کی ماں کی اچانک بہت زیادہ طبیعت خراب ہو گئی انہیں اسپتال لے جایا گیا ڈاکٹروں کے علاج کے بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی لیکن جب ان کی ٹیسٹ کی رپورٹیں آئیں تو ایک حیران کن خبر سامنے آئی ساسھی کی ماں کو کینسر تھا۔

یہ رپورٹیں دیکھ کر سب پریشان ہو گئے۔ ”یہ کیا ہو گیا سنٹوش۔“ ساسھی روتے ہوئے بولی اس نے چوری چہیے اسلام قبول کر لیا تھا۔

”حوصلہ رکھو ساسھی۔ اوپر والا اچھا کرے گا۔“ سنٹوش نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مم..... مم..... میری ماں.....“ ساسھی نے روتے ہوئے بات اٹھوری چھوڑ دی۔

”کچھ نہیں ہوگا تمہاری ماما۔“ سنٹوش نے یقین سے لاکٹ کی زنجیر میں افقی تھمائی۔

”پر کینسر کا تو کوئی علاج نہیں۔“ ساسھی نے ر

وتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو ساسھی تم ہی مجھے بتا رہی تھی کہ مایوسی گناہ ہے جب سب دروازے بند نظر آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور کھلا ہوتا ہے صرف اسے ڈھونڈنا پڑتا ہے تم نے تو پھر اوپر والے کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے اب اسے ڈھکی نہ چھوڑو بلکہ مضبوطی سے پکڑو وہ ضرور بہتر کرے گا۔“ سنٹوش نے ساسھی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا ویسے بھی ساسھی نے چوری چہیے نماز پڑھنا شروع کر دی تھی۔

اور پھر ایسا ہوا کہ ساسھی کی ماں کی طبیعت سنبھلنا شروع ہو گئی ایک دن عبداللہ بھی ساسھی کی ماں کی خبر لینے آیا۔

”آئی جی کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔“ عبداللہ نے پوچھا۔

”بس ٹھیک ہوں مرنے کے لئے دن گن رہی ہوں۔“ ساسھی کی ماں خشک لہجے میں بولی۔ شاید اسے عبداللہ کا یہاں آنا پسند نہیں آیا تھا۔

”اللہ پر بھروسہ رکھیے آئی وہ آپ کو ضرور ٹھیک کر دے گا۔“ عبداللہ نے ساسھی کی ماں کا خشک رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اب ان باتوں کا کیا فائدہ میری مرتی بٹ ہے

”ساکشی کی ماں کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

”زندگی اور موت آنٹی جی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اللہ پر بھروسہ رکھئے وہ آپ پر اپنی خاص رحمت کرے گا میں آپ کے لئے تم کو کیا ہوا پانی لے کر آیا ہوں، بسم اللہ شریف میں بڑی طاقت ہے، آپ اسے باقاعدگی سے پیتی رہئے گا انشاء اللہ ہر بیماری آپ کے جسم سے نکل جائے گی۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو سرکھٹا نے کوئی جواب نہ دیا عبداللہ نے پانی کی بوتل سرکھٹا کے بیڈ کے ساتھ اونچ نیچل پر رکھ دی عبداللہ سرکھٹا کے کمرے سے باہر نکل آیا ساکشی نے اسے آواز دی..... ”کچھ کھا تو لو۔“

”نہیں پس شکر میں آنٹی کی بیمار داری کے لئے آیا تھا اب میں چلتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”میری ماں کی باتوں کا برا نہ مانا۔“ ساکشی شرمندہ لہجے میں بولی۔

”نہیں نہیں طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انسان چڑچڑا ہوا جاتا ہے۔“

”اس پانی کو کھا کر باہر پھینک دو۔“ ساکشی کمرے میں داخل ہوئی تو سرکھٹا نفرت سے بولی۔

”مئی جی ایسا نہیں کرتے کھڑے آئے مہمان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔“ سنتوش نے سرکھٹا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سنتوش بیٹا ایسے لوگوں سے دوستی نہیں رکھنی چاہئے یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“ سرکھٹا نے اٹا اسے سمجھانا شروع کر دیا۔

”ٹھیک ہے میں نہیں ملتا اس سے آپ یہ پانی ادھر ہی رہنے دیجئے کچھ نہیں کہتا یہ آپ کو۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ رات کا وقت ہوگا جب اچانک سرکھٹا کے سر میں درد شروع ہو گیا اس نے بے اختیار دو دوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا درد اتنا شدید تھا کہ سرکھٹا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سر پھٹ جاتا ہے اس نے دیکھا دواں دم کا درد اڑا رہا یعنی سلسلہ دواں دم میں تھی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ساکشی سرکھٹا کے ساتھ ہی سوئی تھی

اس نے ساکشی کو آواز دینے کے لئے منہ سے آواز نکالی چاہئے مگر اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی سرکھٹا کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے بھر آئے تھے اس نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں تو پاس ہی نیچل پر عبداللہ کی دی ہوئی پانی کی بوتل نظر آئی اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ بوتل اٹھالی اور ڈھلکا کھول کر بوتل منہ سے لگا لی۔

اس پانی کا حلق سے نیچے اترتا تھا کہ درد فوری طور پر غائب ہو گیا۔ سرکھٹا نے بوتل ہونٹوں سے ہٹائی اب سر میں بالکل بھی درد نہیں تھا۔

”ہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“ سرکھٹا نے حیرانگی سے بوتل کو مگھورتے ہوئے کہا۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا پھر اس نے بوتل کا ڈھلکا لگا کر بوتل سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

اسی وقت ساکشی بھی دواں دم سے باہر نکل آئی۔

”اگرے..... آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔“ ساکشی نے حیرانگی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹی میرے سر میں اچانک شدید درد شروع ہو گیا تھا پرتو.....“ سرکھٹا سانس لینے کے لئے رکی۔

”اوہ..... تو..... تو آپ مجھے بلا لیتیں اور یہ بوتل میں پانی کیوں کم ہے۔“ ساکشی ماں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”بیٹی منہ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا پھر میں نے عبداللہ کی دی ہوئی بوتل اٹھالی اور ڈھلکا کھول کر منہ سے لگا لی، پانی کا حلق سے اترتا تھا کہ میرا درد فوری طور پر غائب ہو گیا۔“ سرکھٹا حیرانگی سے بولی۔

”ج.....“ ساکشی دلی دلی خوش سے بولی۔

”ہاں بیٹی یہ پانی تو واقعی بہت فحشٹی شالی ہے۔“ سرکھٹا کے لئے میں حیرانگی شامل تھی۔

”طاقت کیوں نہ ہو اس آخراں پر بسم اللہ پڑھ کر پھونکا گیا تھا۔“ ساکشی دلی دل میں خوش ہوئی۔

پھر آہستہ آہستہ سرکھٹا کی طبیعت سنبھلنے لگی کینسر کا

سننے کے بعد سرکھٹا بیڈ سے جاگتی تھی بسم اللہ کا پانی مسلسل پینے کے بعد اس کی طبیعت اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بھی اچھی ہوگئی تھی اور چلنے پھرنے بھی لگی تھی ادھر سر میں بھی عبداللہ کے اخلاق اور دینی باتوں کا دیوانہ ہو رہا تھا اور پھر جب ساکشی کی ماں کی دوبارہ رپورٹیں آئیں تو ایک حیران کن خبر سنانے آئی سرکھٹا کے جسم میں کینسر بالکل بھی موجود نہیں تھا ڈاکٹر حیران رہ گیا اس نے دوبارہ رپورٹیں کرائیں تو پھر وہی نتیجہ نکلا یہ خبر سن کر سنتوش نے اپنے لاکٹ کو جو ماوراء سرکشی سجدے میں جا کر رہا اور پھر وہ حسین لہجے میں آگیا جب سر میں سرکھٹا کے پاس پہنچا۔

”ماں اور باپوں میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔“ سر میں نے سرکھٹا اور اپنے باپ سے بے محزن کہہ دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم تمہاری عقل تو کھکانے پر ہے۔“ سرکھٹا اور اس کے شوہر غصے سے بولے۔

”میں پورے ہوش و حواس میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔“ سر میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تمہاری موت ماری گئی ہے۔ سانج کیا کہے گا۔“ سر میں کا باپ غصے سے بولا۔

”پتا جی سانج کا تو کام یہی ہے کل ہم جب مرنے کے بعد پورے لے کی عدالت میں کھڑے ہوں گے تو وہاں سانج کا کام نہیں آئے گا بلکہ اسلام کے راستے پر چلنا ہی کام آئے گا۔“ سر میں نے کہا۔

”دھرم سے پھرنے سے ہم ترک (جہنم) میں جائیں گے۔“ ساکشی کی ماں نے بظاہر سنتوش کو گاہ کیا۔

”پرتو بیٹا ذات برداری ہمارا جینا دھرم کروے گی۔“ سرکھٹا نے کہا۔

”تو کیا ہوا ہمیں اور پورے بچائے گا پتا جی اور ماما جی میری بات غور سے سنئے اگر پوری دنیا آپ کو ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہو اور صرف آپ کو عزت دینا چاہتا ہو تو آپ کو عزت ملے گی اور سانج ذلیل و خوار ہوگا۔“ سر میں نے لہجے میں طعنہ مارا کہ بپا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پرتو بیٹا.....“ سر میں کے باپ نے کچھ کہنا چاہا مگر سر میں نے انہیں ٹوک دیا۔

”پرتو کچھ نہیں پتا جی اس حقیقت سے تو آپ بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ موت تو ہر حال میں ملے ہے اور دنیا کی ہر دھرم کی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اوپر والا ایک ہے اور اوپر والے نے تو ہمیں اصل راستہ یعنی اپنا راستہ دیکھا بھی دیا ہے جس کی جتنی جاگتی مثال ماما جی ہیں کینسر جیسا مرض لاعلاج جو کہ اس پانی کے کارن کینسر شری پر سے مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے، پتا جی انسان سانج کے لئے نہیں بلکہ اوپر والے کے لئے جیتا ہے یہ جیون تو دودھ چارون کا مہمان ہے اصل جیون تو مرتیو کے بعد شروع ہوگا اور وہ بھی تب ممکن ہے اگر ہم اس جیون میں کامیاب ہوئے تو۔“

آخراں سر میں اور ساکشی کے ماں باپ کے دل میں حق بات پہنچ گئی اور ماں باپ بیٹے نے ساکشی کی طرح اسلام قبول کر لیا اور جب یہ بات گاؤں پہنچی تو دیواندہ کا فون آگیا کہ سنتوش فوراً گھر پہنچو، سنتوش اپنے سب دوستوں سے ملنے کے بعد اپنے گاؤں کی طرف نکل آیا۔

ادھر ان پکڑے دیال نے زبیر اور کادیری کی شادی بڑے دھوم سے کی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بھائی صاحب کھٹ دیکھا.....“ اچانک ٹکٹ چیکر نے سنتوش کو خاموشی کی بادلوں سے کھینچا تو سنتوش نے پہلے ٹکٹ چیکر کی طرف دیکھا اور پھر ٹکٹ نکال کر دکھادیا سنتوش اب انجلی کے بارے میں سوچنے لگا انجلی تو اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہوئی جاتی اگر وہ لاکٹ وقت پر اسے انفارم نہ کرتا تو وہ حیران تھا کہ صرف بیسیوں کی وجہ سے انجلی نے موت کا اتنا خوف ناک کھیل کھیلا وہ انجلی کے گھر کے ایڈریس پر گیا تھا مگر وہاں سے پتہ چلا کہ وہ انجلی نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی تھی یعنی وہ ایڈریس بھی فرض تھا اس نے انجلی کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

”اگرے کیا ہوا بھئی.....؟“ اچانک بس کو بریک لگی تو سب مسافروں نے چلنا شروع کر دیا۔

”دیکھئے شاتی رکھیئے آگے پولیس کی جیپ ہے وہ بس چپک کرے گی کیونکہ اس روڈ پر آئے دن کوئی نہ کوئی بس لوٹ لی جاتی ہے۔“ کنڈیکٹر کے سمجھانے پر سب





اور بس میں یک دم خاموشی چھا گئی اب چاروں نقاب پوشوں نے مہین داس کی سیٹ کی طرف دیکھا ان میں سے ایک مہین داس کی سیٹ کے قریب آیا۔

”اس سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا وہ کہاں گیا.....؟“ نقاب پوش نے سنستوش سے پوچھا۔

”وہ مہین داس جی۔“ سنستوش نے جان بوجھ کر تصدیق چاہی۔

”ہاں.....“ نقاب پوش ہلکا سا پھر سنبھل کر بولا۔

”جو کوئی بھی قہارہ کہاں ہے۔“

”دو تو بس سے نیچے اتر کر اپنے گاؤں کی طرف چلے گئے تھے۔“ سنستوش نے جھوٹ موٹ کی کہانی سنائی۔

”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ نقاب پوش پریشانی سے بڑبڑایا۔

”جی کچھ کہا آپ نے۔“ سنستوش نے پوچھا۔

”ہوں.....“ نقاب پوش چونکا۔

”نہیں کچھ نہیں۔“

سنستوش نے اس نقاب پوش کی کلائی پر بندھی سونے کی گرہنی دیکھ لی تھی۔

”چلو چلتے ہیں۔“ گھڑی والے نقاب پوش نے اپنے باقی ساتھیوں سے کہا۔ جو یقیناً تھوڑی دیر پہلے بس میں داخل ہونے والا کاشمیل قہارہ چاروں نقاب پوش بس سے اتر گئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ان نقاب پوشوں نے بس کے کسی اور مسافر کو چھوا بھی نہیں اب بس کے بھی مسافر دوا بھری نظروں سے سنستوش کی طرف دیکھ رہے تھے اور سنستوش بے چارہ مسکرانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں اس کے گلے سے وہ لاکٹ اترانا ہوگا.....“ کرے میں موجود سایہ کے منہ سے آواز خارج ہوئی۔

”م..... م..... میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔“

کرے میں موجود آدمی ہلکایا۔

”تمہیں یہ کام کرنا ہوگا ورنہ تمہارا انجام بہت بھیا تک ہوگا۔“

اچانک اس سایہ کے منہ سے غضب ناک آواز نکلی تو وہ آدمی بری طرح کانپنے لگا۔

”م..... م..... میں کوشش کروں گا۔“ وہ آدمی بدستور ہلکاتے ہوئے بولا۔

”کوشش نہیں۔ تمہیں یہ کام ہر حال میں کرنا ہوگا اس سے تمہیں بھی فائدہ ہوگا اور مجھے بھی۔“ سایہ کے منہ سے آواز نکلی۔

”تم خود بھی تو وہ لاکٹ اترنا سکتے ہو حالانکہ تم شقی شالی ہو۔“ اس آدمی نے کہا۔

”نہیں وہ لاکٹ زیادہ شقی شالی ہے..... اگر اس لاکٹ کی موجودگی میں، میں سنستوش کے سامنے آ گیا تو میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔“ سایہ کے منہ سے آواز نکلی۔

”اس سے پہلے بھی میں نے رنگا اور انجلی کے ذریعے اس کے گلے سے لاکٹ اترانا چاہا پر تو اس نے ان دونوں کو ٹپ لاکٹ دے دیا تھا۔“

”اگر تم سے یہ کام نہیں ہو سکا تو میں یہ کام کیسے کروں گا۔“ اس آدمی نے پوچھا تھا۔

”تمہارے لئے آسان ہے کیونکہ تم ایک انسان ہو اور میں.....“ سایہ نے حسرت زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑی۔

”ٹھیک ہے میں یہ کام کروں گا۔“ آخر کار وہ آدمی رضامند ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سنستوش کے آنے سے دیا بند اور آگنی بہت خوش نظر آ رہے تھے انہوں نے خوشی سے سنستوش کا استقبال کیا۔

”بیٹا اب تم گاؤں میں موجود ہماری زمینوں کو سنبھال لو۔“ دیا بند نے کہا۔

”آپ بھی بڑے عجیب آدمی ہیں ابھی میرے سپیڈ کوسٹس لینے دو آتے ہی کام کی باتیں شروع کر دیں۔“ سنستوش کی ماں نے منہ بناتے ہوئے کہا تو سنستوش اور دیا بند بے اختیار مسکرا دیے۔

”ارے ابھی میں تو سمجھا رہا تھا۔“ دیا بند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... بعد میں سمجھائیے گا۔“ راگنی نے غصے سے کہا تو بے اختیار ایک مرتبہ پھر باپ بیٹا نس پڑے اور پھر کا سی رام مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا دونوں دوست مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

”آگنی تجھے گاؤں کی یاد۔“ رام معنوی غصے سے بولا۔

”مجھے نہیں بلکہ گاؤں کو میری یاد آتی تھی سو میں چلا آیا۔“ سنستوش نے کہا تو رام نس پڑا رام نے دیا بند اور آگنی کے پاؤں چھوئے دونوں نے اسے پیلا دیا۔

”تمہاری ٹانگ کیسی ہے اب۔“ سنستوش نے پوچھا۔

”تمہارا دیا ہوا رخ تھا بھی..... تھوڑی بہت تو کسر ڈی تھی ناں۔“ رام نے مسکراتے ہوئے کہا تو سنستوش بھی مسکرا دیا۔

”ویسے سنستوش میری سمجھ سے باہر ہے کسا خر تمہیں اس دن ہوا کیا تھا۔“ رام حیرانگی سے بولا۔

”چھوڑ پرانی باتوں کو یہ بتا کر اب تو کیا کرتا ہے۔“ سنستوش نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”میں بتائی کے ساتھ ہوتا ہوں۔“ رام نے بتایا۔

”بس تو پھر تمہارے پتائی کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔“ سنستوش نے کہا تو رام کے علاوہ دیا بند اور آگنی دونوں نس پڑے۔

”جی نہیں..... جب سے پتائی کے کام میں، میں نے ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے تو کام دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔“ رام منہ بناتے ہوئے کہا۔

”تیرا وہم ہوگا۔“ سنستوش نے کہا۔

”وہم..... نہیں تو۔“ رام اپنی ہی دھن میں کہہ گیا اور مجبوراً پھر تیشوں کے قہقہے سننے پڑے۔

”انگل آئی آپ بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں.....“ رام نے بچوں کی طرح منہ بناتے ہوئے کہا تو پھر قہقہوں کی برسات ہوئی۔

”چل اب باتیں چھوڑو اور کھانا کھا لے۔“

سنستوش نے کہا تو رام نے اثبات میں سر ہلا دیا دونوں گھر

سے باہر نکل آئے۔

”میرے گھر چل.....“ رام نے کہا تو سنستوش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رام کے ماں باپ سے ملنے کے بعد دونوں کمرے میں آئے۔

”اور سناؤ شہر والوں کا کیا حال ہے۔“ رام نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ سنستوش نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آ خر تو وہاں گیا تھا کسی نہ کسی کو سکھت میں ڈالا ہوگا ناں.....“ رام نے کہا تو سنستوش بے اختیار مسکرا دیا۔

”نہیں نہیں وہاں کچھ نہیں کیا میں نے۔“ سنستوش نے ہستے ہوئے کہا۔

”یہ تو خیر نہیں سکتا۔ بچپن میں یاد ہے جب تو مجھے قبرستان میں لے گیا تھا۔“ رام نے کہتے ہوئے سنستوش کو یاد دلایا۔

”ہاں، ہاں یاد ہے جب تو پیٹھاب کے کارن کسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔“ سنستوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے تجھے منع بھی کیا تھا پر تو تومانا ہی نہیں اور وہ دن بھی یاد ہوگا جب گاؤں میں دوا بھسی آدمی آئے تھے۔“ رام نے سنستوش کو مزید یاد دلایا۔

بالکل یاد ہے ان اجنبیوں کا پاس رنگا تھا جو حوالات سے پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اسپیکر دیال نے غصے کے کارن اس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا اس نے تو اسپیکر دیال سے انتقام لینے کے لئے بہت گناہنا کھیل کھیلایا تھا پر تو اوپر والے نے خیر کی اور سبیا حل ہو گئی۔“ سنستوش نے کہا۔

”یار میں نے ایک اور عجیب بات سنی ہے۔“ رام نے کہا تو سنستوش نے سوالیہ نگاہوں سے رام کی طرف دیکھا۔

”تیرے ماما اور امی نے اپنا دھرم کیوں بدل لیا وہ مسلمانوں ہو گئے ہیں۔“

”تو کیا ہوا..... انہیں سیدی راہ نظر آئی تو انہوں

نے اختیار کر لی۔ "سنتوش نے کندھے اچکائے۔  
 "میرا دماغ ٹھیک ہے کہ اسے تو سیدھی راہ کہہ رہا ہے۔" رام کا لہجہ آگے سے بھر پور تھا۔  
 "تو دھرم کے بارے میں کیا جانتا ہے؟" سنتوش نے پوچھا۔  
 "زیادہ کچھ نہیں۔" رام نے بتایا۔  
 "تو پھر چپ رہ کیونکہ تجھے تو اصل میں دھرم کے بارے میں جانکاری ہی نہیں ہے تو تجھے سمجھانے کا کیا فائدہ؟" سنتوش نے پیچیدہ لہجے میں کہا۔  
 "میں سمجھتا بھی نہیں چاہتا پر تو یہ غلط ہے جو تم تک پہنچتا ہے۔" رام نے منہ بناتے ہوئے کہا۔  
 "غلط صحیح کی پہچان پر کھنے سے ہوتی ہے انہوں نے پرکھا دیکھا اور سمجھا پھر انہوں نے اسلام قبول کر لیا میرے خیال سے تو ان کا فیصلہ بالکل صحیح ہے کیونکہ انسان کو پورا پورا حق ہے وہ اپنے دھرم کی جانچ کرے اسے سمجھے جو بات انہیں انہی لگے وہ اپنائے۔" سنتوش نے صاف اور سیدھی بات کی۔  
 "تو پھر تو نے دھرم کیوں نہیں بدلا۔" رام نے طنز یہ لہجے میں کہا۔  
 "یہ تو اوپر والے کے نیچے ہیں دیکھتے ہیں وہ ہم پر کب کر پا کرتا ہے۔" سنتوش نے اوپر کی جانب نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔  
 "کیسی عجیب اور بے لگائی باتیں کر رہا ہے تو۔۔۔۔۔"  
 رام کو خفا آ گیا۔  
 "بے لگائی نہیں حقیقی باتیں کر رہا ہوں میں۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "چل چھوڑاں باتوں کو۔ تجھے ایک نیو نیوز ملی۔" رام نے سنتوش کی توجہ دوسرے موضوع کی طرف مبذول کی۔  
 "کون سی نیوز؟" سنتوش چونکا۔  
 "تمہارے گھر وہ چوکیدار تھا ناں۔۔۔۔۔" رام نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 "ہاں ہاں۔۔۔۔۔ عبد اللہ انکل۔" سنتوش نے متوجہ ہونے ہوئے کہا۔

"اس کا تو کئی سال پہلے دیہانت ہو گیا تھا۔" رام نے عجیب خبر سنائی۔  
 "اوہ۔۔۔۔۔" دکھ کے باعث سنتوش کے منہ سے نکلا اور اس کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔  
 "لوئے۔۔۔۔۔ تجھے کیا ہوا۔۔۔۔۔؟" رام حیران ہوا۔  
 "یہ تو نہیں سمجھے گا۔" سنتوش لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔  
 "اس کی بیٹی ہے خدیجہ جو کہ بہت سندرباری ہے۔۔۔۔۔ میں نے پوری دھرتی پر اتنی سندرباری نہیں دیکھی اگر وہ میرے دھرم کی ہوتی ناں تو میں کب کا اسے اپنی پتی بنا چکا ہوتا۔" رام نے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 "شرم کرو۔۔۔۔۔ عورت چاہے کسی بھی دھرم کی ہو یا نہ ہو اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔" سنتوش نے فحش سے کہا اور اٹھ کر اپنی دروازے کی طرف بڑھ گیا اسے رام کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی رام اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ مگر اس نے رام کی ایک نہ سنی۔  
 ☆.....☆.....☆  
 سنتوش نے لکڑی کے اس ٹوٹے پھوٹے دروازے پر نگاہ ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔  
 "کون۔۔۔۔۔؟" تھوڑی دیر بعد اندر سے پوچھا گیا وہ نسوانی آواز تھی جس نے سنتوش کے کانوں میں رس گھولا۔  
 "وہ۔۔۔۔۔ وہ جی یہ عبد اللہ انکل کا گھر ہے ناں۔۔۔۔۔" سنتوش نے بظاہر تصدیق چاہی۔  
 "جی ہاں۔۔۔۔۔" اندر سے پھر وہی خوب صورت آواز آئی۔  
 "میں دیانند کا بیٹا ہوں اور انکل عبد اللہ کی پتی سے ملنا چاہتا ہوں عبد اللہ انکل ہمارے ہاں ہی کام کرتے تھے۔" سنتوش نے بتایا۔  
 "آپ سنتوش ہیں ناں۔" اندر سے تھوڑے وقت کے بعد مسکراتی آواز سنتوش کے کانوں سے نکل گئی۔  
 "ابو جی گھر میں زیادہ تر آپ کا ہی ذکر کرتے تھے آپ کی بہت سی باتوں کا ذکر وہ مجھ سے اور امی جان سے کیا

کرتے تھے زندگی کے آخری لمحوں میں انہیں آپ سے ملنے کی بے حد خواہش تھی لیکن۔۔۔۔۔ اندر سے افسوس زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑی گئی۔  
 "پر تو انکل مجھے خبر تو کرتے۔۔۔۔۔" سنتوش کا لہجہ بظاہر شکایتی تھا کیونکہ اسے بھی اس بات کا دکھ تھا کہ وہ عبد اللہ سے مل نہ سکا۔  
 "۔۔۔۔۔ آپ کے والد صاحب کو خبر کی تو تھی مگر۔۔۔۔۔ نہیں انہوں نے آپ کو اطلاع کیوں نہیں کی۔" اندر سے حیرانی سے بھر پور آواز آئی۔  
 "اوہ۔۔۔۔۔ پتا جی۔۔۔۔۔" سنتوش نے گہری سانس کھینچی وہ سمجھ گیا تھا کہ دیانند نے اسے کیوں خبر نہیں کی کیونکہ وہ عبد اللہ کے خلاف تھے۔  
 "خیر آپ مجھے اندر آئے تو نہیں کہیں گی کیا۔۔۔۔۔؟"  
 "اوہ۔۔۔۔۔ معاف کیجیے گا میں بھی بڑی بے وقوف لڑکی ہوں۔ آپ اندر آئیے۔" ساتھ ہی وہ لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ مزید کھل گیا اور سنتوش اندر داخل ہوا اندر مکان کی حالت کافی خستہ حال تھی سنتوش نے دیکھا دروازے کے پیچھے لمبے قد اور بھرے جسم کی لڑکی کھڑی تھی اس نے اپنے دوپٹے سے چہرے پر نقاب کیا ہوا تھا لیکن اس کی جھلک جیسی خوب صورت آنکھیں نقاب کی قید سے آزاد تھیں آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی کہ نظر بنانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔  
 "آئی کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟" سنتوش اس کی آنکھوں میں کھوتے ہوئے بولا۔  
 "دوسرے کمرے میں۔" خدیجہ نے اپنے خوب صورت ہاتھ سے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سنتوش دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔  
 "گھر کا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔" سنتوش نے پوچھا۔  
 "گزارہ۔۔۔۔۔ وہی کرتا ہے جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں اس سے ابھی پہلی گز رہی ہوئی ہے۔" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔  
 "گھر کی حالت بھی کافی خراب ہے۔" سنتوش

نے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔  
 "گھر۔۔۔۔۔ مہینے کے لئے چمت موجود ہواں سے بڑا اور کیا کرم ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا۔۔۔۔۔ ویسے ہی کریم نے فرمایا۔" دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے انسان سفر میں ہو اور کچھ دیر کے لئے قیام و طعام کرتا ہے قیام و طعام دنیا ہے اصل زندگی تو آخرت ہے اگر ہم اس زندگی میں آسائش ڈھونڈتے رہے تو دوسری اور اصل زندگی میں ہمارا کچھ حصہ نہیں ہوگا۔" خدیجہ نے کہا تو سنتوش نے اس کی بات سے اتفاق کیا وہ دونوں اب کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔  
 کمرے میں ایک بوڑھی عورت چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی جو سنتوش کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
 "السلام و علیکم۔۔۔۔۔" سنتوش نے عبد اللہ چوکیدار کی بیوی زبیدہ کو سلام کیا۔  
 "وعلیک السلام۔۔۔۔۔" زبیدہ نے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ سنتوش زبیدہ کی چار پائی پر بیٹھ گیا۔  
 "اباں جی کسی ہیں آپ۔" سنتوش نے پوچھا۔  
 "اللہ کا بڑا کرم ہے بیٹا۔" زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "سچا ناں مجھے آپ نے۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
 "نہیں۔۔۔۔۔ ویسے بھی اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں نظر ٹھیک طرح کام نہیں کرتی ہے۔" زبیدہ نے کہا۔  
 "میں سنتوش ہوں بیویانند کا بیٹا۔" سنتوش نے اپنا تعارف کرایا۔  
 "تو تو جوان ہو گیا ہے چھوٹا سا تھا جب یہاں آتا تھا اللہ بخشے خدیجہ کے الو آخری لمحوں میں تجھے بڑا یاد کرتے تھے میں تمہارے گھر کئی مرتبہ گئی مگر تمہارے والد نے مجھے ہر مرتبہ جھڑک دیا۔" زبیدہ نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔  
 "میں پتا جی سے جاکر پوچھوں گا۔" سنتوش نے کہا اتنی دیر میں خدیجہ پانی کا گلاس لے آئی اس کے چہرے پر اب بھی نقاب تھا، سنتوش نے پانی پیا اور خالی



گلاس خدیجہ کو پکڑا دیا جسے لے کر وہ باہر نکل گئی تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک ادیب عمر عورت تھی جسے جگہ ماسی تاجو کے نام سے پکارا تھا۔

”اے سنٹوش آیا ہے“ ماسی تاجو نے آگے بڑھ کر سنٹوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا سنٹوش کو بزرگوں کی یہ عادت بہت پسند تھی۔

”بڑے عرصہ بعد آیا ہے تو۔۔۔“ ماسی تاجو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ماسی۔۔۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد آیا ہوں۔“ سنٹوش نے جواب دیا۔

”تو پڑھ میں ہی کوئی کام وام کر لیا تھا۔“ ماسی تاجو نے بظاہر مشورہ دیا۔

”ماسی میرے لئے کام تو بھی بہت ہے اپنے پرکھوں کی زمین سنبھالوں گا اور ایسے بھی انسان کی اصل بھوک دو سے کی روٹی ہے۔“ سنٹوش نے کہا۔

”ماشاء اللہ بڑی اچھی سوچ ہے پڑھا تھا۔ تو یہ ساتھ والی کتارے کی بیوی ہے ہاں پر تو مشکل وقت میں مجھ سے تین ہزار روپے لوہا لئے تھی میرا بیٹا بڑا پیار ہے جلدی واپس کر دوں گی مجھے ترس آ گیا میں نے دے دیا چار پانچ مہینے ہو گئے ہیں اس بات کو لیکن ابھی تک واپس نہیں کئے دیے بھی ان غیر مذہبیوں پر بھلائی کرنی ہی نہیں چاہئے۔“ ماسی تاجو غصے سے بولی۔

”کوئی احسان کا بدلہ دیتا ہے نہیں۔“

”ماسی انسان پر احسان کیوں کیا جاتا ہے۔“ ایک طرف بیٹھی خدیجہ نے پوچھا۔

”اللہ کا حکم ہے خدیجہ پڑھ اور ایسے بھی اللہ احسان کی مدد انسان کے ذریعے ہی پوری کرتا ہے۔“ ماسی تاجو نے پیار سے جواب دیا۔

”یعنی صرف اللہ کو خوش کرنے کے لئے۔۔۔؟“

خدیجہ نے سوالیہ نگاہوں سے ماسی تاجو کی طرف دیکھا۔

”بالکل پتہ۔۔۔“ ماسی تاجو نے جواب دیا۔

”تو پھر اس احسان کا بدلہ بھی اللہ سے ہی مانگنا چاہئے کیونکہ احسان کا بدلہ اللہ دیتا ہے اگر احسان کا بدلہ

انسان ہی دے دے تو پھر اللہ کو کون یاد کرے گا اسی لئے ہم جب بھی کسی پر احسان کریں تو نیت یہ رکھنی چاہئے کہ اللہ اس کا اجر دے گا اور آخرت میں بھی ہمیں اس کا اجر دے گا جو ہماری اصل زندگی ہے یہ زندگی تو ماسی ہماری نجانے کب ختم ہو جانی ہے اس لئے اس زندگی کو چھوڑ کر ہمیں اصل زندگی کی بھگا دوڑ میں لگنا چاہئے اور احسان صرف اپنے لوگوں (مذہب والے) پر ہی نہیں بلکہ غیر مذہبیوں پر بھی کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو یہ دیکھ کر رزق نہیں دیتا کہ وہ اللہ کا نام لیتا ہے کہ نہیں وہ صرف رزق دیتا ہے اسی لئے دنیا کا ہر انسان چاہے وہ مسلمان ہو چاہے ہندو سکھ ہو یا کوئی اور سب ہی جانتے ہیں کہ اللہ ایک ہے لیکن محض اپنی انا کی خاطر اپنے بزرگوں کی خاطر بتوں اور انسانوں کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں آپ نے کتارے کی بیوی کو پیسے دیئے ہیں ناں کل وہ اپنے مذہب کی کئی عورتوں سے اس بات کا تذکرہ کرے گی کہ ماسی تاجو نے غیر دھرم کی ہونے کے باوجود میری مدد کی شاید آپ کے اس احسان کی وجہ سے کوئی غیر مذہب والا شاید مذہب والا بن جائے ہمارے نبی بھی تو غیر مذہب والوں پر بہرمان تھے اور ان کی عادات اور اخلاق کی وجہ سے لوگ روٹی میں داخل ہوئے ہمیں اسی لئے ہمارا طور طریقہ ہمارے نبی کریم جیسا ہونا چاہئے میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اپنے پیسے بھول جائیے لیکن جب آپ کو ان پیسوں کی اشد اور سخت ضرورت ہوگی تب آپ کو یہ پیسے لازماً مل جائیں گے اور وہ اللہ دے گا۔“ خدیجہ نے اپنی آسمان کی طرف اٹھائی۔

”واہ۔۔۔“ بے اختیار سنٹوش کے منہ سے نکلا۔

”آپ تو واقعی عبداللہ بالکل کی بیٹی ہیں۔“

سنٹوش نے خدیجہ کی آنکھوں سے اندازہ لگا دیا وہ مسکرا رہی تھی نقاب ابھی بھی اس کے چہرے پر موجود تھا اور سنٹوش کو اس بات کی تسکین تھی کہ وہ خدیجہ کا چہرہ دیکھے مگر وہ یہ بات منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

سنٹوش گھر پہنچا تو اس کے والد دیناند کہیں نکلنے کے لئے تیار تھے۔

”پتائی آپ کہاں جا رہے ہیں۔“ سنٹوش نے

پوچھا۔

”اپنی زمینوں کی طرف جا رہا ہوں۔“ جواباً دیناند مسکراتے۔

”میں بھی چلوں۔“ سنٹوش نے بظاہر اجازت چاہی۔

”کیوں نہیں بیٹا۔۔۔ آخر کل کو تم نے ہی تو سارا کچھ سنبھالا ہے۔“

دیناند نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواباً سنٹوش بھی مسکرایا وہ اپنی زمینوں پر پہنچے تو تاحند نگاہ زمینوں کی ہریالی بھیلی ہوئی تھی سنٹوش نے دیکھا ایک طرف ان کے کھیتوں میں احمد دین مل چلا رہا تھا دھوپ کی وجہ سے اس کا برا حال تھا وہ ایک ضعیف آدمی تھا اور پسینے کی وجہ سے اس کا برا حال تھا دھوپ کی تیز شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

راما نند بار بار اس پر چلا رہا تھا۔

”انکل جی انکل احمد دین کب سے مل چلا رہے ہیں۔“

”سنٹوش پتہ صبح کالا گلا ہے۔“ رامو نے احترام سے جواب دیا۔

”اور انہیں آرام کرنے کا سے دیا کہ نہیں۔“ سنٹوش نے پوچھا۔

”آرام۔۔۔“ رامو حیران ہوا۔ ”آرام کا ہے کا سنٹوش پتہ۔“

”ہاں بیٹا۔۔۔ آرام کس لئے ہم تو کام کے پیسے دیتے ہیں آرام کے نہیں۔ وہ اچھوت ہے۔“ دیناند خشک لہجے میں بولا۔

”پتائی یہ بات تو بالکل غلط ہے۔“ سنٹوش دھکی لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟ تم مجھے غلط کہہ رہے ہو۔“ دیناند زوراً سخت لہجے میں بولا۔

”میں آپ کو نہیں پتائی آپ کے دھاروں کو غلط کہہ رہا ہوں اور انہوں رامو صاحب کے دھار بھی یہی ہیں۔“ سنٹوش افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”وہ کیسے؟“ دیناند نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”اب آپ ہی دیکھئے احمد دین کی محنت سے جو فصل تیار ہوئی ہے وہ دلاکھوں میں کیگی۔ اور ساری حقاً اس فصل سے فائدہ حاصل کرے گی یعنی اس ایک مزدور کے کارن کتنے فائدے ہوں گے اور ہم اس کی محنت کا خیال نہیں رکھیں گے تو وہ بیمار پڑ جائے گا اور ہمارے کام کا کتنا نقصان ہوگا۔۔۔۔۔“

”جب وہ ہمارا اتنا خیال کرتا ہے تو ہمارا کرتیو بنتا ہے کہ اس کا خیال کریں اسے تھوڑا بہت آرام کرنے کا موقع دیں مٹین بھی جب زیادہ چلتی ہے تو ہمیں اس کی بھی ٹیوننگ کروانا پڑتی ہے اگر ہم اس کی ٹیوننگ کرواتے رہیں گے تو وہ ٹھیک کام کرے گی ورنہ وہ بھی ایک دن خراب ہو جائے گی اسی طرح انسان بھی کام کے دوران اگر کچھ سے کے لئے ریٹ کرے اپنا پیٹ بھرے تو وہ باقی کام اچھے طریقے سے کر سکتا ہے اور ایسے بھی اگر ہم مزدور کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو وہ ہمارے پاس زیادہ سے کام کرے گا اور اگر ہمارا برتاؤ اچھا نہیں ہوگا تو ہم بھی اچھا مزدور نہیں رکھ سکیں گے آخر کار مزدور بھی تو ہماری طرح کا ایک انسان ہے اگر ہم ایک منٹ کے لئے اس دھار کو ذہن میں لائیں کہ اگر کوئی ہم میں سے احمد دین کی جگہ ہوتا تو احمد دین ہماری جگہ ہوتا اور وہ ہم سے ایسا برتاؤ کرتا جو ہم اس کے ساتھ کر رہے ہیں تو ہمارے دل پر کیا گزرتی اس دھار کے کارن ہمیں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو احمد دین کا خیال رکھنا چاہئے۔“ سنٹوش نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سنٹوش بابو تم ان تکبیروں میں نہ ہی پڑو اچھا ہے وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں ہر چیز کی سمجھ آ جائے گی۔“ رام دین نے بظاہر سنٹوش کو سمجھایا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں تین افراد بیٹھے تھے ایک ضعیف بوڑھا تھا جس کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے نہایانہ ہو اس کے جسم سے اتنی تیز اور گندمی بدبو نکل رہی تھی کہ سامنے بیٹھی دونوں عورتوں کا برا حال تھا لیکن وہ دونوں اس ضعیف کے

سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہوئی تھیں اور اس بوڑھے کی ہوس بھری نگاہیں ان عورتوں میں سے جوان عورت پر لگی ہوئی تھیں اور وہ عورت اس بات کو صاف محسوس کر رہی تھی اور کبھی کبھی اس بوڑھے کی طرف نظریں چرا کر دیکھ بھی لیا کرتی تھی۔

”ہاں بول لی لی..... کنیا کو کیا کشش ہے.....“ آخر کار اس بوڑھے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”باباجی میری بہو کے ہاں اولاد نہیں ہے اگر آپ کی کرپا ہو جائے تو..... ان دونوں عورتوں میں سے بوڑھی عورت کو رکھ لیتے ہوئے بولی۔

”کیا نام ہے اس کنیا کا.....؟“ بوڑھے نے اپنی غیبٹ دکھا دی اس نو جوان عورت پر گڑھڑتے ہوئے کہا۔

”جی سندری.....“ بوڑھی عورت نے بتایا۔

”اپنے نام کی طرح سندری.....“ بوڑھا بڑبڑایا۔

”اولاد تو اسے مل جائے گی پر تو تیری بہو کو روزانہ رات کے سے یہاں آنا ہوگا.....“ غیبٹ بوڑھے نے شیطانی نگاہوں سے سندری کے سر یا پر نظر ڈالی اور سندری اسے شے سے گھورنے لگی لیکن بوڑھے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ طاری رہی۔

”پپ..... پردات کے سے“ پریشانی کے باعث سندری کی ساس کے منہ سے نکلا۔

”مورکھ عورت میں چندہ رات تک اس پر منتز پرہوں گا وہ بری آتما نہیں جو اس کی اولاد میں رکاوٹ بن رہی ہیں میں انہیں اس سے دور بھاگوں گا بہت کچھ کرنا پڑے گا مجھے جب کہیں جا کر اس کے ہاں خوب صورت اولاد جنم لے گی.....“ غیبٹ بوڑھا یکدم بھڑکتے ہوئے بولا

اور سندری اور اس کی ساس یکدم ہنسن گئیں۔

”پر تو اس کا بچہ نہیں مانے گا.....“ سندری کی ساس پریشان کن لہجے میں بولی۔

”جی..... مورکھ بڑھیا اگر تیرے سپنڈر کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو وہ سندری کی جگہ ایک اور بھتی لے آئے گا.....“ بوڑھے نے کن انہیں سے سندری کی طرف دیکھا اور سندری کے چہرے پر یکدم پریشانی نے دبیرہ کر لیا۔

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا.....“ سندری کی ساس کو شاید بوڑھے کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

”جب زمین بخر ہو جائے اور کسان کی بار بار کوششوں کے باوجود زمین بھل نہ دے تو کسان اس زمین کو بچ کر بی زمین خرید لیتا ہے.....“ بوڑھے نے بدستور سندری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری بات تو شاید کبھی نہیں جب سندری کے ہاں کوئی ستان ہی نہیں ہوگی تو آخر کار وہ اسے چھوڑ دے گا، نادان مت بن اور سندری کو روزانہ میرے پاس بھیج کر پامی کرپا رہی تو ایک دن ضرور سندری کی گود چری ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے باباجی میں آج سے ہی سندری کو آپ کے پاس بھیج دیا کروں گی.....“ یعنی سندری کی ساس نے ہار ماننے ہوئے کہا تو غیبٹ بوڑھے کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نے دبیرہ کر لیا تھوڑی دیر بعد دونوں ساس بہو انہیں اور بوڑھے کی چھوٹی بڑی سے باہر نکل آئیں۔

سنتوش بھی اسی طرف آ رہا تھا۔ ”ارے سنتوش بیٹا تو.....“ سندری کی ساس بیارے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”جی ماسی میں.....“ جوابا سنتوش مسکرایا۔

”سب آیا گاؤں میں.....“ سندری کی ساس نے پوچھا۔

”دو چار دن ہی ہوئے ہیں.....“ جوابا سنتوش نے بتایا۔

”ماسی کدھر سے آ رہی ہو.....“

”میں باباجی کے پاس گئی تھی.....“ سندری کی ساس نے بتایا۔

”خیر تو ہے ماسی.....“ سنتوش نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا..... یہ ہندری بھتی کو چار سال ہو گئے ہیں شادی کو پر تو گودھونی ہے.....“ باباجی سے یہی کہنے آئی تھی۔

”سندری کی ساس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

”تو باباجی لوگوں کو ستان دیتے ہیں.....“ سنتوش نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں بیٹا بڑی بچھی ہوئی ہستی ہیں باباجی.....“ سندری کی اس نے کہا۔

”پر تو یہ اختیار تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اسی.....“ سنتوش نے سندری کی ساس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی بھگوان کے بچاری زمین پر ہوتے ہیں ناں بھی بھگوان کا روپ ہی ہوتے ہیں ان میں بھی بھگوان کی لکھیاں ہوتی ہیں وہ بھی ہر کام کر سکتے ہیں.....“ سندری کی ساس نے کہا۔

”میں ماسی پہلی بات یہ کہ ہم سب میں غلط لکھیاں ہیں کہ انسان بھی اوپر والے جیسا کام کر سکتے ہیں یہ بات بالکل غلط ہے۔ ماسی اوپر والے کا تو انداز ہی نرالا ہے دینے کی شکتی لینے کی شکتی یہ اوپر والے کا اختیار ہے انسان جتنا مرضی پٹنے کا کام کر لے وہ کسی کو نہ ہی جان دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کی جان لے سکتا ہے۔ آنے والے کل کے بارے میں بھی سوائے اوپر والے کے کوئی نہیں جان سکتا، ہمارے ہر نفع نقصان کا مالک اوپر والا ہے ماسی نفع تو ہمیں وہ دیتا ہے پر تو نقصان ہم اپنی غلطیوں سے اٹھاتے ہیں پر تو اوپر والا ہم سے اتنا پرہیز کرتا ہے کہ وہ ہمیں نقصان میں بھی نفع دے دیتا ہے پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ یہ فائدہ تو ہم نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے پر تو یہ اوپر والے کی طرف سے ہی ہوتا ہے اسی طرح ماں کے پیٹ میں بھی وہی نئی جان پیدا کرتا ہے انسان سے نہیں بلکہ اگر آپ اوپر والے سے سچے دل سے مانگیں گے تو وہ آپ کو بہتر دے گا.....“ سنتوش نے بتایا۔

”پر تو بیٹا سنتوش کے تو کوئی ستیان نہ تھی وہ ستان لکھی کے کارن ہوئی گی.....“ سندری کی ساس نے کہا۔

”یہ پردہ بھی میں جلد ہی گاؤں والوں کی انہوں سے بھاؤں گا.....“ سنتوش نے کسی خیال کے ساتھ کہا۔

”چنگا پتر میں چلتی ہوں مگر میں روٹی ہاڑی کا

بھی کچھ کرتا ہے۔“ سندری کی ساس نے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور سندری اور اس کی ساس اپنے گھر کی طرف بڑھ گئیں جبکہ سنتوش اس غیبٹ بوڑھے کی چھوٹی بڑی میں داخل ہو گیا۔

گھر پہنچنے پر سندری نے اپنا چولہا سنبھال لیا چولہے پر ہاڑی رکھنے کے بعد وہ روٹیاں پکانے لگی۔

”سندری بولنے سے بات نہ کرنا آدمی رات کے سے باباجی کے پاس چلی جانا.....“ چارپائی پر بیٹھی اس کی ساس نے کہا۔

”اماں میرا من بہت گھبرا رہا ہے.....“ سندری نے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔

”کیوں ری۔ تیرا دل کیوں گھبرا رہا ہے.....“ سندری کی ساس سخت لہجے میں بولی۔

”اس بوڑھے کی آنکھوں میں مجھے ہوس نظر آ رہی تھی اماں.....“ سندری نے ڈرتے ڈرتے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”اری..... نادان کچھ تو بھگوان کا خوف کر باباجی کو برا کہہ رہی ہے وہ تجھے ایسی بات پر جلا کر کسم کر دیں گے.....“ سندری کی ساس یکدم بھڑک اٹھی۔

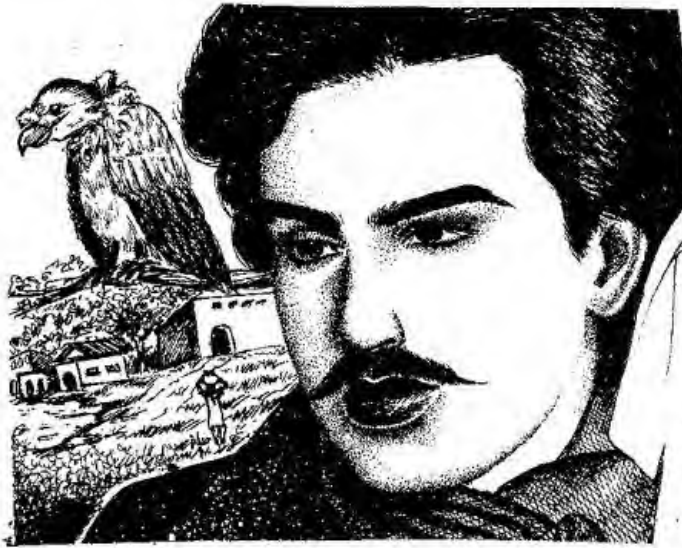
”نہیں اماں ہم لوگ یہی تو نہیں سمجھتے.....“ سنتوش کا کہنا ٹھیک ہے ستان کا مالک تو اوپر والا ہے.....“ سندری دھکی لہجے میں بولی۔

”تو پھر تیری کوکھ کیوں خالی ہے ہر مندر میں جا کے اتھا بیٹتی ہے میں مانگتی ہے پھر بھی تو بانجھ کی بانجھ ہے.....“ سندری کی ساس اسے طعنہ دیتے ہوئے بولی۔

”اماں اس میں بھی کوئی نہ کوئی باتر ہوگی خدیجہ کہتی ہے اوپر والے کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے ہر چیز کا ایک سے ہوتا ہے اوپر والے کے کام میں دیر ہے اندھیر نہیں وہ گہرے اندھیرے کے بعد ایک خوب صورت اجالا پیدا کرتا ہے.....“ سندری نے کہا۔

یہ سن کر سندری کی ساس نے اپنا فیصلہ سنایا اور بے بس سندری خاموش ہو گئی۔

شام کو وہ خدیجہ سے ملنے گئی۔ ”کیا بات ہے



## بھلائی کا صلہ

گلاب خان سولنگی - نوشہرہ فیروز

پورے جسم پر لرزہ طاری تھا اور اندھیرے نے ہر سو اپنا راج قائم کر رکھا تھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ اپنے ارد گرد سے بے خبر بیٹھے تھے کہ اتنے میں.....

رات کے گھناؤپ اندھیرے میں ختم لینے والی عجیب و غریب خیر انگیز اور حیرت انگیز کہانی

**ہمارے** گاؤں سے شہر 8 کلومیٹر دور تھا۔ ایک صحت و ڈگری ہونے کے باوجود نوکری بھی ہم سے نہیں دوڑتی تھی مجبوراً دوسرے گاؤں والوں کی طرح میں شہر والی فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا۔ لیکن ہماری رات کو شروع ہوتی تھی اس لئے سرشام ہی میں اس سے کوچ کر جاتا تھا۔ کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی تھی پبلک ٹرانسپورٹ کا نہ ہونا اور خطرناک جنگل۔ لیکن بہت کی آگ بجھانے کے لئے ہم غریب مزدور کسی جنگلی جانور یا ڈاکوؤں کی پرواہ کئے بغیر بلا ناغہ فیکٹری میں حاضری دیتے تھے جس سے گھر کا چولہا جلتا تھا۔ فیکٹری کے افراد تعداد میں تو ماشاء اللہ کثرت میں تھے لیکن کمانے کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر تھی، بھائی بہنوں کی تو فوج تھی اوپر سے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا بھی میں ہی تھا۔

سندری آج بڑی اداس نظر آ رہی ہو۔“ خدیجہ نے سندری کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”نہیں کچھ نہیں۔“ سندری نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے میری سہیلی پریشان ہو اور مجھے پتہ ہی نہ چلے۔“ خدیجہ نے سندری کے گالوں میں چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔  
”بس خدیجہ کیا بتاؤں سناں کی کلینا مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔“ سندری نے مگر مندانہ لہجے میں کہا۔

”ارے تو اس میں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے اولاد تو تجھے تب ہی ملے گی ناں..... جب اس کا وقت ہوگا۔“ خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ وقت کب آئے گا۔“ سندری نے اکتائے ہوئے لہجے میں لفظ ”کب“ کو لہا کرتے ہوئے کہا۔  
”تجھے اتنی جلدی کیوں ہے اولاد کی۔“ خدیجہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”مجھے چار سال ہو گئے ہیں میرا بیاہ ہوئے اور تو کہہ رہی ہے مجھے سناں کی کیوں چھتا ہے..... میری ساس مجھے بانجھ پن کے طعنے دیتی رہتی ہے، پتی سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور تو کہہ رہی ہے مجھے اولاد کی کیا جلدی ہے۔“ سندری نے غصے سے کہا۔

”ارے..... ارے..... تم تو ناراض ہو گئی..... میں تو تمہیں صرف خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہی تھی۔“ خدیجہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
”تمہارے کہنے سے تو میں خوش ہو جاؤں گی پر تو میری ساس اور میرا پتی تو تب خوش ہوں گے ناں جب میرے سناں ہوگی۔“ سندری دھکی دھکی سے بولی۔  
”آج تو واقعی تیرے اندر سے لاوا پھٹ رہا ہے۔“ خدیجہ نے کہا۔

”تھک آگئی ہوں میں اپنی ساس اور پتی سے..... اگر سناں میرے بس میں ہوتی تو.....“ سندری کہتے کہتے رو پڑی۔

”لیکن دنیا کے ہر مذہب کی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ اللہ ایک ہے..... اس کی ذات واحد ہے اس کا دوسرا کوئی شریک نہیں ہاں اکثر لوگ اپنے دھرم مذہب یا زبان میں اس کا نام الگ سے لیتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی تعداد تین یا چار پانچ ہے، مختلف ناموں سے پکارنے سے اللہ کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا، تم لوگ، انسانوں کو، جنوں کو بھگوان مانتے ہو کیا یہ ٹھیک ہے۔“

(جاری ہے)



گر بیجوشن کے بعد تعلیمی سلسلہ رک گیا اور مزدوری کا سلسلہ چل پڑا۔ نوکری کے پیچھے کافی وقت ضائع کیا۔ پانچیس سرکار اخباروں میں نوکری کے اشتہار کیوں شائع کرتی ہے؟

مجھے تو اخباری نوکری تلاش کرنے میں شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار تھک ہار کے شہر کی فیکٹری میں ڈپٹی مینجر پر مزدوری مل گئی۔ اس طرح وقتی طور پر میری لائف سے بدروزگاری کا بھوت فی الحال مل گیا۔

آٹھ کلو میٹر کا طویل پرخطر سفر پیدل ہی کاٹنا پڑتا تھا ویسے تو جنگل میں بے ضرر قسم کے جنگلی جانور پھرتے رہتے تھے لیکن رات کے سنائے میں بڑے سے بڑا پہلوان بھی یہاں سفر کرنے سے گزرتا تھا۔ ہماری شفٹ رات 8 سے صبح 8 بجے تک چلتی تھی، کبھی کبھار بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے آدھی رات کو ہی چھٹی مل جاتی تھی۔ میں شہر میں کسی دوست کے یہاں ٹھہرتا تھا اور کبھی کبھار گھر کی راہ لیتا تھا۔

میں بھی انسان ہوں ڈر تو لگتا تھا لیکن ہماری زندگی میں ڈر کر گھر میں بیٹھ جانا ناممکن تھا۔ میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے جنگل سے گزر جاتا تھا۔ جنگل سے ہر سو جنگلی بھیڑیوں اور دیگر خطرناک جانوروں کی آوازیں سن کر ایک عجیب سا خوف اور ڈر میں آگھیرتا تھا۔ موٹر سائیکل یا سائیکل خریدنے کا بجٹ بھی ہم انورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا خاموشی سے دیہاڑی لگا رہا تھا۔ آج تو سارے شہر میں لال جھنڈے نظر آرہے تھے، ارے ہاں آج تو ہمارا دان مٹایا جا رہا تھا جسے لوگ مزدورڈے کہتے ہیں۔ پوم مزدور! ایک بہت بڑے جلسے میں درباری قسم کے مزدور ایک سیاست دان صاحب کو گھیرے میں لئے نعرہ بازی کر رہے تھے۔ اور وہ موصوف ڈاؤس پر بڑے جوش سے تقریر فرما رہے تھے۔ ”میرے مزدور ساتھیو! میں آپ لوگوں کے لئے دودھادہ..... سواری پانی کی نعمتیاں بہا دوں گا۔ اب ہر مزدور کا بچہ اسکول جائے گا۔ افسر شاہی ختم اور مزدور راج شروع ہوگا۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ بھی ختم اور مہنگائی تو

ہماری حکومت نے ہی ختم کی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”واٹ اے جوک“ جسے سن کر پاس کھڑے ایک پولیس والے نے میرے قریب آ کر کہا۔ ”جاؤ میاں اپنا کام کرو، تمہیں یہ مذاق لگ رہا ہے۔“

میں کندھے اچکاتے ہوئے ٹیکری کی طرف چل پڑا۔ آج تو یہ ہے کہ آج کچھ دن بھی ہم مزدوروں کو کچھٹی نہیں ملنی تو پھر یہ دکھاؤ کہ اس لئے؟ صدیوں سے ہم مزدوروں کی حالت نہیں بدلی اور نہ ہی حالات، لگتا ہے ساری دنیا کے مزدور اپنی محرومیوں پر نہ جانے کب تک نوحہ خواں ہوتے رہیں گے؟ آخر حالات کب بہتر ہوں گے؟

ایک رات فیکٹری سے جلدی چھٹی ہو گئی۔ میں  
بیڈل ہی پیدل گاؤں چلا آ رہا تھا۔ رات مکمل تاریکی  
میں ڈوبی ہوئی تھی، حسب معمول سڑک ویران تھی، چلتے  
چلتے میں ایک جگہ رک گیا۔ سڑک کی دائیں طرف والی  
جھاڑیاں مل رہی تھیں جبکہ ہوا تو رکی ہوئی تھی تو پھر یہ  
سربراہت کیسی تھی۔

پہلے تو میں ڈر گیا لیکن پھر سوچا کہ ہوسکتا ہے کوئی  
مصیبت میں ہوشیاد میں اس کی مدد کر سکوں، ڈرتے  
ڈرتے میں نے جھاڑیوں کا رخ کیا، مجھے قریب پا کر  
جھاڑیوں میں چھپا ایک اڑواہا اچانک میرے سامنے  
نمودار ہو گیا۔ اف خدا یا اتا بڑا اڑواہا میں نے پوری  
نڈکی میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے شہر کے سینما گھر میں  
Anaconda سیریز کی ساری موویز دیکھی ہوئی تھی  
لیکن حقیقت میں اتا بڑا اڑواہا ہوسکتا ہے؟

میرا تو سر چمکا گیا، وہ غصے سے زبان نکال کر مجھے اپنا نوالہ بنانے کے لئے میری طرف تیزی سے چمکا، پھر تو میں بے لگام گھوڑے کی طرح وہاں سے ہٹا گیا، کافی دیر تک وہ میرا تعاقب کرتا رہا، لیکن گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی وہ غائب ہو گیا، میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، اب وہاں کوئی نہیں تھا تب میری سانسیں بحال ہوئیں۔ خوف کے مارے خاموشی سے آکر میں اپنے بستر پر گر آیا اور رات اس اٹوٹ

گئے بارے میں سوچتے ہوئی گزری۔

میرا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا تھا، گاؤں کے حکیم صاحب نے مجھے دوایں دی اور آرام کرنے کو کہا لیکن آری قسمت میں آرام کہاں تھا؟ میں نے رات دلی ت سب سے چھپائی مہادا کوئی میرا مذاق نہ اڑائے، شام صاحب سے ڈر کا تعویذ بھی لیا، پورا دن آرام کیا اور شام کو پھر کام پر چل نکلا۔

پہلے تو آغا و رئیس لکنا تھیں رات اپنی آنکھوں سے اس بڑا کو دیکھا تھا اس لئے پہلے سے محتاط ہو گیا تھا۔  
 پھر رات تو نہیں تھا البتہ ایک عدد مضبوط ڈیڑا ضرور اٹھایا۔  
 آج جنگل کافی پرسکون تھا میں خاموشی سے وہاں سے گزر گیا۔

رمضان کی آمد آمد تھی، سب لوگ اس ہائپرکسٹ  
بچے کی تیاریوں میں مصروف تھے، آج ہماری فیکٹری کی  
میں دفتر آئی تھی، میں نے اس سے ملنے کی عرضی پیش  
کر دی تھی۔

وہ اسی کمرے میں مختصر لباس میں ملبوس کرسی پر  
بیٹھا تھا، اس کے آواز ہوشیاد اس کے فرائیڈز اور گریزی  
اس پہنچے پہنچے بلانے میں مصروف تھے، مجھے دیکھ کر سب  
لے لے اپنی سرگرمیاں ترک کر دیں اور سب مجھے سر سے پاؤں  
تک دیکھنے لگے۔ شاید مجھے کوئی اور مخلوق سمجھ رہے تھے۔ یا  
خبر غریبہ تب تو تجربے کی تیاری کر رہے تھے۔

فیکسٹری کی مالکن نے پہلے تو میری جوتیوں پر نظر پائی اور اس کی مغرورانہ نظر میرے کپڑوں سے ہوتی گئی اس کے سامنے بڑے بڑے سے بچ موہاگل پر ہی شاید کوئی کال آ رہی تھی۔ اس نے گھنٹہ بھر وہ کال نہ کی وہ سامنے والے سے زیادہ تر انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ شاید مجھے ان پڑھ سمجھ رہی تھی۔ لیکن میں تو بے چارہ تھا، وہ کسی امیر زادے سے ڈرنے کے بارے میں بات کر رہی تھی اور مینو کنکشن نہیں ہو رہا تھا۔ میں تو بے چارہ بھڑکے بھڑکے رہ گیا، کیسے ہاتھ دھب لوگ آخر آخر میں اس نے کال کاٹ دی۔

”محترم XYZ آپ ہم سے کیوں ملنا چاہ

**بیل**

ایک مریض نے اپنے معالج سے کہا: ”ڈاکٹر صاحب میں ان دنوں کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں جس سے میری سستی دور ہو جائے۔ میں چاق و چوبند نظر آؤں اور میرا سر دھوتا ہوا خون کھولنے لگے۔ کیا کوئی ایسی چیز آپ میرے نسخے میں شامل کر سکتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے سرائٹائے بغیر نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ چیز میں نسخے میں نہیں بل میں شامل کروں گا۔“  
 (انصیر - کراچی)

”کے ہیں؟“

”سوری میم! میرا نام عزیز خان ہے اور...“ اس نے میری بات کو درمیان میں ہی کاٹ دیا اور اکثر کر بولی۔ ”منسو مشرا میرے پاس ناٹم نہیں ہے، کام کی بات کرو۔“ ”وہی تو کہہ رہا تھا لیکن شاید وہ مجھے معزود ہونے کا احساس دلا رہی تھی اور خود کو ناگن۔“

”میم کل سے رمضان شروع ہو رہا ہے اور یہ  
 ہیبتہ بڑا بابرکت ہے۔ میں دن میں روزے اور رات کو  
 عبادت کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں میری شفقت کی  
 استغاثہ میں کچھ نری کر دی جائے تاکہ میری عبادت  
 میں خلل نہ پڑے تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔“  
 ”اور کام میں خلل پڑے تو پڑے؟ دیکھو مسٹر  
 جان! یہ ایک نیچے کیشری ہے، یہاں کام کرو یا عبادت،  
 جو اس از پورس؟“

یہ سن کر میرا دماغ محکوم گیا، یہ کیسی تہذیب پروران  
ہرٹھ رہی تھی، دین و دنیا سے عاری یہ سرمایہ دار ایک اسلامی  
ملک کے شہری ہیں اور مجھ سے یہ سلوک ایک سوائیٹان تھا؟  
ویسے ہمارے گاؤں اور قیٹری کے درمیان اچھا  
خاصا فاصلہ تھا اور میرے ذہن میں رہتا تھا کہ جسے اللہ  
کھے اسے کون کچھے۔



## آسیبی پارلر

رنگ نور فیصل آباد

یہ حقیقت اور زعمام ہے کہ ہر جاندار ہی نہیں بلکہ نادیدہ مخلوق بھی اپنے مسکن کی حفاظت کے لئے اپنی جان لڑا دیتی ہے اور یہ کہاں تک حقیقت ہے کھانی پڑھ کر دیکھیں.....

ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لینے والی ڈراؤنی خوفناک کہانی

”بھتہ دین اور آخر کار بھتہ ڈرہی سہی۔“  
 یہ ہے مناسب تنخواہ دی جائے گی۔“  
 سوئی کی یا چھین اشتہار پڑھ کر خوشی سے کل گئیں  
 چھلے چوہا سے نوکری کی حلاش میں مٹی سوا سے یہ  
 پڑھ کر ایک امید کی کرن نظر آئی..... اگلے دن سوئی  
 نے جلدی اٹھی ناشتہ کیا انا کو بائے بائے لپٹی ہوئی  
 لپٹی..... کیونکہ اسے پارلر کی مالکہ سے ملنا تھا وہ آدھے  
 گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد اشتہار میں دیئے گئے پتہ  
 پہنچ گئی۔  
 ”جگہ تو یہی لگ رہی ہے“ سوئی اخبار کھولتے  
 ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔  
 ”ہیلو میڈم“ وایج مین اس کے لئے دروازہ  
 کھولتے ہوئے بولا پارلر بہت خوب صورت تھا اور سلیقے سے  
 سجایا گیا تھا۔

میں بلا ڈرو خوف روزانہ فیکٹری سے کام نہنانے کے بعد گھر آ جایا کرتا تھا۔  
 وہ دوسری یا تیسری رات تھی، میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آرہا تھا کہ میری نظر راستے سے ہٹ کر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ ہیں جو کہ بیٹھے ہیں اور ایسے ہی میں روزانہ رات میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ ایک مخصوص جگہ پر کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ خیر میں مخصوص جگہ پر پہنچا تو آواز سنائی دی۔  
 ”عزیز بیٹا ذرا ادھر آنا ایک صاحب کی مدد کرنی ہے۔“ اپنا نام سن کر میں چونک پڑا کہ اس اندھیری اور ملی جلی چاندنی رات..... کیا کوئی میرا جاننے والا ہے جو کہ میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔  
 اور میں جلدی جلدی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تو دیکھا کہ ایک کارکھڑی ہے اور اس کے قریب ایک امیر کبیر شخص اور پاس ہی ایک بزرگ کھڑے ہیں، بزرگ کی نظر جب مجھ پر پڑی تو بزرگ گویا ہوئے۔ ”عزیز بیٹا..... سیٹھ صاحب کی گاڑی رک گئی ہے اور تمہاری مدد کی ضرورت ہے..... آؤ ذرا دکھا لگا کر دیکھتے ہیں کہ شاید یہ اشارت ہو جائے۔“  
 اور پھر ہم تینوں نے مل کر جب گاڑی کو دکھا لگا لیا تو فوراً گاڑی اشارت ہو گئی۔ تو گاڑی والے صاحب بزرگ سے بولے۔ ”محترم بزرگ آپ کا بہت بہت شکر یہ میری مدد کرنے کا۔“  
 یہ سن کر بزرگ بولے۔ ”سیٹھ صاحب کر بھلا تو ہو بھلا..... کرو مدد مانی تم اہل زمین پر اور خدا مہربان ہوگا عرش پر میں پر، آپ جا میں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھا کریں۔“  
 اس کے بعد کاروالے صاحب نے بزرگ اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ شکر یہ ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔  
 اس کے بعد بزرگ مجھ سے مخاطب ہوئے۔  
 ”عزیز بیٹا..... بڑے لوگ اکثر اپنی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہیں..... لیکن یہ صاحب ایسے نہیں لگتے..... ان کے دل میں غریبوں کے لئے نرم گوشہ ہے۔ خیر اب تم



”Who Are You“ سوزی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک خوب صورت لڑکی اس سے مخاطب تھی۔  
 ”ہیلو.....“ اس کو بخود دیتے ہوئے پیار سے بولی۔  
 ”آپ نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ ایک میٹر ڈریسر کی ضرورت ہے۔“ سوزی نے اخبار آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔  
 ”اچھا تو آج میٹر ڈریسر ہیں؟“ وہ چلتے ہوئے بولی تو سوزی بھی اس کے پیچھے ہوئی۔  
 آگے جا کر لڑکی ایک کرسی پر براہِ جان ہو گئی اور سوزی لکھی لکھی ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔  
 ”میرا نام ڈاکٹر خانی ہے اور میں اس پارلر کی مالک ہوں، آپ حیران کیوں ہوئیں۔“ سوزی کے چہرے کو دیکھتی ہوئی خانی بولی۔  
 ”میں اس سوچ رہی ہوں کہ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو بیٹھنے کے شے میں؟“ سوزی اپنی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔  
 خانی مسکرا کر بولی۔ ”ڈاکٹر بنانا مجھے میرے لڑکی خواہش تھی اور میری پسندیدہ پیشہ جتنا تھا سو اب کے لئے ڈاکٹر بن گئی اور بیٹھنے لپنے لے۔“  
 ”سوزی Listen نوٹی میں تمہیں ایک بات کہیں کر دینا چاہتی ہوں یہاں تم سے پہلے بھی بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں لوگ کہتے ہیں کہ میں نے ایک پراسرار جگہ پر پارلر بنایا ہے یہاں پر رچوں آزمائش کے سامنے ہیں، تم سے پہلے جو لڑکیاں یہاں کام کرتی تھیں یہ باتیں سن کر ایک دو دن میں ڈوڑی چھوڑ کر چلی گئیں مگر تم کو ان باتوں سے کوئی مسئلہ نہ ہو تم مجھے بتا سکتی ہو۔“  
 اپنی بیمار میں کی دوا، گھر کا خرچ یہ سب سوچتے ہوئے سوزی ساٹھ لچھے میں بولی۔  
 ”مجھے کوئی پریشانی نہیں۔“  
 ”مگر تو تم کل سے جوائن کر سکتی ہو۔“ خانی سوزی کی طرف خانی فائل بڑھاتے ہوئے بولی۔  
 ”لو کے سیم تو کل ملاقات ہوئی۔“ سوزی گھر کے لئے واپس مڑتے ہوئے بولی۔

”انشاء اللہ“ خانی اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر ہوئے بولی۔  
 اگلے روز سوزی جلدی آئی ناشتہ کیا اور پارلر کے لئے نکل پڑی۔  
 چونکہ سوزی کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”میڈم آپ اتنی جلدی آگئیں۔۔۔۔۔۔“  
 سوزی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آج جاب کا پہلا دن ہے اور میں غلط امیریشن نہیں ڈالنا چاہتی تھی سو اس لئے جلدی آ گئی۔“ سوزی آگے بڑھتے ہوئے اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور سامنے لگے بڑے سے شیشے میں خود کو دیکھنے لگی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک شہری بالوں والی لڑکی اندر آتی ہوئی دکھائی دی لڑکی نے آکر اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور سوزی سے مخاطب ہوئے ہوئے بولی۔  
 ”میرا نام عریشہ ہے، میڈم خانی نے مجھے کل تمہارے بارے میں بتایا تھا وہ آج نہیں آ رہیں اس لئے آج سارا کام ہم دونوں کو ہی کرنا ہے، کچھ دیر میں کلائنٹ آئے والے ہیں تم جا کر تیار کی کرو۔“ اور خود کرسی پر براہِ جان ہو گئی۔  
 سوزی میک اپ کو ترتیب دے رہی تھی کہ اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔  
 ”اتنی گرمی میں مجھے سردی کیوں لگ رہی ہے؟“  
 زیر لب بڑبڑاتی۔  
 اچانک پارلر کی لائٹس بجھ گئی تو سوزی گھبرائے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دوڑی لیکن کاؤنٹر پر عریشہ نہ تھی سوزی گھبرائی ہوئی آواز میں ”عریشہ عریشہ“ نکلنے لگی۔  
 اور پھر چونکہ سوزی کی آواز سن کر اندر آیا وہ سوزی کو بکھلاتی ہوئی حالت میں دیکھ کر بولا۔  
 ”کیا وہاں میڈم آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔“  
 ”عریشہ کہاں ہے۔۔۔۔۔۔؟“ سوزی چونکہ پارلر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”کون عریشہ؟“ وایچ میں نے حیرانی سے پوچھا۔  
 سوزی گھبرائے ہوئے۔ ”وہ جو یہاں کاؤنٹر پر تھی۔“

”یہاں پر تو آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔“ جو کاؤنٹر پر تھی وہ تودو دواہ پہلے ہی جاب چھوڑ چکی ہے۔“ وایچ نے کہا۔  
 ”جی ہاں ابھی یہاں پر آئی تھی وہ کون تھی؟“ سوزی وایچ کے چہرے کی طرف دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”یہاں پر تو آپ کے سوا کوئی نہیں آیا یا آپ کا وہم وایچ میں سوزی کو دلا سہ دیتے ہوئے باہر چلا گیا۔  
 ”یہ میرا وہم کیسے ہو سکتا ہے۔“ سوزی خود سے ہم ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”وہ لڑکی اس کے سنہری بال یہ سب یہ میرا وہم کیسے ہے۔“ وہ ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔  
 کہ اچانک کاؤنٹر کی کرسی پٹنے لگی تو سوزی مزید لڑے ہوئی پھر ایک دم سارے پارلر میں خاموشی۔  
 سوزی نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے ہر چیز کی میں ڈوبی نظر آئی اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی دیکھا تو جھنجھک رہے تھے۔  
 ”شام کے چھن گئے ہیں یا یہ گھڑی خراب ہے۔“  
 لڑکی سے دوڑتی ہوئی باہر گیٹ کی طرف آئی تو باہر کا راس بات کا شجوت تھا کہ شام ڈھل چکی ہے۔  
 ”کیا شام کے چھن چکے ہیں۔؟“ سوزی گیٹ سے وایچ میں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”جی ہاں۔“ وایچ میں ایک نظر اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”شام کے چھن چکے ہیں اور میں تھوڑی دیر پہلے ہی ہوں۔“ پارلر میں کوئی کلائنٹ بھی نہیں آیا۔“ سوزی نے اپنے اپنے ماتھے پر ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔  
 وایچ میں سوزی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سیم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آئینی پارلر ہے اس لئے بہت کم لوگ آتے ہیں۔“ تو سوزی ماتھے پر پیل ڈالتے ہوئی بولی۔  
 ”خانی میڈم نے تو کہا تھا کہ انہیں ڈیوٹی پر دھیان دے دو ان کو کہیں اور بھٹکنے نہ دیتا۔“

ڈاکٹر لول حکیموں ماہرین طب ہدایات لکھی گئی مفید کتاب  
 شری گری (ذیابطیس)  
 قیمت - 100 روپے  
 اس کتاب میں شوگر کیسے اور کیوں ہوتی ہے، شوگر صحت کے لئے سب سے سنگین خطرہ، ایکسپائر استعمال نہیں کرنی چاہئیں، بڑھتی عمر، شوگر کیا ہے، ٹائپ دن شوگر، ٹائپ ٹو شوگر، بلڈ پریشر کا خطرہ، ہائی بلڈ شوگر کے مریضوں کی سرجری خطرناک ہو سکتی ہے، شوگر کی پیچیدگیوں سے کیسے نمٹنا چاہئے، احتیاطی تدابیر، شوگر اور ڈپریشن کا تعلق، افسردہ اداس مائیں اور بچے، نارمل بلڈ شوگر کیا ہے، جانچ کب کروائیں، شوگر بڑھنے کے اسباب اور تدارک، موٹے افراد کا خوف، سگریٹ نوشی، وجوہات، شوگر سے محفوظ رہنے والی خواتین، انفیکشن، بچوں پر ماؤں کا اثر، پیشاب کی نالی میں انفیکشن، ذیابطیس کے مریضوں کے لئے خطرناک بیماریاں، ڈپریشن، شوگر کی علامات اور اس سے بچاؤ کے طریقے، دیسی وڈا کنری نسخے پڑھئے اس کتاب میں۔  
 حکیم غلام مصطفیٰ  
 دعا بک کارنر ۵ فیصل آباد  
 (نئی دہلی ۵) فیصل آباد  
 (نئی دہلی ۵) فیصل آباد





## آسیب کا سایہ

ڈاکٹر رانا عامر شہزاد - ننگا نہ صاحب

نوجوان کی آواز سنائی دی لاشوں کی حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہے، آنکھیں سرے سے غائب، پیٹ سے آنتیں باہر نکلی ہوئی اور زیادہ تر اعضا غائب اور ایسی صورت میں.....

خوف و وحشت کے سمندر میں غوطہ زن..... ناقابل فراموش وحشت ناک..... کہانی

ہیں آج جو واقعات آپ کو سنانے جا رہا ہوں اسے ساتھ تقریباً پچیس سال پہلے پیش آیا، ان دنوں ایک چھوٹے سے شہر میں بطور پولیس آفیسر فرائض انجام دے رہا تھا۔ میری زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی۔ مجھے چریل، جنات اور بدروخوں وغیرہ کے متعلق ایمان پڑھنے اور ڈرامائی فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ دین اسلام کے مطابق جنات کی موجودگی پر تو میرا بکا ایمان تھا مگر اس بات پر مجھے قطعاً یقین نہیں تھا کہ جنات وغیرہ لوگوں کے جسموں پر قبضہ کر لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر انہی دنوں ڈپٹی صاحب نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا اور ایک ایسی اسائنمنٹ تفویض کی جس نے مجھے جنات کی کہانیوں میں موجود حرکات پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا۔

ڈپٹی صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”مستر خالد آپ

واچ مین مسکرا کر بولا۔ ”اگر آپ گھر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔“

سوزی نے پارلر کے اندر سے بیگ لیا اور گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔

”لوگ جوتے کتے ہیں کہ یہ جگہ آئینی ہے میرا وقت کیسے گزر گیا وہ لڑکی عریضہ آج صبح کا پہلا دن میرے لئے کتنا برا گزرا، ہوسکتا ہے یہ میرا دم ہوا چلو خیر جاب تو ملی۔“ سوزی بالوں میں کلپ لگاتے ہوئے خود سے ہمکلام ہو گئی۔

اگلے دن سوزی جلدی ابھی ناشتہ کیا اور پارلر چلی گئی۔

”ڈیکم مس سوزی“ خانی ہونٹوں پر مسکراہٹ سمیٹتی ہوئی بولی۔

”Thankyou میڈم۔“ سوزی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”سوزی سوزی کل آپ کا پہلا دن تھا اور میں پارلر نہیں آئی۔“ خانی نے بولا۔

سوزی اٹھا بیٹھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

”یہ سبھی کل پارلر میں کوئی نہیں آیا تھا۔“

خانی اخبار اٹھاتے ہوئے۔ ”پرانج بہت سے لوگ آنے والے ہیں۔“

پھر کچھ دیر بعد پارلر میں جھوم گگیا، خانی اور سوزی نے مل کر سب کو تیار کیا رات کے آٹھ بجے کے قریب وہ فری ہوئیں۔

خانی کو کام کے سلسلے میں جلدی گھر جانا پڑا اور پھر معمول کے مطابق سوزی چینیچ رووم میں پیشہ ور لباس تبدیل کرنے لگی اور جب وہ چینیچ رووم سے باہر آئی تو اسے اپنے پیرو پر کچھ گیلا گیلا سامعوس ہوا وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار چیخ اٹھی اس کے پیروں سے لٹ پٹ تھے کہ اچانک پورے پارلر میں ایک عجیب و غریب بو پھیل گئی۔

سوزی کا اس بو کی وجہ سے دم گھٹ رہا تھا۔ ”یا اللہ یہ سب کیا ہوا ہے میرے ساتھ۔“ پھر پارلر کی لائٹ بند ہو گئی سوزی چیخ جاتی تھی کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ



ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ایک بہترین اور قابل پولیس آفیسر ہیں، آپ نے پہلے ہی اپنے جملہ فرائض احسن طریقوں سے سر انجام دیئے ہیں لیکن ان دنوں ہم ایک بہت پیچیدہ مسئلے سے دوچار ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے بہت دور پریت گھر نامی ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ جہاں پچھلے دو مہینوں میں سات نو جوان لڑکوں کی پراسرار ہلاکتیں ہو چکی ہیں اور مرنے والوں کی لاشیں انتہائی خطرناک حالت میں ملتی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف اہل پریت گھر بلکہ ارد گرد کے گاؤں کے لوگوں میں انتہائی تشویش پائی جاتی ہے اور پورا علاقہ نہایت افسردہ اور خوف و ہراس میں مبتلا ہے۔ وہاں کی پولیس تاحال اس معرکہ کو سمجھانے اور قاتلوں کو پکڑنے سے محذور دکھائی دے رہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب پر ہائی کمان کا زبردست پریشر ہے۔

لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ اسائنمنٹ آپ کو سونپی جائے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ پہلی فرصت میں پریت گھر کے لئے روانہ ہو جائیں گے اور جلد از جلد اس اہم اسائنمنٹ کو کامیابی سے مکمل کر کے ہمارے اعتماد میں اور اضافہ کریں گے میری تمام مدد اور عاکیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

میں نے فوراً حاضری بھرنی اور جلدی سے گھر روانہ ہوا۔ اور ضروری سامان کا بندھ کر بذریعہ ٹرین پریت گھر روانہ ہو گیا۔ سات گھنٹے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد آخر میں پریت گھر کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور ایک تانگہ پکڑ کر گاؤں کی جانب گامزن ہو گیا پریت گھر نام کی طرح بہت خوب صورت گاؤں تھا۔ ہرے بھرے کھیت، کھیتوں میں لگے ٹیپ دلیز اور گاؤں کا کچا راستہ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ مگر افسوس کہ اسے خوب صورت گاؤں کو کسی کی نظر لگ سکتی تھی کہ گاؤں کا ہر باشندہ انتہائی پریشان اور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

جلد ہی میں تھانے کی عمارت کے اندر موجود تھا۔ تھانے کو ایک دیرانہ کہنا ہی مناسب ہوگا عمارت

بہت پرانی اور بوسیدہ ہو چکی تھی محض میں پتیلی کا بہت بڑا اور گھٹا درخت موجود تھا جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور تھانہ چار دیواری اور تمام بنیادی سہولیات سے محروم تھا۔ تھانے میں تین سپاہی موجود تھے جن سے میں نے اپنا رسمی سا تعارف کرایا اور توڑی ہی دیر میں وہ مجھ سے مل گئے۔

تھانے کے اندر مناسب رہائش کی عدم دستیابی کے بعد مجھے میرے عملے کی مدد سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا خوب صورت کمرہ رہائش کے لئے رات ہونے سے پہلے ہی مجھے مل گیا۔ میرا باقی اسٹاف مقامی ہونے کی وجہ سے مجھے اکیلے ہی رہائش رکھنا پڑی۔

تماز عشاء کے بعد ہم سب نے ٹی کر گاؤں میں ہونے والے واقعات پر تفصیلی گفتگو کی تھی مجھے شدید سپاہی سے معلوم ہوا کہ شروع سے ہی پریت گھر بہت پر امن لگاؤں تھا۔ یہاں کے تمام باشندے بہت اچھے کردار کے حامل ہیں کسی سے کسی کی کوئی دشمنی نہیں، پھر بھی پچھلے دو مہینوں سے گاؤں میں موجود چوہدری رفاقت کی پرانی حویلی سے نو جوانوں کی لاشیں مل رہی ہیں۔

اور لاشوں کی حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہیں، آکھیں سرے سے غائب، پیٹ سے آنتیں باہر نکلی ہوئی کسی کا کوئی اعضا غائب اور رنگ بالکل نیلا ہوتا ہے۔“

میں غصے سے بولا۔ ”تو آپ سب کس مرض کی دوا ہیں اتنے بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور قاتل آج تک آزاد پھر رہے ہیں!“

تمہی دوسرا سپاہی انور بولا۔ ”صاحب جی! ہم نے گاؤں والوں سے مل کر قاتل کو پکڑنے کے لئے ہر ممکن کوششیں کی ہیں۔ چوہدری صاحب بھی ہمیں ہر طرح سے مدد فراہم کرتے رہے مگر قاتل اتنا ہوشیار ہے کہ کسی قسم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا اور گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ شروع سے ہی حویلی پر جنات کا سایہ ہے اس لئے یہ کام جنت کا ہی ہے۔“

میں نے غصے سے انور کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”بکواس کرتے ہیں یہ جاہل لوگ اس جدید دور کی کسی پرانی بوسیدہ باتوں پر یقین رکھتے ہیں افسوس چاہیے لوگوں پر۔“

اگلے ہی دن میں سپاہیوں کے ہمراہ حویلی میں گیا تاکہ قاتلوں کو پکڑنے کے لئے کوئی لائحہ عمل بنائیں۔ مگر خلاف توقع میرے تینوں سپاہیوں نے حویلی کے اندر جانے سے انکار کر دیا وہ بری طرح خوف میں مبتلا ہو چکے تھے۔ میرے پر زور اصرار کے باوجود وہ حویلی کے اندر جانے سے انکاری رہے۔ یہاں تک کہ شید بولا۔

”صاحب جی! ہم سب نوکری چھوڑنے کو تیار ہیں مگر حویلی کے اندر کسی صورت نہیں جائیں گے کیونکہ حویلی کے اندر جو بھی گیا پھر واپس نہ آئے گا۔“

میں ان کو کوستا ہوا اکیلا ہی حویلی کے اندر داخل کیا۔ حویلی بہت بڑی تھی انتہائی پرانی ہونے کے باوجود بھی یہ تین منزلہ عمارت بہت خوب صورت لگ رہی تھی محض میں موجود تالاب بہت خوب صورت نظارہ پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں میں نے لڑی حویلی کا مکمل معائنہ کیا جس میں بہت سارے بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ سب بوسیدہ دکھائے ہوئے تھے مگر دوسری منزل پر ایک بڑا کمرہ لاک اتارے سے محسوس ہو رہا تھا جیسے کافی عرصے سے یہ کمرہ بند ہو۔

مجھے اس بند کمرے کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ پھر واپسی پر چوہدری رفاقت کی کوئی پر پچھا جو کسی ضروری کام کی وجہ سے پچھلے دو دنوں سے گاؤں میں موجود نہ تھا۔

اس لئے میں نے اس سے ملنا ضروری سمجھا اور روایتی مزیدار کے بڑھائی جاسکے گاؤں والوں کی نظروں میں چوہدری کی بہت عزت تھی اور بقول ان چوہدری بہت نیک اور معزز انسان تھا مگر میری نظر سے وہ اچھا انسان نہ تھا اور میرا دل کہتا تھا کہ ان بات میں چوہدری رفاقت کا ہاتھ ضرور شامل ہے۔

پیشہ ورانہ طور پر چوہدری سے ملاقات کے دوران میں نے کچھ ایسی باتیں نوٹ کیں جس سے میرا شک چوہدری تک جانا لازم تھا۔

چوہدری سے ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوئی اور چوہدری نے مجھ سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! ہمارے گاؤں کو نچانے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ اچھے اور ہندار ہیں اور میں بھی گاؤں والوں کو اپنی فیملی کی طرح پیار کرتا ہوں اس لئے انسپکٹر صاحب میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جلد از جلد قاتلوں کو کبھی ضرور تک پہنچانے کے لئے ہر ممکن اقدامات کیجئے اور ہمارے گاؤں کو اس اذیت سے بچانے میں ہماری مدد کیجئے۔“

میں نے چوہدری کو بتایا کہ ”میں آج آپ کی پرانی حویلی میں گیا تھا۔ تاکہ مکمل معائنہ کر سکوں وہاں دوسری منزل پر ایک کمرہ لاک ہے اسے تو کھولنے ہو سکتا ہے اس کمرے سے کوئی سراغ مل جائے۔“

تو چوہدری نے جواب دیا۔ ”انسپکٹر صاحب! یہ واقعات تو پچھلے دو مہینوں سے شروع ہوئے ہیں اور یہ کمرہ تو کافی عرصہ سے بند ہے ہمارے باؤاچہ لو کہتے تھے اس کمرے میں آسبب موجود ہے، وہاں سے عجیب و غریب آوازیں آتی تھیں اسی وجہ سے ہم نے وہ حویلی چھوڑی تھی اور آج تک اسی خوف کی وجہ سے ہم نے وہ دروازہ نہیں کھولا۔

میرے بہت اصرار پر بھی چوہدری کمرہ کھولنے کے لئے آمادہ نہ ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اگر میں یہ دروازہ کھول دوں تو میرے خاندان پر کوئی ناگہانی آفت آنے کا خطرہ ہے لہذا اس کو کھولنا میرے لئے ممکن نہیں اور ویسے بھی اس دروازے سے گاؤں میں ہونے والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔

ظاہری طور پر تو چوہدری اچھا انسان نظر آ رہا تھا مگر میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ چوہدری ہر حال میں ان واقعات میں ملوث ہے ہو سکتا ہے کہ چوہدری کی مرنے والوں سے دشمنی ہو اور وہ آسبب کی آڑ میں ان کو

ختم کروا دیتا ہو۔ مگر ٹھوس ثبوت اور شواہد کے بغیر میں اس با اثر چوہدری کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا اور پھر سے گاؤں والے بھی چوہدری پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ بھٹے کے دن انہی میں تھا جس نے پہنچایا تھا کہ شیدا گھبرا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”صاحب جی! غضب ہو گیا آج پھر ایک لاش جو جلی میں ملی ہے۔“

پھر میں فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا اور لاش دیکھ کر میرے حواس کم ہونے لگے مرنے والے کی آنکھیں غائب تھیں، پیٹ بہت بری طرح زخمی تھا، دایاں بازو اور ایک پاؤں غائب تھا۔ اور رنگ مکمل طور پر پیلا ہو چکا تھا جیسے نیلی سیاہی لاش پر ڈال دی گئی ہو۔ سارا گاؤں وہاں جمع ہو چکا تھا۔ سب سب سے دور سے ہوئے تھے مرنے والے کے گھر والے غم سے بے حال ہو رہے تھے۔ موقع پر چوہدری بھی پہنچ گیا جو خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا اور آتے ہی بولا۔ ”انسپکٹر صاحب خدا کے لئے کچھ کریں اور نفری طلب کیجئے۔“ آخر ہمارا تصور کیا ہے۔ کدھر ہے آپ کا قانون جو اس قدر معذور ہو چکا ہے کہ ہمارے تحفظ سے آنکھیں چرا رہا ہے۔“

ضروری کارروائی کے بعد لاش کو سپرد خاک کر دیا گیا پھر میں نے گاؤں کی میٹنگ بلائی اور سب گاؤں والوں کو اس بات پر متفق کیا کہ جب تک قاتل قانون کے شکنجے میں نہیں آ جاتا تب تک سب مل کر بالخصوص جو جلی کے ارد گرد اور بالعموم گاؤں کے چاروں اطراف پھر دیں گے۔

پھر گاؤں والے باری باری پھر دینے لگے اور میں بھی جو جلی پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا جب تک پھر لگا رہا تب تک گاؤں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا اور اسی لئے لوگ میری بہادری کو سراہتے ہوئے میری تعریفیں کرنے لگے مگر مجھے صرف اپنے کام سے مطلب تھا اور میں جلد از جلد یہ کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔

عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں تھانے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے مجھے ایک

خط تھما دیا اور بولی۔ ”صاحب جی! خط پڑھنے کے بعد جواب ضرور لکھ دیجئے گا اور میں کل اسی وقت اسی جگہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر آپ سے جوابی خط لے جاؤں گی۔“ اور جاتے ہوئے بولی۔ ”انسپکٹر جی! خط انہی ہی پڑھنے گا۔“ اور بستی ہوئی چلی گئی۔

میں تھانے جا کر اب تک ہونے والی ساری کارکردگی لکھنے لگا تاکہ اسے ہیڈ آفس بھیج سکوں زیادہ کام کی وجہ سے خط پڑھنا میں بھول ہی گیا۔

نماز عشا کے بعد اپنے کمرے میں جا کر مجھے خط کا خیال آیا تو میں نے فوراً اسے محول کر پڑھنا شروع کیا جس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

خالد السلام علیکم

جب سے آپ ہمارے گاؤں آئے ہیں، میں آپ کی بہادری، عقل مندی اور اچھی عادات کی وجہ سے دل سے آپ کی عزت کرنے لگی ہوں۔ ساری ساری رات مجھے نیند نہیں آتی اور میں آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے آپ سے پیار کرنے لگی ہوں، میرے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے مگر مجھے صرف آپ کی محبت کی ضرورت ہے لہذا براہ مہربانی میری محبت کو قبول کر کے خدمت کا موقع دیں۔ پوری زندگی آپ کی باندی بن کر رہوں گی۔

والسلام  
صرف آپ کی  
سو نیاز قاتل

میں نے خط پڑھتے ہی سوچا ابھی ایک مصیبت ملی نہیں اور دوسری آنے کو تیار ہے۔ ویسے بھی ان دنوں مجھے پیار وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں پیار وغیرہ کو صرف ڈرامہ سمجھتا تھا اور گاؤں کے لوگ میری بہت عزت کرتے تھے اس لئے میں اپنے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے خط کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

اور اگلے دن بوڑھی عورت سے کہہ دیا۔ ”اپنی مالکین سے کہو کہ میں پیار و محبت پر یقین نہیں رکھتا اس

مستقبل میں مجھے کوئی خط نہ لکھیں۔“

☆.....☆.....☆

ہم سب نے مل کر پورا ایک مہینہ سخت پھر دیا تو اُس میں کوئی بھی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا جس کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا کہ قاتل جو بھی ہے اس کا تعلق اسی گاؤں سے ہے کیونکہ پھر سے میں ہم نے ہر طرف کڑی سرچشمی ہوئی تھی رفتہ رفتہ پھر سے کوڑم کر دیا گیا ویسے بھی گزرتے وقت کے ساتھ لوگوں کے دلوں سے بھی کچھ سخت کم ہونے لگی تھی ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے ایک اور لاش جو جلی کے تالاب سے ملی جس کی حالت اتنے بھی زیادہ خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

میں سخت حیران ہوا کہ تقریباً ڈیڑھ مہینے میں رات دن پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوا مگر جیسے ہی تھوڑی نری کی بھر چالاک قاتل نے گھناؤنا کام کر دکھایا اب تو سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ چوہدری ہی روا رہا ہے کیونکہ پھر سے میں کسی کروانے میں چوہدری پیش پیش تھا۔ پورے گاؤں میں جیسے صف بچھ گئی ہو ہر شخص نہایت افسردہ نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا لوگ جیسے ہنسا بھول گئے ہوں۔

انہوں اطراف سناٹا چھا گیا تھا ہر کسی کو اپنی جان کی فکر رہی تھی کہ تھانے کب اس کی باری آ جائے اور اسے بھی جب کسی گاؤں میں درجن کے قریب انان لڑ کے انتہائی سفاکی اور بے دردی سے قتل دئیے جائیں وہاں خوف نہ ہو تو کیا ہوگا؟

نماز ظہر کے بعد میں امرودوں کے باغ میں گزر رہا تھا کہ اچانک چوہدری کی اگلی بیٹی سونیا مجھے سامنے آ گئی آج پہلی بار میں نے اسے اتنے قرب سے دیکھا تھا وہ انتہائی خوب صورت تھی میں ابھی اسے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ انداز خوشی سے بولی۔ ”انسپکٹر صاحب! میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے تو آپ کی راہوں میں ٹکٹیں بچھانے رہتی ہوں آپ ہیں کہ مجھ سے نظریں ہی نہیں ملاتے۔ خدا کے لئے خاتم نہ بنئے کچھ میرا بھی خیال کریں۔“

میں نے غصے سے سونیا کو سمجھایا کہ گاؤں میں لوگوں کے گھر اجڑ رہے ہیں لوگ وحشت کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور انہیں اس نازک گھڑی میں شوق سوج رہا ہے جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے میرا کام کرنے دو اور ویسے بھی یہ پیار وغیرہ سب ڈرامہ بازی ہے بس دو دن کا بخار ہے جلد ہی اتر جائے گا۔“

میری باتیں سن کر وہ رو دی اور بولی۔ ”خدا گواہ ہے کہ گاؤں میں ہونے والے واقعات سے میں خود بھی بہت پریشان ہوں مرنے والے سب میرے بھائیوں جیسے ہیں مگر یہ کم بخت دل کو بھلا کون سمجھائے۔“ اس کا یہ انداز بیان میرے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا مگر میں اسے وہیں چھوڑ کر تھانے پہنچ گیا۔

رات کو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں جو قیامت مفری برپا ہوئی ہے اس نے کتنے گھروں کے چراغ گل کر دیئے ہیں آخر لوگوں کا کیا تصور ہے؟ جتنے بھی لوگ مارے گئے تھانے میں ان کا کوئی بھی ریکارڈ موجود نہ تھا وہ سب اچھے انسان تھے پھر انہیں اتنی بے دردی سے کیوں قتل کر دیا گیا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب سوچئی کہ کیوں نہ میں کسی رات اکیلا جو جلی میں جاؤں اور بند کر کے کوکھوں، شاید مجھے کوئی سراغ مل سکے۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ چوہدری کا ان ہلاکتوں میں ضرور کوئی کردار ہے پھر تھانے کب میری آگے لگی اور میں غینہ کی آغوش میں چلا گیا۔

دن تیزی سے گزرتے رہے مگر ہر ممکن اقدامات کے باوجود قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

چوہدری نے حویلی کو مکمل طور پر پیل کر دیا تھا اس لئے اب کوئی بھی حویلی میں نہیں جاسکتا تھا۔ میں بھی بار بار کوششوں کے باوجود بند کمرے تک پہنچنے میں ابھی تک ناکام تھا۔

تقریباً آٹھ دن بعد حویلی کے تالاب سے ایک اور لاش ملی اور پورے علاقے میں افراتفری پھیل گئی اور



ہر طرف لوگوں کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ اخبارات اور ٹی وی پر میڈیا پولیس کی کارکردگی کے خلاف زہرا گل رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب بھی ان حالات میں سخت پریشان تھے ان پر سینکڑوں کام کا سخت پریشر تھا مگر پھر بھی انہوں نے مجھ پر اعتماد جاری رکھا اور میرے کہنے پر حیدر نوری پریت نگر بخودی مگر کچھ حاصل نہ ہو رہا تھا۔

میری سخت جدوجہد اور ہر ممکن اقدامات پر اہل پریت نگر بھی مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور سونیا بھی مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھی انہی دنوں میں بھی دل سے مجبور ہو گیا اور تیزی سے سونیا کی طرف مائل ہونے لگا اور دھیرے دھیرے ہماری انتہائی خفیہ ملاقاتوں نے محبت کا روپ دھار لیا ہماری محبت خالص اور پاکیزہ تھی مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگے اور اس تڑپ کے باوجود بھی میرے فرائض میں کوئی کوتاہی نہ آئی اور میں مسلسل اپنے کام پر مکمل توجہ دے رہا تھا۔

میرے عملے نے انتہائی جانفشانی سے کام کیا اور کافی حد تک مختلف پیشہ ورانہ مہارتوں کی مدد سے ہم نے ان واقعات پر قابو پایا مگر جب تک قاتلوں کا سراغ نہ ملتا ہم کسی صورت چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ایک دن میں تھانے میں براگر لیس رپورٹ لکھنے میں مصروف تھا کہ سونیا نے مجھے کسی نوکرانی کے ہاتھ خط بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا۔

مسنر خالد السلام علیکم!

آج میں آپ کی محبت کا امتحان لیتا چاہتی ہوں اگر آپ پورا اترے تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ آپ بھی مجھ سے میری طرح سچی محبت کرتے ہیں اگر ناکام ہوئے تو آج سے ہماری محبت ختم لہذا آج آپ کو مجھے حویلی میں ملے آنا ہوگا اور وہ بھی رات کو اور دیر سے بھی گاؤں میں روکنا ہونے والے واقعات کا حویلی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ کچھ خاص لوگ میرے ابو کو پھنسانے کے لئے ڈرامہ رچا رہے ہیں اب گاؤں میں خفیہ ملاقاتیں کرنا کافی دشوار ہو رہا ہے اسی لئے ہمیں

اب حویلی میں ہی ملنا چاہئے تاکہ ہم بلا خوف و خطر ملنے کی سہری ملاقاتوں سے لطف اندوز ہو سکیں آخر کب تک ہم جوانی کی تڑپ کو جسموں میں قید رکھیں؟ امید ہے آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ آج رات حویلی میں ضرور آئیں گے مگر یاد رہے آپ نہ آئے تو پوری زندگی میرا چہرہ دیکھنے سے محروم رہیں گے۔ والسلام۔

صرف آپ کی سونیا

پہلے تو میں سونیا کی اس حرکت اور خواہش پر حیران ہوا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حویلی جانے کا ارادہ کیا اور دیے بھی میں حویلی میں جا کر بند کمرہ کھولا چاہتا تھا تاکہ میرا کمرے والا سنسن دور ہو۔

میں نے سونیا کی بات مان لی اور خط میں لکھ دیا کہ میں اپنی جان کو ملنے آج رات حویلی میں ضرور آؤں گا۔

رات کے 11 بجے میں اپنے کمرے سے نکلا اور بہت احتیاط سے حویلی کی جانب چل پڑا، گرمی بہت زیادہ تھی ہر طرف ہوکا عالم تھا حویلی گاؤں سے ڈرا باہر بنی ہوئی تھی راستے میں بہت بڑا قبرستان تھا جس کے قریب سے گزرتے وقت دل ڈرا سا خوف محسوس کر رہا تھا مگر ایک تو محبوب سے ملنے کی خواہش مردوسرا کر رہے کاراز جانا میرے لئے بہت بڑی بات تھی۔

حویلی پر پہنچتے ہی سونیا نے مین گیٹ پر پیرا پر تپاک استقبال کیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی اور نہایت پیار اور شوق سے بولی۔ ”جلدی سے اندر چلئے کوئی دیکھ نہ لے۔“ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ حویلی کے ارد گرد کوئی پہرے دار موجود نہیں سونیا صورتحال کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ”جناب بے فکر رہئے آج کوئی پہرے دار نہیں آیا۔“ میں فوراً بولا۔ ”کیوں؟“

تو وہ میرے بالکل قریب آ کر بولی۔ ”کیونکہ آج ہمارے حقیقی ملن کی رات ہے اس لئے ا“ اور مجھے نہایت پیار سے حویلی کی دوسری منزل پر موجود اسی بند کمرے کے دروازے پر لے گئی اور بند کمرے کا تالا

## اسماء الحسنی۔۔۔ کامیابی کا راستہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو	جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح	اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا
گھر بیلنا چاہتی	کاروباری بندش
جنات کا سایہ	دیگر مسائل

**سید فرمان شاہ** کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دیکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

سراں میں بھوسہ کی آکھ کا تار تین کتے ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تو یہ ہے آپ کی اجزی ہوئی زندگی خواہش میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آرزو مانجیے ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیوں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔ نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

اچھرہ سٹاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان  
**سید فرمان شاہ**  
0300-6484398

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل جس علم سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاندان سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دیکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آرزو مانجیے ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیوں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔ نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

اچھرہ سٹاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان  
**سید فرمان شاہ**  
0300-6484398





وہ بدروح بری طرح سے چیختے اور چلانے لگی اس کے جسم میں آگ لگنا شروع ہو گئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے فرش پر بیٹھنے لگی۔ پھر بولی۔ ”اے اللہ کے نیک انسان آج اس مبارک لاکٹ کی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی لہذا تم باہر جا سکتے ہو۔“ اور واقعی اب کمرے میں دروازہ نمودار ہو چکا تھا پھر وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ”مگر تمہیں قسم ہے اس ہستی کی جس کے نام کا تم نے لاکٹ کاہن رکھا ہے پلیز یہاں ہونے والے واقعہ کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“

میں فوراً بولا۔ ”نہیں بلکہ آج میں تمہیں ختم کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا کیوں کہ میرے مرشد پاک نے ہمیشہ برائیوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور وہ ہمیشہ شکر و ختم کرتے تھے۔“

وہ فوراً بلند آواز سے بولی۔ ”جب تک میرا انتقام ختم نہیں ہو جاتا تم مجھے کسی صورت ختم نہیں کر سکتے اور یاد رکھنا تمہارا انجام بھی انتہائی خطرناک ہوگا۔“

میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”تمہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم دے کر کہتا ہوں مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور بے قصور لوگوں کو اتنی بے دردی سے کیوں ختم کر رہی ہو؟“

وہ نرم لہجہ کرتی ہوئی بولی۔ ”انجیکٹر اتنی بڑی ہستی کی قسم تم نے مجھے کیوں دی؟“

پھر وہ رونے لگی اس کی آواز میں انتہائی دکھ اور گہرا درد محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل سے غم آنسو بہ کر نکل رہا تھا روتے روتے اچانک وہ خوب صورت لڑکی کے روپ میں آ گئی مگر وہ روپ سونیا کا نہیں بلکہ اس کا اپنا تھا اور وہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میرے جسم سے درد کی ٹھیس اٹھ رہی تھیں میں نے بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر بیٹھنے کی کامیاب کوشش کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا پھر میں نے اس سے کہا۔ ”اب بولو۔“

تو اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں

حیران ہو گیا کہ اتنی بھیاں کہ اور کونفک چڑیل کی جگہ اب نہایت خوب صورت لڑکی موجود تھی۔ جسے دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا کہ حضرت انسان کتنا بے بس ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود وہ اپنا رنگ بدلنے پر بھی قادر نہیں مگر اللہ نے اس مخلوق کو روپ بدلنے تک کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ پھر سوچا جو میرا پروردگار کرتا ہے بہت بہتر کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر حال میں خدائے واحد کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے کیونکہ میں بھی ایک کامل انسان کی وجہ سے ہی آج زندہ بیٹھا ہوا تھا۔

پھر وہ دھیرے سے بولی۔ ”انجیکٹر صاحب! میں نے آج تک جتنے بھی لوگوں کو قتل کیا ان سب کا ذمہ دار چوہدری ہے۔“

میں فوراً حیرت سے بولا۔ ”وہ کیسے؟“ کیونکہ شروع سے میں بھی اسی پر شک کر رہا تھا۔ وہ گہرا اور لمبا سانس لے کر بولی۔

”میرا نام رضیہ تھا میرے گھر والے پیار سے مجھے رجو کہہ کر پکارتے تھے ہم لوگ ساتھ والے گاؤں میں رہائش پذیر تھے ہم لوگ بہت عزت دار اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے ہم سب چچا تایا وغیرہ کے ہمراہ اکٹھے ہی رہتے تھے مگر یوں اخلاقات کے باوجود ہم سب ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ غرضیکہ زندگی جنت کی مانند گزر رہی تھی۔“

ایک شام میں کسی ضروری کام کی وجہ سے گھر سے باہر نہر کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گاڑی سے دوا پکار لکے اور مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔ انہوں نے میرے ناک پر کوئی کپڑا رکھا جس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا اور میں محض راحت کرنے سے محروم رہی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسی کمرے میں پایا۔ جہاں ہم موجود ہیں رات کافی بیت چکی تھی ابھی مجھے ہوش آئے محض اسی وقت گزرا تھا کہ تین آدمیوں سمیت چوہدری کمرے میں داخل ہوا اور آتے

ہی شیطانی انداز سے بولا۔ ”رجو کیسی ہو میری جان تمہارے حسن نے تو مجھے پاگل ہی کر دیا۔ تمہیں تو میں نے کئی بار بھجایا تھا کہ میری ہانپوں میں آ جاؤ، مالا مال کروں گا مگر تم مجھے ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھی۔“

مگر آج تو میں پوری رات اپنی پیاس بجھاؤں گا ارے دل تو کرتا ہے کھانا ہی جاؤں تمہیں۔“ چوہدری کے خوفناک ارادے کو دیکھ کر میں نے روتے ہوئے اس کی منت سماجت شروع کر دی مگر اسے مجھ پر کوئی ترس نہ آیا اور اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے مجھے بیڈ کے اوپر باندھ دیا اور میرے کپڑے اتارنے لگا۔

میں نے غصے سے اسے کہا۔ ”تو بہت بڑا مکار اور منافق ہے گاؤں والوں کے سامنے بڑا نیک اور معزز بنا چھتا ہے یہ بھی نہیں سوچتا کہ تیری میرے جیسی ایک جوان بیٹی ہے تو شیطان ہے لفت ہے تم پر۔ یہاں سے باہر جا کر میں سب کو تیری اصلیت بتاؤں گی ڈرتی نہیں میں تم سے۔“

اور غصے سے پاگل ہو کر اس کے منہ پر تھوک دیا اور چوہدری نے مجھے پھینک کر دیا اور گاڑیاں دینا شروع کر دیں اور میں نہانے کیا کیا خطاب اسے دیتی رہی مگر وہ غصے سے پاگوں کی طرح میرے جسم کو نوچنے لگا جیسے بھوکا کتا کھانے پر ٹوٹا ہے۔ بے غیرت نے دل بھر کر اپنی ہوس پوری کی اور پھر باقی تینوں کتوں کو مجھ پر چھوڑ کر براہ راست گھناؤنا منظر دیکھتا رہا اور شراب پیتا رہا۔

جب سب کتوں نے اپنی ہوس پوری کر لی تو ایک کتا بولا۔ ”چوہدری صاحب اس کا زندہ رہنا اب ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لئے اسے.....“ چوہدری نے بات کاٹتے ہوئے کہا ماڈالو اس کتیا کو اور اسی بیڈ کے نیچے گڑھا کھود کر دفن کر دو اور اوپر بیڈ رکھ دو پوری زندگی کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوگی یہی مجھ پر یعنی چوہدری رفاقت پر تھوکتی ہے۔“

پھر مجھے بے دردی سے قتل کر کے اسی بیڈ کے نیچے دفن کر دیا گیا اتفاق سے وہ رات اماؤں کی رات تھی

اور اسی نسبت سے شیطان اس رات حویلی میں کسی خاص عمل اور مقصد کی وجہ سے موجود تھا جس نے کسی خاص عمل کی وجہ سے میری روح پر قبضہ کر لیا۔

اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں بدلہ لینا ہے ان تمام حرام زادوں سے جنہوں نے تمہیں مکمل طور پر برباد کر دیا مگر یاد رکھنا تم اس حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکو گی البتہ میں اپنی شکلوں سے تمہیں ایک خاص شکلی دیتا ہوں وہ یہ کہ تم کسی بھی عورت کا روپ دھار سکو گی اور ٹوٹ پڑو اپنے دمنوں پر۔“ تب میں نے ان تمام لوگوں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو ہر کسی کی عزت سے کھیلنا اپنا مشغلہ سمجھتے ہیں۔

میں روزانہ سوچ سوچ کر روتی تھی کہ میرے والدین اور خاص طور پر میرے اکلوتے بھائی کا میری عدم موجودگی میں کیا حال ہوگا لوگ تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ شاید میں کسی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں۔ گاؤں والوں نے میرے متعلق طرح طرح کی باتیں کر کے میرے گھر والوں کی زندگی اجیرن بنا دی ہوگی۔ ہائے! میرے گھر والے۔ پھر میں نے باقاعدہ اپنے کام کا آغاز کیا۔

اور پھر سب سے پہلے میں نے اپنی خاص شہتی سے ان تینوں کتوں کو حویلی میں بہت خوب صورت لڑکی کے روپ میں بلایا اور وہ بے غیرت ہوس کے مارے یہ بھی بھول گئے کہ انہوں نے یہاں کسی بے گناہ کو بے دردی اور سفاکی سے قتل کر کے دفن کیا ہوا ہے لہذا میں باری باری ان ہوس کے ماروں کو قتل کر کے حویلی کے تالاب میں پھینک دیتی تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس اور بے چینی دیکھ کر مجھے تسکین ملے۔

میں نے بہت کوشش کی کسی طرح چوہدری رات کے وقت حویلی میں آ جائے مگر وہ بے حد ہوشیار ثابت ہوا اسے کسی خاص عامل کی وجہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ گاؤں میں ہونے والے والے واقعات میں کسی بدروح کا کام ہے اور وہ صرف رات کے وقت ہی کسی نقصان پہنچا سکتی ہے اس لئے وہ کسی صورت حویلی میں نہ آ سکا۔



میں جلد ہی ہوں کے مارے لوگوں کو ٹھکانے لگانے لگی، لوگوں کو دروغ لگانے کے لئے روپ بدلنے والا ہتھیار میرے بہت کام آیا کبھی میں کسی خوبصورت لڑکی کا روپ دھاریتی اور کبھی ان کی محبوبہ بن جاتی جس کی وجہ سے شکار آسانی سے میرے چنگل میں پھنس جاتا اور بھر دھیرے دھیرے یہ بے غیرت لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے اور شکار کا خون شیطان پیتا اور مجھے مزید ہلکتیاں دیتا۔

باتیں کرتے کرتے وہ خاموش ہو گئی اور اپنے والدین کو یاد کر کے رونے لگی اور میں سوچنے لگا۔

حیرت ہے ایسے لوگوں پر جو اللہ کی عائد کردہ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور صرف چند لمحوں کی لذت کی خاطر اپنی زندگی گنوا دیتے ہیں نیز یہ کہ زنا کی اتنی خطرناک اور بھیانک سزا ان کو دنیا میں ہی مل گئی تو آخرت میں ان کا کیا ہے گا اور اپنے مالک و خالق سے دعا کرنے لگا کہ یا اللہ تمام مسلمانوں کو مجھ سمیت زنا جیسے گناہ عظیم سے بچاؤ اور مرنے والوں کے گناہ معاف فرما کر جنت الفردوس میں ان کو جگہ عطا فرما۔

پھر رجو بولی۔ ”کہاں کھو گئے انسپکٹر صاحب!“

”میرے پوتے سے پہلے ہی وہ بولی۔“ آپ بھی میرے ہاتھوں سے مارے جاتے مگر آپ کو مبارک لاکٹ نے بچالیا۔“

میں نے کہا۔ ”بیجانے والی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ اب تم لوگوں کو قتل کرنا چھوڑ دو کیونکہ کسی کو دروغ لکھ کر اسلام میں جائز نہیں اور ویسے بھی تم تینوں دشمنوں کو ختم کر چکی ہو اور رہی بات چوہدری کی تو مجھے اس پر پہلے دن سے ہی شک تھا اسے اب قانون بہت سخت سزا دے گا۔“ رجو فوراً غصے سے پھٹکارتی ہوئی بولی۔

”نہیں وہ میرا شکار ہے صرف میرا اسے بس میں ہی ختم کروں گی تم کسی بہانے رات کو اسے یہاں لے آؤ۔“

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ قانون اسے

عبرت ناک سزا دے گا تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو مگر اس نے کہا۔ ”میری روح کو چین صرف اسی وقت آئے گا جب میں خود اپنے ہاتھوں سے اس خبیث چوہدری کو قتل کر دوں گی۔“

ابھی میرے دل میں ایک بات آئی میں نے رجو سے پوچھا۔ ”اگر تم چوہدری کو ختم کر ڈالو تو کیا پھر بھی قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھو گی؟“

رجو گہرا سانس لے کر بولی۔ ”ہاں کیونکہ جب تک ہوں پرست شیطانوں کا اس گاؤں سے خاتمہ نہیں ہو جاتا میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔“

میں نے پھر اسے حضرت سلمان علیہ السلام کا واسطہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم کسی قتل نہیں کرو گی۔“ وہ بولی۔ ”ایک تو آپ مجھے اتنی مبارک ہستی کا واسطہ دیتے ہو تو میں مجبور ہو جاتی ہوں اوکے مجھے منظور ہے اب میں چوہدری کے علاوہ کسی اور کو قتل نہیں کروں گی مگر آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

میں فوراً سانس سے بولا۔ ”ہاں بولو۔“

رجو بولی۔ ”میں مسلمان ہوں اس کمرے میں بیڈ کے نیچے میری بے کور و کفن لاش موجود ہے جسے اسلامی رسومات کے مطابق دفن نہیں کیا گیا لہذا جب تک میری لاش کو باقاعدہ اسلامی طریقوں کے مطابق قبرستان میں دفن نہیں کیا جاتا میری روح یونہی پھلتی رہے گی۔“

تو میں نے رجو سے کہا۔ ”تم مجھے اپنا کچھ کچھ پر اعتماد کرو میں اس وعدے کو ضرور پورا کروں گا۔ مگر تمہیں بھی میری بات ماننا ہوگی۔“ میری بات سن کر بلند آواز سے رونے لگی۔ ”جی میں ہر بات مانوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”تم چوہدری کے قتل سے باز رہو گی۔“ میں بحیثیت بھائی اپنی بہن کے مجرم کو مہر تاک سزا دلوں گا کیونکہ کوئی بھی غیرت مند بھائی اپنی معصوم بہن کی عزت لوٹنے والے کو نہیں بخشے گا۔“

وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور میں نے موقع کی مناسبت سے اخلاقی اور دینی دلائل سے اسے قائل

کرنے کی کامیاب کوشش کی آخر وہ مان گئی۔ اور میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے حویلی سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اذان فجر شروع ہو گئی میں نے مسجد میں باجماعت نماز ادا کی پھر ناشتہ کر کے تھانے پہنچ گیا کچھ ضروری کام ختم کرنے کے بعد میں نے چوہدری کو تھانے بلایا اور وہ آتے ہی بولا۔ ”انسپکٹر صاحب حیرت تو ہے آج سویرے سویرے مجھے تھانے بلالیا۔“

میں نے چوہدری سے کہا۔ ”مبارک ہو جناب قاتل کا سراغ مل گیا ہے۔“

چوہدری کے چہرے سے حیرت اور مصنوعی خوشی واضح محسوس ہو رہی تھی۔

پھر چوہدری بولا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے قاتل کو ہر حال میں جبر تاک سزا ملنی چاہیے۔ جس نے کتنے ہی گھر اے اجاڑ دیئے۔“

میں فوراً بولا۔ ”ضرور ملے گی!“

میں نے دھیرے سے چوہدری سے کہا۔ ”جناب مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان تمام واقعات کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔“

اور پھر وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ ”انسپکٹر صاحب وہ کیسے؟“ میں طنز اور پیار سے بولا۔ ”جناب رجو کو تو جانتے ہی ہوں گے۔“

چوہدری یہ بات سن کر چونک اٹھا اس کی یہ حالت اس کے گناہ کی تصدیق کے لئے کافی تھی اس کی تو جیسے زبان ہی بند ہو گئی۔

”م.....م..... میں نہیں جانتا کسی رجو کو تم کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر؟“

پھر رات ہونے والا سارا واقعہ میں نے چوہدری کو سنایا اس نے میری بات نہ صرف ماننے سے انکار کر دیا بلکہ لانا مجھے دھمکیاں دینے لگا کہ تم مجھے جانتے نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں تمہاری پجت اسی صورت میں ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو اور اصل قاتل کو ہمیشہ پھوٹ پکڑ دینا میرے بازیاں بند کرو۔“

اور غصے سے دھمکیاں دیتا ہوا تھانے سے نکل گیا۔

ہیڈ آفس رابطہ کرنے سے پہلے میں چوہدری سے ایک ملاقات کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ پھر چوہدری سے ملاقات کرنے کے بعد میں نے مکمل رپورٹ ہیڈ آفس پہنچادی اور مزید فوری طلب کی تاکہ بھرپور اور فیصلہ کن کارروائی کرنے میں مزید آسانی ہو۔

میں نے گاؤں سے بزرگ لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کو آگاہ کیا کہ کس طرح چوہدری نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کی عزت لوٹ کر اسے قتل کر کے حویلی میں موجود ہمیشہ بند رہنے والے کمرے میں دفن کر دیا تھا اب اسی لڑکی کی بے چین روح گاؤں والوں سے بھیانک انتقام لے رہی ہے۔ مگر ان کی آنکھوں پر چوہدری کے اعتماد کی بنی بندھی ہوئی تھی وہ لانا مجھے برا بھلا کہنے لگے کہ ”انسپکٹر صاحب کچھ شک نہیں کہ آپ ایک اچھے اور بہادر پولیس آفیسر ہیں مگر ایک نہایت اچھے اور معزز انسان پر الزام لگانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔“

لیکن میں نے سخت لہجے میں ایک بار پھر چوہدری سے درخواست کی کہ مجھے حویلی کا بند کمرہ کھولنے کی اجازت دے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا پھر میں نے اپنے سینئرز سے رابطہ کر کے ان سے اس بند کمرے کو کھولوانے کے لئے خصوصی درخواست کی اور ساتھ ہی رجو کے گھر والوں کو اطلاع بھی کر دی جسے سن کر رجو کی پوری ہستی ہی تھانے میں پہنچ گئی۔

سب لوگ جمع ہو چکے تھے کچھ جو شیلے نو جوان بھی پریت نگر سے ہمارے ساتھ مل گئے، نوبت خطرناک لڑائی تک پہنچ چکی تھی پولیس کی تازہ فوری بھی آچکی تھی اب چوہدری کے پاس صرف وہی راستے تھے یا تو بند کمرہ کھولنے دینا یا اپنا گھناؤنا جرم قبول کر لیتا۔

آخر قانون کی سختی اور کچھ پورے علاقے کے مسلسل اصرار ہاتھوں چوہدری کی انکلوٹی جینی سونیا کی ضد پر چوہدری حویلی میں موجود کمرہ کھولنے پر آمادہ ہو ہی گیا جلد ہی ہم سب حویلی کے اندر موجود تھے۔ ایک بہت بڑا جھوم حویلی کے ارد گرد اور اندر موجود تھا ان سب



## آسیب گھر

مریم فاطمہ - کراچی

خوبرو لڑکی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا اور جب باہر دیکھا تو ایک کالی بلی اپنی غضب ناک نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی کہ پھر اچانک بلی اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔

دل پر کتنی طاری کرتی اور خوف کے شے میں جکڑتی عقل میں نہ آنے والی ڈراؤنی کہانی

”چلو بچو! ہاں لکھو ہمارا نیا گھر آگیا۔“ مسٹر جمرو نے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر سے پیچھے جوبانا اور میٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جوبانا سترہ سالہ خوب صورت شہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ جبکہ دوسری طرف میٹ ان کا گھر بھولے بالوں اور سترہ آنکھوں والا اٹھارہ سال کا بیٹا تھا۔ یہ تین لوگوں کی فیملی تھی۔ ان کی والدہ دو برس پہلے انتقال کر گئی تھیں۔

اپنی بیوی کے مرنے کے بعد مسٹر جمرو کا اپنے گاؤں والے گھر میں دل نہ لگا اور وہ اس گھر کو کوچ کر شہر میں یہ نیا گھر خرید بیٹھے۔ یہ گھر خاصا پرانا تھا۔ اور مسٹر جمرو نے بچوں کو یہاں لانے سے پہلے ہی اس گھر کی حالت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ گھرانہ دونوں کی توقع سے بھی بڑھ کر کہیں زیادہ بوسیدہ حالت میں نکلا۔ سامنے

دہاں سے اٹھانا شروع کر دیا اور کافی بلندی پر لے گیا اور چوہدری گھبرا کر چٹھیں مارنے لگا تب رجو نے چوہدری کو آخری بار خبردار کیا کہ اپنے جرم کا اعتراف کرو ورنہ ابھی چھوڑ دوں گی تو اس بار چوہدری فوراً سب کے سامنے اونچی آواز میں بولا۔

”ہاں میں اپنے گھناؤنے جرم کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ہی رجو کی عزت لوٹ کر اسے قتل کروا ڈالا تھا۔“ اور رجو کے ہتھوں کی آوازیں فضا میں بلند ہونے لگیں جن میں خوشی اور غمی دونوں کا یکساں اظہار محسوس ہوا تھا۔

پھر رجو نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے چوہدری کو تالاب کے قریب زمین پر رکھ دیا اور کہا۔ ”بھائی خالد اب آپ خود اسے سزا دلوائیے اور میری لاش کو غسل دے کر باقاعدہ نماز چناڑہ پڑھ کر اسلامی رسومات کے عین مطابق قبرستان میں دفن کرویں تاکہ میری روح کو حقیقی خوشی میسر ہو۔“

پھر میں نے کانشیل سے کہا۔ ”چوہدری کو گرفتار کر لو۔“ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی کانشیل آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ جلی میں موجود ایک بہت بڑے اور پرانے درخت سے ایک سیاہ سانپ بالکل چوہدری کے اوپر گرا اور چوہدری کو تین چار بار مختلف جگہوں سے ڈس لیا اور چوہدری چند ہی لمحوں میں تڑپ تڑپ کر لقمہ اہل بن گیا اور اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

پھر ہم سب نے مل کر رجو کی میت کو اس کی تمام خواہشات کے مطابق قبرستان میں دفن کیا اتفاق سے دونوں یعنی رجو اور چوہدری کی قبریں بالکل ساتھ ساتھ بنیں۔ فاتحہ پڑھتے وقت مجھے آسمان کی جانب سفید اور پر نور دھوئیں سے رجو انتہائی خوش ہو کر الوداع کہہ رہی تھی اور تھوڑی دیر میں وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔



کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہر حال میں قاتل کو پکڑ کر اسے عسرتاک سزا دی جائے۔

بڑی مشکل سے دروازہ کھولا گیا دروازہ کھلتے ہی اندر سے بدبو کے سمجھو کے اڑنے لگے کمرہ اندر سے انتہائی بوسیدہ اور غلیظ نظر آ رہا تھا حالانکہ جب میں رجو سے ملا تھا تب یہ انتہائی خوب صورت نظر آ رہا تھا پھر میں جلد ہی سمجھ گیا کہ رجو نے اپنے شکار پھانسنے کے لئے اس کمرے کو مصنوعی آراستہ کیا ہوگا۔ پھر رجو کی بتائی ہوئی جگہ سے لاش نکال لی گئی جو حیرت انگیز طور پر بالکل سلامت اور تازہ محسوس ہو رہی تھی اور لاش نکلتے ہی کمرے میں موجود بدبو انتہائی خوب صورت خوشبو میں تبدیل ہو گئی جسے ہر سمجھ دار آدمی نے واضح محسوس کیا شاید یہ رجو کی بے گناہی ثابت کرنے کا ذریعہ بھی۔

میں نے چوہدری کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”جی چوہدری صاحب اب آپ کیا کہتے ہیں۔“

تو وہ فوراً ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں مجھے لگتا ہے یہ میرے کسی دشمن کی چال ہے اور انکسپکٹرم بھی اس سے ملے ہوئے ہوتا کہ مجھے پھنسا یا سکے۔“ اور لوگوں سے متوجہ ہو کر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے جھوٹی تسمیں کھانے لگا۔

اسی وقت کمرے سے ایک سیاہ دھواں بلند ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سفید بولہ نظر آنے لگا سارے بجوم کی سسٹن سے بھر پور نظریں اس بولے پر مرکوز تھیں۔

پھر اس بولے سے رجو کی آواز بلند ہوئی جو چوہدری سے مخاطب ہوئی۔ ”اے غیبت چوہدری اپنے گناہ کا اقرار فوراً سب کے سامنے کرو ورنہ ابھی تجھے جہنم رسید کرتی ہوں۔“

آواز میں جتنی نفرت، غصہ اور رعب شامل تھا۔ خلاف توقع چوہدری نے اب بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیا دراصل وہ ہر حال میں اپنا مجرم سب کے سامنے دکھنا چاہتا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس بولے نے چوہدری کو

ڈاکٹرول، حکیمول، ماہرین طب، ہدایات لکھی گئی مفید کتاب

## کولیسٹرول اور علاج

قیمت - 100 روپے

اس کتاب میں، کولیسٹرول کی حقیقت، کولیسٹرول اور ہماری خوراک، کن غذاؤں سے کولیسٹرول بڑھتا ہے، کولیسٹرول کس طرح کم کریں، چھلی، بیشی اشیاء، زیادہ نمک نہ کھائیں، کولیسٹرول اور دل کے امراض، دل میں درد، ہارٹ ایک کی ایک اہم وجہ، احتیاطی تدابیر، ہومیوپیتھی کی دوائیں، دل کے امراض کی وجوہات، موٹاپا، مچھلیوں میں کولیسٹرول کے فوائد، مچھلی اور دودھ، مناسب مائع، کولیسٹرول کا ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی علاج، کولیسٹرول کا طبی علاج، چربی سے پرہیز کیجئے، کھانے پینے کی اشیاء سے کولیسٹرول کم کیجئے، اور بہت کچھ پڑھنے کولیسٹرول کے بارے میں کہ کس طرح کولیسٹرول سے محفوظ رہا جائے، اور کون کون سی ورزشوں سے کولیسٹرول کو کم کیا جاسکتا ہے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

دعابک کارنر، ٹی ٹی 5 فیصل آباد

ہو رہا تھا۔ یہ بات اسے ڈرائے دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک پڑی اس نے پاس میں پڑا میٹ کا Bat اٹھایا اور ہمت کر کے آگے بڑھی۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور مسٹر جنرل کے ہمراہ میٹ اندر داخل ہوا۔ ”اومانی گاڈ یہ تو آپ دونوں ہیں۔“ جوہانا ہانپتے ہوئے بولی۔ ”کیوں تمہیں کیا لگا تھا۔“ مسٹر جنرل نے ہنسنے لگا۔

”مجھے لگا کہ کوئی۔۔۔۔۔“ اور اس نے جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔

”تمہیں ضرور لگا ہوگا کہ چور یا ڈاکو تمس آئے ہیں۔“ مسٹر جنرل کی بات پر وہ بے گردن ہلا کر رہ گئی۔ انہیں یہ تو بتانا نہیں سکتی تھی کہ اسے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی بھوت ہے۔ دوپہر کو کھانے میں ان لوگوں نے مینڈو چڑکھائے۔

☆.....☆.....☆

اس رات بڑے زوروں کی بارش ہوئی۔ کالے سیاہ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے میں جوہانا اپنے کمرے میں بستر میں لیٹی آرام کر رہی تھی کہ تب ہی اسے لگا کہ کوئی کمرے کا دروازہ کھرج رہا ہے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تو پہلے ہی اس گھر سے ڈری ہوئی تھی۔ لیکن ہمت کر کے ابھی اور دروازہ کھول دیا، اب جو سامنے دیکھا تو ایک کالے رنگ کی بلی دروازہ کھرج رہی تھی۔ جوہانا نے اسے دیکھ کر ہلکی سی چیخ ماری۔ اور بلی ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ دوسری طرف چلی گئی۔ جوہانا جلدی سے آگے بڑھی اور میٹ کے کمرے میں گھس آئی۔ ”میٹ لگتا ہے پڑوسیوں کی بلی ہمارے گھر میں گھس آئی ہے۔“

”پڑوسیوں کی بلی؟“ میٹ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں پڑوسیوں کی بلی۔“ جوہانا نے کہا اور میٹ کو ساتھ لے کر پورا گھر چھان مارا لیکن وہ بلی پھر دوبارہ کہیں دکھائی نہ دی تو میٹ نے اسے اس کا وہم

لیکن جوہانا کو دور دور تک غنڈ نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی کمرے کی چڑیوں کو گھور رہی تھی۔ ہر چڑی اسے گھورنی محسوس ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ بستر سے اٹھی اور میز پر سے دوور بین اٹھا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ سامنے والا گھر خالی پڑا تھا۔ مسٹر جنرل نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا جبکہ اچانک ہی جوہانا کو لگا کہ سامنے ٹھہری میں کوئی ہے۔ لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہولہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ اب سوائے تاریکی اور اندھیرے کے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جوہانا سوچ میں پڑ گئی کہ آخر وہاں کیا تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ دیکھنے بھی بیچ جاتی لیکن اس وقت رات ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے دوور بین واپس اپنی جگہ رکھی اور کھیل اوڈھ کر لیٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز گھر کے تینوں فرد صبح ہی صبح بیدار ہو گئے۔ جوہانا کو کل رات والا واقعہ یاد تھا۔ لیکن اس نے ناشتے کی میز پر کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مسٹر جنرل کچھ ضروری سامان وغیرہ لینے بازار چلے گئے۔ میٹ گھر پر بور ہو رہا تھا۔ سو وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

جوہانا کو لگا کہ یہ اچھا موقع ہے، اس بات کا پتہ چلانے کا کہ کل رات باہر کون تھا۔ یہ جاننے کے لئے اس نے سوئٹر اور منظر ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکلی وہ سیدھی چلتی ہوئی اس گھر کے سامنے رک گئی۔ تب ہی اچانک اس گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ مکرراتا ہوا باہر نکلا۔ جوہانا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بچے نے شرماتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”ہنری۔“ اس بچے نے مختصر سا جواب دیا۔ ”تم اندر کیا کر رہے تھے۔ یہ گھر تو بند ہے۔“ ”میں یہاں ٹھینے آتا ہوں۔“ ہنری نے کہا اور ایک طرف بھاگ گیا۔

جوہانا کو وہ بچہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ واپس اپنے گھر آ گئی۔ لیکن اسے مسلسل کسی کی موجودگی کا احساس

لان میں ایک بہت بڑا درخت تھا۔ جس پر کسی مخصوص قسم کے پھر لگے ہوئے تھے۔ یہ کچھ کریمٹ بہت خوش ہوا۔ اب تینوں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آ چکے تھے۔ ”واہ! کمال ہو گیا۔ ہمارا خود کا اپنا لان۔“ میٹ نے کہا۔

”مجھے تو یہاں ڈر محسوس ہو رہا ہے۔“ جوہانا نے خود میں سٹپتے ہوئے کہا۔

”ڈرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ گھر بس تھوڑا پرانا ہے۔ اس لئے تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ تھوڑی سی محنت سے ہم اسے بالکل نئے جیسا بنا دیں گے۔“ مسٹر جنرل نے کہا۔ اور پھر وہ گاڑی میں سے سامان نکالنے لگے۔

جوہانا کو نامعلوم کیوں اس گھر سے خوف آ رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔ اور گھر کو بغور جانچنے لگی۔ ”تمہیں پسند آئے گا۔ ویسے بھی یاد کرو تم اکثر کہا کرتی تھی کہ گاؤں کی زندگی بہت ہی پور کروینے والی ہوتی ہے۔“ میٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی گھر میں سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تو تینوں ہی چونک پڑے۔

”اودہ میرے خدا وہ کیا تھا ڈیڈ۔“ جوہانا نے گھبرا کر پوچھا۔

مسٹر جنرل اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے آگے آئے۔ تب ہی کڑی ہلکی اور ایک شریر سا نظر آنے والا بچہ باہر نکل کر بھاگا۔ مسٹر جنرل نے دیکھے۔

”مجھے تو لگا کہ کوئی بھوت ہے۔“ جوہانا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو جوہانا تمہارے نئے گھر کا بھوت۔“ مسٹر جنرل نے اس بھاگتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میٹ ہنس دیا۔ پھر یہ لوگ باری باری کر کے سامان اندر لے کر جانے لگے۔

سارا دن انہیں کام کرنے میں لگ گیا۔ اور اس رات وہ لوگ جلدی ہی سونے کے لئے لیٹ گئے۔



قرار دیا۔ لیکن جوہانا بھندھی۔

پھر کچھ خیال آتے ہی وہ بولی۔ ”آؤ تمہیں دکھائی ہوں بلی کے بچے کے نشانات، اس نے اپنے بچوں سے دروازے کو کھرا چاہے۔“ لیکن اب جو میٹ نے وہاں دیکھا تو کوئی نشان نہ تھا۔ ”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔“ میٹ نے بے زار لہجے میں کہا۔ ”میں تو سونے جا رہا ہوں۔“ وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور جوہانا چھپے میں پڑ گئی۔ وہ رات اسے وقفے وقفے سے بلی کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ خوف سے سہمی ہوئی بستر میں دبکی رہی۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دیکھتی کہ کیا وہ بلی واپس آ گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ میٹ سے کل صبح پوچھنے کی کہ اس نے بعد میں کسی بلی کے بولنے کی آواز نہ سنی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد میٹ لان میں لگے بیر کے درخت پر سے ہر توڑ رہا تھا کہ جوہانا اس کے پاس چلی آئی۔ ”میٹ کیا تم نے رات کو کسی بلی کی آواز سنی۔“

”پھر وہی بکواس۔ ارے نہیں سنی یار۔ تم ایک کام کرو کہ ایک چکر لائبریری کا لگا آؤ۔ تھوڑا دل بہل جائے گا ورنہ گھر بیٹھے بیٹھے تم بھوت پریت کی باتیں سوچتی رہو گی۔“

جوہانا نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور لائبریری کی طرف چل دی۔ لائبریری میں اس نے گھوسٹ اسٹیکو پیڈیا پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنا چاہتی تھی، پھر لائبریری سے واپس آ کر وہ سیدی میٹ کے کمرے میں چلی آئی۔ ”میٹ تم جانتے ہو میں نے لائبریری میں بیوقوفوں اور چڑیلوں کے بارے میں کتاب پڑھی ہے۔ اور پتا ہے مجھے کیا معلوم ہوا۔“

”اوہ تم وہاں بھی یہ فضول مسئلے کے پیچھے رہی۔“ میٹ بے زاری سے بولا۔ ”تم واقعی پاگل ہو گئی ہو۔“

”میٹ یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں نے پڑھا کہ جو گھر زیادہ عرصے تک کے لئے خالی رہتا ہے وہاں بھوت پریت حکومت کرنے لگتے ہیں اور وہ بلی کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور کل رات میں نے بلی ہی دیکھی تھی۔“

”لیکن میں نے نہیں دیکھی تھی ذرا اپنی عقل استعمال کرو جوہانا اگر یہاں بھوت یا چڑیلیں ہوتیں تو وہ صرف تمہیں ہی کیوں تنگ کر رہی ہیں۔ مجھے اور ڈیڈ کو تو ابھی تک انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بس چپ ہو جاؤ اور میری بات سنو! ابھی جب تم گئی ہوئی تھیں تو تمہارے پیچھے ساتھ والے کمرے سے ایک لڑکی آئی تھی لنڈزی نام ہے اس کا میری اور اس کی بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ بہت جلد ہم دونوں باہر نکلیں گھومنے پھرنے جائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی اپنے لئے بوائے فرینڈ ڈھونڈ لو۔“

”اوہ میں تو جا رہی ہوں۔ تم نے میری بات کا یقین نہیں کرنا تو نہ کرو۔“

”ہاں ہاں جاؤ تمہاری اس بے کاری کی بات کا تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔“ میٹ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

اگلے روز شام کے وقت لنڈزی میٹ سے ملنے آئی۔ میٹ نے جوہانا کی بھی اس سے ملاقات کروائی۔ لنڈزی دیکھنے میں تو بڑی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی لیکن نامعلوم کیوں جوہانا کو وہ بھی کچھ پراسرار لگی، اس نے میٹ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل میں پریشان ہوتی رہی۔

جوہانا اس رات اپنے کمرے میں لیٹی سو رہی تھی کہ بلی کے میاؤں میاؤں کرنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چل پھری اور بستر سے اٹھ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب پہنچی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر دیکھا تو وہی کالی بلی راہداری میں چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ اور ویسے ڈرنے جیسی کوئی بات نہیں تھی لیکن جس بات سے جوہانا ڈر گئی وہ یہ تھی کہ

بلی جیسے ہی زمین پر پاؤں رکھتی تو کسی انسان کے قدم رکھنے جیسی آواز پیدا ہوتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ جوہانا آنکھیں جھپکنے لگی۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تو وہ بلی وہیں تھی پھر اچانک جیسے غائب ہو گئی۔ اور پھر تو یہ سلسلہ روز کا چل نکلا روزانہ اسے بلی چلتی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ اس روز بھی رات کے پہر جب سب سو رہے تھے تو جوہانا کو کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آواز راہداری میں سے آ رہی تھی۔ جوہانا اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا لیکن آج وہاں کوئی بلی نہ تھی۔ بلکہ کوئی لڑکی راہداری میں چلتی چلی جا رہی تھی۔ جوہانا کا سارا خون خشک ہو گیا وہ ڈر کے مارے واپس کمرے میں آ گئی اور دروازہ اچھی طرح بند کر لیا۔ وہ رات اس نے جاگتے ہوئے گزار دی۔

اگلے روز رات کے وقت پھر اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ یہ معاملہ حل کر کے ہی رہے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر جھانکا باہر وہی لڑکی اسے راہداری میں چلتی نظر آئی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے گلے میں سلور کالا کلاٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں چمک رہا تھا۔

اچانک ہی جوہانا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ایسا ہی لاکٹ تو لنڈزی نے بھی پہنا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ جوہانا جلدی سے واپس کمرے میں آئی اور جلدی جلدی لنڈزی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ تین چار بار ٹھنٹی بجنے کے بعد لنڈزی نے فون اٹھالیا۔ ”ہیلو۔ ہیلو۔“ لنڈزی میں جوہانا بات کر رہی ہوں۔“

”ہیلو جوہانا کیسی ہو۔ خیریت اتنی رات کو کیسے فون کر لیا۔“

”وہ دراصل تم نے کہا تھا کہ تم گھر پہنچ کر فون کرو گی تو تم نے فون نہیں کیا تو میں نے خود کر لیا۔“

جوہانا نے جھوٹ بولا۔ اتنی رات کے فون کرنے کا اسے کبھی بہانا کچھ نہیں آیا۔ اسے اصل بات تو بتا نہیں سکتی تھی۔ ”اچھا؟ میں نے ایسا کہا۔“

”کمال ہے مجھے تو یاد نہیں۔“ ابھی وہ مزید کچھ بات کرتیں کہ پیچھے سے جوہانا کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ جوہانا کی چیخ کھل گئی اس نے گھوم کر دیکھا تو سامنے وہی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں سلور کالا کلاٹ چمک رہا تھا لیکن اس کی شکل بالکل بھی لنڈزی جیسی نہیں تھی۔

فون جوہانا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ لڑکی ساٹ چہرہ لئے جوہانا کو ہی گھور رہی تھی۔ جوہانا نے سوچا کہ اس سے جان بچانے کا ابھی ایک طریقہ ہے کہ یہاں سے بھاگ جائے اس نے اپنی پوری قوت جمع کی اور وہاں سے بھاگنے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ سامنے لگی تصویر میں سے دو ہاتھ باہر نکلے اور اسے بھی تصویر میں سمجھانے لیا۔ اب جوہانا بھی تصویر کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

جوہانا کی چیخ و پکار سن کر میٹ اور مسٹر جیمز کمرے سے باہر نکل آئے۔ میٹ آگے آگے تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں پہنچا۔ اسی تصویر میں سے دونوں ہاتھ باہر آئے اور اسے بھی اندر کھینچ لیا۔ دروازے پر کھڑے مسٹر جیمز نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اپنا ذہنی توازن ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھ۔

اس گھر کے آسیب نے جوہانا اور میٹ کو زندہ نگل لیا۔ اور مسٹر جیمز بھی ہمیشہ کے لئے پاگل ہو گئے۔ اس دن کے بعد سے اس گھر میں کوئی نہیں جاتا۔ عرصہ بیت گیا لیکن وہ گھر بند پڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں جوہانا اور میٹ کی رو حیں بسرا کرتی ہیں۔ کسی میں بھی اس گھر میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ جوہانا کا خیال درست ہی ثابت ہوا تھا۔ ”اس گھر میں واقعی آسیب تھا۔“



نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لہانے میں اپنی اپنی نوعیت کی نقل وقلیل فراموش جسم و جان کو انگشت بدندان کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتے طاری کر دے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چمکناٹی گھناٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

”تم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اگر میرا دوست میری مدد نہ کرتا تو تم میری گردن کاٹ چکے ہوتے۔ اب اپنی گردن بچاؤ۔“

اڑوہا غار میں غائب ہو کر باہر جنگل میں غار کے منہ کے قریب ہی نکل آیا ناگو نے اڑوہا کو ہمہ گیر کرنا پنی طرف آتے دیکھا تو منہ ہی منہ میں منتر پڑھ پڑھ کر اڑوہا پر چھوٹے مارنے لگا۔ لیکن اس کا ایک بھی منتر کام نہیں کر رہا تھا۔ کسی منتر کا اڑوہا پر اثر نہیں ہو رہا تھا اڑوہا اس کے قریب سے قریب آ گیا تو ناگو نے آگ میں سے جلتی ہوئی لکڑی ٹھاکر اڑوہا پر ماری لکڑی کی آگ اڑوہے کے قریب جاتے ہی بجھ گئی۔ ناگو نے دوسرا منتر پھونکا تو ایک بہت بڑا کمر چھ غار میں سے نکل کر اڑوہا کی طرف بڑھا اور اسے دبوچتا چلا۔ مگر اڑوہا بھی غافل نہیں تھا اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور ایک دم سے کمر چھ کی گردن کے گرد اپنا سارا بدن لپیٹ کر کسنا شروع کر دیا مگر چھ کا دم گھٹ گیا اور اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ ناگو نے جب اپنا ہر منتر بے کار دیکھا تو اٹھ دوڑا اڑوہا کے لئے اب وہ بڑا آسان شکار تھا۔

شریم نے اڑوہا سے کہا۔ ”اس ظالم انسان کو چھوڑنا نہیں اڑوہا بھائی۔“

تو اڑوہا نے کہا۔ ”پہ اب مجھ سے بچ کر نہیں

جاسکتا۔“ ساتھ ہی اڑوہے نے اپنے جڑے کھول کر زور سے سانس اندر کو کھینچا۔

ناگواس وقت تاز کے درختوں میں پہنچ چکا تھا اڑوہا کے سانس نے اسے پہلے تو اسے وہیں کھڑا کر لیا۔ وہ آگے کو دوڑ رہا تھا اور اڑوہا کا سانس اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناگواسی جگہ کھڑا ناگس چلانے لگا۔ اڑوہا نے اور زور سے سانس کھینچا تو ناگو نے اڑوہا کی طرف آنا شروع کر دیا۔ قریب آتے آتے وہ اڑوہے کے منہ کے بالکل قریب آ گیا۔ ناگو کا جسم تیزی سے اڑوہا کے منہ کے اندر چلا گیا اور ناگو کی آخری چیخ بلند ہوئی اور پھر ناگو کی چیخ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی۔

شریم نے آگے بڑھ کر اڑوہا سے کہا۔ ”اڑوہا بائی تم نے دنیا کو ایک ظالم انسان سے نجات دلائی اب مجھے راج کماری کے پاس لے چلو۔ اسے میری مدد کی ضرورت ہوگی۔“

اڑوہا نے کہا۔ ”میرے بچن کے اور بچہ کر بیٹھ جاؤ۔“ اڑوہا نے اپنا بچن نیچے کیا شریم اچھل کر اس کے سر کے اوپر بیٹھ گیا۔

تو اس کے ساتھ ہی اڑوہا نے پوری تیز رفتاری سے رینگنا شروع کیا چلتے چلتے وہ جنگل میں سین اس جگہ

پہنچ گیا جہاں وحشی راج کماری کو پکڑ کر واپس لا رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے اور نیرا چھال رہے تھے۔

شریم نے اڑوہا سے کہا۔ ”راج کماری مصیبت میں ہے مجھے یہاں اتار دو۔ میں راج کماری کو ان سے چھڑاؤں گا۔“

اڑوہا نے شریم کی طرف دیکھتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی۔ ”ایک بھائی کے ہوتے ہوئے ایک بھائی کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تم آرام سے دیکھو کہ میں ان وحشیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔“ شریم کو اڑوہا نے ایک درخت کے پیچھے اتار دیا۔ اور خود اس راستے میں جا کر پھن گئے بیٹھ گیا جدھر سے وحشیوں نے ابھی کرنا تھا۔

وحشی خوشی سے جھومتے لہراتے شور مچاتے اچھلتے کودتے راج کماری کو پکڑ کر سردار کے پاس لے جا رہے تھے کہ اچانک جنگل ایک خوف ناک پھنکار کی گرج سے دہل اٹھا۔ سارے کے سارے وحشی وہیں جم کر گرے کہ وہ دہشت زدہ تھے ایسی گرج انہوں نے پہلے کسی نہ سنی تھی۔ اڑوہا نے دوسری پھنکار ماری اور درخت کی اوٹ سے نکل کر ان وحشیوں کے سامنے آ کر لہرانے اور ان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ وحشیوں نے اڑوہا پر نیزے پھینکنے شروع کر دیئے۔ اڑوہا کی پھنکاری اس قدر گری تھی کہ نیزے اس کے منہ کے قریب جاتے ہی پھل کر بھاپ بن کر اڑ جاتے، کئی درختوں کو اڑوہا کی پھنکار نے آگ لگا دی۔ وحشیوں نے راج کماری کو پھوڑ دیا، اب اپنی جان بچانے کے لئے اوہرا بھر بھاگنے لگے۔ لیکن اڑوہا نے ان کے سامنے راستے بند کر دیئے تھے۔ جنگل میں اب چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔

شریم نے لیک کر راج کماری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا۔ ”میرا ذہن نہیں میں شریم ہوں۔“

”شریم بھائی تم..... جلدی سے اس طرف آ جاؤ۔“ شریم راج کماری کو لے کر آگ میں چلتے درختوں سے دور لے گیا۔

راج کماری کا رنگ زرد ہو رہا تھا اڑوہا کو دیکھ کر اس کا حلق زیادہ خشک ہو گیا۔

شریم نے کہا۔ ”فکر نہ کرو اب تم میرے ساتھ ایک خوف ناک جنگل کے سفر پر ہو۔ اس لئے بہادر بن کر حالات کا مقابلہ کرو میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ اڑوہا ہمارا دوست ہے اور اس نے ہم دونوں کو سمندر کے طوفان سے نکال کر ہندوستان کے ساحل تک پہنچایا تھا۔“ راج کماری نے اڑوہا کے کتھنوں اور منہ سے آگ کے شعلے نکلنے دیکھے تو ششدر ہو کر رہ گئی۔

”کیا یہ اڑوہا ہمارا دوست ہے؟“

”ہاں، راج کماری کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ یہ کس دلیری سے ہمارے دشمنوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔“

اڑوہا نے تقریباً سارے وحشیوں کو جلا کر شرم کر دیا اس کے سانس سے نکلنے والی آگ اتنی زیادہ تباہ کن تھی کہ جس جنگل کے جسم کو آگ لگتی اس کی ہڈیاں تک آگ میں جل کر راکھ ہو جاتیں۔ سارے وحشیوں کو جلا کر اڑوہا نے شریم اور راج کماری سے کہا۔

”اب میں واپس اپنی سمندری دنیا میں جانا چاہتا ہوں اور اب میں تمہاری اور کیا کر سکتا ہوں۔“ راج کماری ڈر کر ایک درخت کے اوٹ میں ہو گئی۔ اصل میں وہ ڈر کر شریم کے پیچھے ہو جانا چاہتی تھی مگر شریم تو اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے مجبوراً اسے درخت کے پیچھے ہونا پڑا۔ شریم راج کماری کو درخت کے پیچھے جاتے دیکھا تو فحش کر کہا۔

”یہ بہت ڈرتی ہے اڑوہا بھائی۔“

اڑوہا نے کہا۔ ”ہر آدم زاد مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جائے گا۔ اب یہ بتاؤ شریم بھائی کہ میں تمہارے اور کیا کام آ سکتا ہوں۔“

شریم نے کہا۔ ”میں اسے لے کر یہاں سے سیدھا وطنی ہندوستان کی ریاست میں جاؤں گا راستہ بڑا دور ہے کیا تم ہمیں ہندوستان کے وسط میں پہنچا سکتے تاکہ ہمارا جنگل کا خطرناک راستہ توٹ جائے۔“

اڑوہا نے کہا۔ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے

شریم بھائی اور تمہیں چھوڑ کر مجھے واپس بھی آنا ہے کوشش کرنا ہوں کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ منزل کے قریب پہنچا دوں۔ میرے سر کے اوپر بیٹھ جاؤ۔“ راج کماری کا تو اڑوہا کے پاس آتے ہوئے دم نکلا جا رہا تھا۔

اور پھر اڑوہا کی دریاؤں اور پہاڑوں جنگلوں سے گزر گیا بہت دور آگے جا کر اڑوہا راج کماری اور شریم کو ایک بہت بڑے دریا کے پار اتار دیا اور کہا۔ ”شریم بھائی اب اگر میں اور آگے گیا تو مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس جگہ سے واپس چلا جاؤں تاکہ دقت پر سمندری ناگ بادشاہ کے دربار میں پہنچ سکوں۔“

شریم نے اڑوہا کو اجازت دے دی اور وہ واپس ہو گیا اڑوہا کے جانے کے بعد شریم نے راج کماری سے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہاں سے تمہاری ریاست کتنی دور ہے۔“

راج کماری نے ارد گرد دیکھا پھر زمین سے پتھر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ یہ دن کا علاقہ ہے۔ یہاں سے اوپر کی طرف سات سو گز پر ہماری ریاست ہے لیکن ابھی ہمیں بڑے خطرناک جنگلوں سے گزرنا پڑے گا۔“

شریم نے کہا۔ ”دنیا کا ایسا کوئی خطرناک جنگل نہیں جس میں سے میں نہ گزرا ہوں۔ راج کماری جی تم فکر نہ کرو میں تمہیں تمہارے محل میں ہی پہنچا کر دم لوں گا۔“ اور وہ دونوں دریا کے کنارے کنارے شمال کی طرف روانہ ہو گئے دونوں جنگلوں میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

☆.....☆.....☆

ناگنی نے ایک پرانے جہاز کے مالک ذریک کے مال پر اور جہاز پر نوکری کر لی تھی اور جہاز سمندر میں کھل کی ایک بندرگاہ کی طرف سفر کر رہا تھا ناگنی کے رے میں جہاز کے مالک ذریک کو صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ ایک بے کار لڑکی ہے جسے اس نے ترس کھا کر اپنے جہاز پر نوکری پر رکھ لیا تھا جہاز یاد بان کھولے ہوا میں اپنی منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا ناگنی کے دل میں بس

ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح وہ پرنگھل سے اسپین پہنچ جائے اور شاہان کا سراغ لگائے۔

ایک ایک اس رات موسم بہت خراب ہو گیا طوفانی ہوائیں چلنے لگیں مگر ذریک کا جہاز بڑا مضبوط تھا وہ طوفانی موجوں میں بھی سفر کرتا رہا۔ لیکن صبح ہوئی تو ایک قیامت اس جہاز کا انتظار کر رہی تھی جہاز کا ٹکڑ ٹکڑ ٹوٹ گیا۔ اور اس کا سمت دکھانے والا آلہ طوفان کی تندر ہو گیا اب جہاز یہی کر سکتا تھا جس طرح بھی ہو سکے واپس چلا جائے ناگنی واپس نہیں جانا چاہتی تھی ڈریک نے اعلان کر دیا کہ جہاز واپس جائے گا۔

ناگنی نے کہا۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

ذریک بولا۔ ”پھر تمہیں سمندر میں اترنا ہوگا کیونکہ میں تمہارے لئے اپنا جہاز تیار نہیں کر سکتا۔“

ناگنی کو ذریک پر بڑا غصہ آیا اور کہنے لگی۔ ”میں اتروں نہیں بلکہ اڑ جاؤں گی۔“ تو ذریک نے زور سے ناگنی کے کندھے پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

”ذرا اڑ کر تو دکھاؤ۔“

ناگنی نے کہا۔ ”میں اڑ کر واپس نہیں آؤں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم جہاز کو آگے نہیں لے جاؤ گے۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں سے اسپین کتنی دور ہے۔“

ذریک یہیں سمجھ رہا تھا کہ ناگنی اس سے مذاق کر رہی ہے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اسپین یہاں سے ایک ہزار میل مغرب کی طرف ہے اچھا تو اب اڑ کر تو دکھاؤ تمہیں پائی۔“

ناگنی نے ایک کھرا سانس لیا اس کے ساتھ ہی وہ سفید رنگ کا باز بن گئی اور پردوں کو پھڑپھڑا کر جہاز کے عرشے پر سے اڑتی ذریک اور دوسرے ملاح منہ کھلے اسے دیکھتے ہی رہ گئے ناگنی نے اڑتے اڑتے جہاز کے اوپر ایک گول چکر لگایا۔ اور پھر ایک غوطہ لگا کر جیسے جہاز کے ملاحوں کو سلامی دی اور سمندر پر مغرب کی طرف اڑنا شروع کر دیا یہ وہ منظر تھا جو سمندری ملاحوں نے کبھی نہ دیکھا تھا ناگنی سمندر سے کافی بلندی پر اڑی چلی جا رہی تھی



اس کا اپنا اندازہ بھی تھا کہ وہ مغرب کی طرف اڑ رہی ہے  
چند حرا آئین ہے۔

اڑتے اڑتے اسے شام ہوئی تو آسمان پر ایک  
بار پھر کالی گھٹائیں اُڑ آئی اور بڑی تیز ہوائیں چلنے لگیں  
تھوڑی ہی دیر میں آندھی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی  
ہوا کے پھیڑوں نے ناگنی کو سمندر کے اوپر پھینک دیا اس  
کے پریمیک گئے اب وہ بازمین کرئیں اڑ سکتی تھی اس نے  
فورا سانپ کی شکل بھائی اور سمندری لہروں پر تیرنا شروع  
کر دیا بڑی بڑی لہروں میں تیرتی طرح تیرتی پہلی جارہی  
تھی سمندر میں آ کر اسے سمت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا  
جونہی وہ سمندر میں آئی اس کے پرانے دوست ساتھی شیش  
ناگ یعنی چوند والے بڑے اڑدھے نے اس کی بوسگھ  
لی تھی وہ بھی سمندر میں ہی تھا بوکے تعاقب میں وہ ناگنی  
کے پاس آ کر سمندر سے باہر نکل آیا ناگنی نے اپنے  
پرانے دوست شیش ناگ کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔

شیش ناگ نے ناگنی کو اپنے سر پر بیٹھالیا  
اور کہا۔ ”مجھے تمہارا بھائی شریم ملا تھا۔“

ناگنی نے چونک کر پوچھا۔ ”کہاں.....؟“ اس  
کے بعد شیش ناگ نے اسے ساری کہانی بیان کر دی اس  
نے ناگنی کو یہ بھی بتایا کہ شریم سمندری طوفان میں پھنس  
گیا تھا اور اس نے اسے نکل کر ہندوستان کے ساحل  
پر پہنچا دیا ہے۔

”کیا راج کماری اس کے ساتھ تھی۔“ ناگنی  
نے پوچھا۔

اڑدھانے کہا۔ ”ہاں وہ اس کے ساتھ تھی اب وہ  
دونوں ہندوستان کے جنگلوں میں سفر کر رہے  
ہیں۔“ اڑدھانے ناگنی کو یہ بھی بتایا کہ ”شریم اور راج  
کماری کو اس کے باپ کی ریاست میں پہنچانے کے  
بعد آئین میں شاہان کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا ناگنی  
نے پوچھا۔

”کیا شریم نے شاہان کے بارے میں کوئی اور  
بھی بات کی تھی؟“

”نہیں بس اتنا کہا تھا کہ اسے شاہان کی کوئی

خبر نہیں ہے۔“ ناگنی نے اڑدھانے سے آئین کے ساحل کے  
بارے میں پوچھا۔

اڑدھانے آئین کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔  
ساری رات دونوں پرانے دوست سمندر میں سفر  
کرتے رہے۔ دن نکلا تو انہیں دور ایک پہاڑی سمندر  
سے ابھری ہوئی دکھائی دی اس پہاڑی کے اوپر ایک پرانا  
محل سا بنا تھا جس کے گول گول کنبہ بھی تھے ناگنی نے  
اڑدھانے سے پوچھا۔ ”یہ پرانہ محل کس کا ہے؟“

اڑدھانے کہا۔ ”وہ کبھی اڑدھانے آیا خدا جانے  
کس کا محل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دیران ہوگا کیونکہ اس  
پہاڑی پر کوئی انسان نہیں رہ سکتا۔“

”تمہارا خیال درست نکلتا ہے۔“  
وہ پہاڑی پر پہنچ گئے اڑدھانے کو وہاں بھی جانا تھا  
کیونکہ وہ اپنے علاقے سے ہزاروں میل دور نکل آیا تھا  
اس نے ناگنی سے واپس جانے کی اجازت مانگی تو ناگنی  
نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی اور کہا۔

”اچھا خدا حافظ پھر ملیں گے۔“ اڑدھانے ناگنی  
کو سلام کر کے پھر سے سمندر میں اڑ گیا۔

اس کی پہاڑی کے پاس ناگنی اکیلی رہ گئی وہ  
ابھی تک سانپ کی شکل میں تھی اس کے دل میں خیال آیا  
کہ وہ پھر سے آسمان بن جائے مگر یہ سوچ کس نے ارادہ  
بدل دیا۔ کہ اسے سانپ کی شکل میں ہی اوپر والے محل  
کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس محل میں کون کون سے لوگ رہتے  
ہیں ناگنی نے اوپر جاتی بیڑھیاں چڑھتی شروع کر دی۔

وہ بیڑھیوں کے ساتھ جی ہوئی ہے بے حد پختہ  
پتھری دیوار پر چڑھتی ہوئی اوپر چلی جارہی تھی جب وہ  
پہاڑی کا پورا چکر کاٹ چکی تو سامنے محل کا وہ ہی دروازہ  
آ گیا جس کے اندر شاہان جا کر قلاب پوش جادو گروں کی  
قدیم پھنس گیا تھا۔

ناگنی دروازے پر دیک کر چڑھ گئی دروازہ بند تھا  
اور کوئی سوراخ بھی نہیں تھا جس کی مدد سے وہ محل کے اندر  
داخل ہو سکتی محل کے آخری منزل کافی اونچی تھی ناگنی نے  
سوچا کہ پہلی منزل سے ہی محل میں داخل ہونا چاہئے۔

دروازے سے اتر کر نیچے آ گئی۔ قلاب پوش کا جہاز  
در میں اب نہیں کھڑا تھا وہ کہیں چلا گیا تھا اس نے  
نے آواز سنی یہ آواز دروازہ کھلنے کی تھی جیسے اندر سے  
دروازہ کھول رہا ہوں، وہ جلدی سے ایک خشک  
زمین کے پیچھے چھپ گئی۔

محل کا بڑا دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا اور اندر  
در قلاب پوش ایک تابوت کو لے کر باہر نکلے اس قسم  
تابوت میں لاش رکھی ہوتی ہے ناگنی نے سوچا شاید یہ  
جہاز پوش اس خطے میں رہتے ہیں اور کسی مردے کو سمندر  
تھکنے جارہے ہیں وہ انہیں غور سے دیکھنے لگی قلاب  
پوش کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر جانے والی گول  
گول عیاں چڑھنے لگے ناگنی نے محل کے اندر جانے کی کوئی  
شک نہ کی بلکہ یہ سوچا کہ پہلے ان لوگوں کے بارے میں  
لوم کرنا چاہئے کہ یہ کون ہیں اور تابوت اٹھا کر کہاں لے  
جائے ہیں۔

قلاب پوش محل کی سب سے اوپر والی منزل  
گئے یہاں پہنچ کر انہوں نے تابوت کو گنبد کے نیچے سیاہ  
لکے بڑے چبوترے پر رکھا اور واپس چلے گئے ناگنی  
تابوت کی لاش سے کیا وہ کسی ہو سکتی تھی بلکہ وہ ان قلاب  
پوش کا بیٹا چلا نا چاہتی تھی کہ وہ لوگ کون ہیں اور دروازہ  
بند کر کے اس خطرناک اور دیران جزیرے میں کیا  
رہے ہیں اس محل کا راز کیا ہے؟

قلاب پوش آگے آگے جارہے تھے اور ناگنی  
اس کی شکل میں رہتی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے جارہی  
تھی محل کے دروازے میں سے گزر کر یہ لوگ محل کے باغ  
آ گئے یہاں دیواروں پر لمبی پٹیلیں چڑھی ہوئی تھیں وہ  
ایک ڈیوڑھی میں سے نکل کر سرنگ سے باہر نکل آئے  
ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

دونوں قلاب پوش تہہ خانے میں آ گئے یہی وہ تہہ  
تھا جس کے کنوئیں میں شاہان کئی روز سے گرا ہوا تھا  
باہر نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کنوئیں کے پاس ایک چبوترہ تھا اس چبوترے پر  
یہ قلاب پوش اس تابوت کو اٹھا کر لے گئے تھے جس

کے اندر عمارہ بے ہوش تھی اور جسے شاہان نے آئین  
پہنچایا تھا ناگنی کو بھی کچھ خبر نہیں تھی کہ شاہان کنوئیں میں پڑا  
ہے قلاب پوش چبوترے پر کوئی منتر پڑھ کر اگر جی جلا کر  
واپس چلے گئے۔

اس کے ساتھ ہی ناگنی نے محسوس کیا کہ وہاں  
شاہان کی خوشبو آ رہی ہے وہ چونکا ہوئی ادھر کنوئیں میں  
گرے ہوئے شاہان کو بھی ناگنی کی بوسوس ہوئی وہ  
مر جھٹک کر ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا وہ اپنی پوری آواز سے بولا۔

”اوپر کون ہے ناگنی کیا تم ہو؟“

ناگنی نے شاہان کی آواز سنی تو جلدی سے کنوئیں کی  
منڈیر پر آ کر اپنا سر نیچے کر کے جھانکا۔ اندھیرے میں  
اسے شاہان پتھروں پر بے بس و مجبوری کی حالت میں پڑا  
اسے صاف نظر آ گیا۔ اس نے اوپر سے ہی آواز دی۔

”شاہان بھائی میں ہونا گئی تم یہاں کیا  
کر رہے ہو؟“  
شاہان نے کہا۔ ”وہ جیوں اس قسم کے کنوئیں میں  
گرنے کے بعد اکثر رہا ہوں یعنی یہاں سے نکلنے کی  
کوشش کر رہا ہوں اور ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوا۔“  
ناگنی نے کہا۔ ”فکر نہ کرو میں تمہاری  
مدد کروں گی۔“ ناگنی نے ایک دم سے شکل اختیار کی کنوئیں  
میں ایک بار پھر جھک کر انسانی آواز میں شاہان کو کھلی دی  
اور کہا۔

”میں اپنا آپ رہی بن کر نیچے پھینک رہی ہوں  
اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنا۔“ ناگنی نے گہرا  
سانس لیا وہ اس دفعہ ایک لمبا اور سرخ سانپ بن گئی جو رسی  
جتنا موتا تھا اس نے خود کو کنوئیں کے باہر رکھا اور باقی سارا  
دھڑکی کی طرح کنوئیں کے اندر لٹکا دیا۔

شاہان نے ناگنی کی دم کو جھلکی سے پکڑ لیا اور اوپر  
چڑھنا شروع کر دیا شاہان جب کنوئیں سے باہر آیا تو اس  
نے خدا کا شکر ادا کیا دونوں نے ایک دوسرے کو جلدی  
جلدی اپنی داستان سنا دی ناگنی نے شاہان کو بتایا۔

”شریم راج کماری کو لے کر ہندوستان کے  
جنگلوں میں سفر کر رہا ہے یہ بات مجھے اڑدھانے بتائی تھی

اور خیال یہ ہے کہ وہ وہاں سے اجین آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔  
شاہان نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں شریم کی مدد کرنی چاہئے کیونکہ وہ اکیلا ہے۔“  
ناگنی نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔“

اس پر شاہان نے کہا۔ ”مگر یہ ذمہ بھی ایک ذمہ داری ہے۔“  
”کون سی ذمہ داری ہے؟“ ناگنی نے پوچھا۔  
شاہان بولا۔ ”میں عمارہ کو ابھی تک اس کے گھر اجین نہیں پہنچا سکا۔“  
ناگنی بولی۔ ”عمارہ کہاں ہے۔“

شاہان نے کہا۔ ”اس کنویں میں گرنے سے پہلے میں نے دیکھا تھا کہ یہاں ایک تابوت ہے اس تابوت کے اندر عمارہ بے ہوش تھی۔“  
ناگنی نے جلدی سے کہا۔ ”اس صندوق کو تو دو نقاب پوش اٹھا کر محل کی سب سے اونچی منزل میں چھوڑ آئے ہیں۔“

”بس اسی صندوق میں عمارہ بند ہے آؤ اوپر چل کر اسے آزاد کروا دے۔“ ناگنی اور شاہان اوپر والی منزل کی طرف بھاگے راستے میں ناگنی سے پوچھا۔  
”یہ کون لوگ ہیں۔“ شاہان نے کہا۔

”یہ لوگ جادوگر ہیں۔ بڑے خوف ناک قسم کے جادوگر ہیں اور ایک ان کا نقاب پوش سردار ہے یہ سردار عمارہ کا سر کاٹ کر کوئی جادو کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔“  
”پھر تو ہمیں چاہئے کہ فوراً عمارہ کو جاکر تابوت سے نکال لیں۔“

”ہاں اسی لئے تو میں تمہیں لے کر اوپر جا رہا ہوں۔“

وہ ابھی پہلی منزل سے نکل کر دوسری منزل کی اندھیری سیڑھیوں پر تھے کہ اچانک ایک خوف ناک گرج سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سارا گھر بلکہ سارا محل اندھیرے میں ڈوب گیا انہیں سامنے اور پیچھے سے کچھ

نظر نہیں آ رہا تھا ناگنی چونکہ سانپ کی شکل میں تھی۔ اس لئے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی اس نے دیکھا کہ سامنے پتھر کی بڑی مضبوط دیوار آن گری ہے اور وہ سیڑھیوں پر قید ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے شاہان سے کہا ان لوگوں کو شاید پتہ چل گیا ہے۔

شاہان کہنے لگا۔ ”یہ لوگ جادوگر ہیں میں نے ان کے سمندری جہاز پر انسانی لاش اور مٹی آوازیں سنی تھیں ان کو ضرور ہمارا ظلم ہو گیا ہے اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“  
ناگنی نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں چھوٹی چڑیا بن کر تمہاری جیب میں چھپ جاتی ہوں کوئی نہ کوئی جادوگر یہاں ضرور آئے گا پھر جو ہو گا دیکھ لیں گے۔“

”ٹھیک ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی دیوار میں ہیئت ناک گرج ایک بار پھر پیدا ہوئی اور اس کی بڑی بڑی پتھر کی سیلوں نے ٹھکانا شروع کر دیا ناگنی اس وقت ایک زرد رنگ کی چڑیا بن گئی شاہان نے چڑیا کو اپنی جیب میں چھپالیا اور خود سامنے والی دیوار کے پاس لگ کر انتظار کرنے لگا کہ اب کیا ہوتا ہے پتھر کی بڑی سیل پرے ہٹ گئی اندر سے دو سیٹھوں والا بڑا جادوگر نکل کر سامنے آ گیا نقاب کے پیچھے اس کی دوسری آنکھیں روشنی کی کرنیں باہر پھینک رہی تھیں شاہان کی طرف نظریں گاڑتے ہوئے جادوگر نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سے ایک نیلے رنگ کی تیز شعاع نکل کر شاہان کے جسم پر بڑی شاہان کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے اٹھا کر اوپر چھت کی طرف اچھال دیا ہے۔  
تو وہ اٹھ کر چپکے چپکے بڑا۔

جادوگر نے آگے بڑھ کر شاہان کے سر پر اپنی انگلی رکھ دی یہ انگلی بڑی تھمی گوشت اس میں بالکل نہیں تھا انگلی میں سے گرم آگ نکل کر شاہان کی کھوپڑی میں اترنے لگی شاہان کو ویسے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا اور نہ اسے کوئی جادو ہلاک کر سکتا تھا اسے اپنی جیب میں رکھی ہوئی چڑیا یعنی ناگنی کی فکر تھی کہ کہیں اس پر جادو اثر نہ کر جائے شاہان نے فوراً ہاتھ اوپر اٹھائے اور کہا۔

”جادوگر مجھے معاف کر دے۔ میں تو اس محل کی گرنے آ گیا تھا میں بے قصور ہوں۔“ شاہان چاہتا تھا کہ آپ کو جادوگر کے حوالے کر دے تاکہ ناگنی کی جان بچے اور اس کے بعد وہ سوچ کر اس پر اسرار مل سے کہہ کر ناگنی کی کوشش کریں گے۔

جادوگر نے شاہان سے کہا۔ ”میرے پیچھے پیچھے جادوگر شاہان کو لے کر محل کے ایک تاریک تہہ خانے آ گیا جہاں دو نقاب پوش جادوگر ایک انسانی کھوپڑی اٹھنے رکھے اس کے سر پر کالے سانپ کو خون پیلا رہے جادوگر نے ان نقاب پوشوں سے کہا۔

”اسے قید کر لیا جائے کل اس کا خون دوسرے بندوں کو پیلا دیا جائے گا۔“

”جو حکم آتا۔“ دونوں نقاب پوش جھک کر آداب باندھے جادوگر یہ کہہ کر واپس چلا گیا نقاب پوشوں نے ان کو ایک ذخیرہ سے دیوار کے ساتھ باندھ دیا۔  
سانپ کے منہ میں قطر قطر خون ڈالنے لگے۔

اچانک انسانی کھوپڑی پر بیٹھے ہوئے سانپ نے بھر جمرتی سی لی اور کھوپڑی سے اتر کر چوتھے کمرہ گیا اور اس طرح لیٹ گیا کہ جیسے بے ہوش ہو گیا دونوں نقاب پوش بڑے حیران ہوئے کہ یہ سانپ ابھی چست و چالاک تھا اسے اچانک کیا ہو گیا ہے۔

اصل میں سانپ نے ناگنی دیوی کی تیز بو محسوس کی تھی جو چڑیا کی شکل میں شاہان کی جیب میں تھی ان نے بھی سانپ کی اس تبدیلی کو دیکھ لیا تھا مگر ابھی وہ کونسا تجربہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح سے اس کی کم کے کام ہو جانے کا خطرہ تھا اور عمارہ کو نقصان پہنچا تھا مگر یہ کام سانپ نے خود ہی کر دیا ناگنی نے شاہان کی جیب میں سے ہی سانپ کی بو پائی تھی اس نے اندر ہی پائی زبان میں سانپ کو گھم دیا کہ دونوں نقاب پوشوں کو ہلاک کر دو۔

چوتھے کمرے پر نیم بے ہوش پڑے ہوئے سانپ نیم ناگنی دیوی کا حکم سناتا ایک دم سے پتھر مارا گھر میں پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور اچھل کر ایک نقاب پوش کی

گردن پر ڈس دیا ابھی وہ نقاب پوش سمیٹنے بھی نہ جاتا تھا کہ سانپ اچھل کر دوسرے نقاب پوش کی گردن پر گرا اور اس کی گردن پر بھی ڈس لیا اس سانپ کا زہر بہت تیز تھا، دونوں نقاب پوش زمین پر گرے اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر دونوں کے جسم پھٹ گئے۔

ناگنی شاہان کی جیب سے نکل کر باہر آ گئی اور اس نے انسانی شکل اختیار کر لی اور شاہان سے کہا۔

”یہ سانپ ہماری مدد کرے گا۔“

سانپ شاہان کے سامنے سر زمین پر رکھے بیٹھا تھا ناگنی نے اس سے پوچھا۔

”اس پر اسرار مل کا راز کیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔“

سانپ نے کہا۔ ”سانپوں کی دیوی عظیم ناگنی یہ لوگ سمندری جادوگر ہیں ان کی سمندر کے پیچھے حکومت تھی، اور پھر سمندر میں لاوا چھٹ پڑنے سے ان کا ملک غرق ہو گیا انہوں نے اوپر آ کر اس محل میں حکومت بنائی یہ لوگ اپنے جادو کا جہاز لے کر سمندر میں نکل جاتے ہیں اور انسانوں کو پکڑ کر یہاں لاتے ہیں ان کی گردن کاٹ کر ان کے خون پر منتر پڑھ کر پنی جاتے ہیں اس طرح سے ان کا خیال ہے کہ یہ کسی دوبارہ اداوے سے غرق نہ ہو سکیں گے۔“  
ناگنی نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے جادو حاصل کرتے ہیں۔“

سانپ کہنے لگا۔ ”ان کا جادوگر بادشاہ نقاب کے اندر اپنے گھلے میں ایک تعویذ چھپائے رکھتا ہے سارا جادو اس تعویذ میں ہے اگر یہ تعویذ سمندر میں گر دیا جائے تو ان کا سارا جادو ختم ہو جائے گا۔“

ناگنی نے کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو۔“ سانپ نے جھک کر سلام کیا اور چلا گیا، ناگنی نے شاہان سے کہا۔  
”سب سے پہلے ہمیں عمارہ کو اپنی حفاظت میں لینا چاہئے تاکہ جب ہم حملہ کریں تو یہ نقاب پوش اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔“

شاہان بولا۔ ”عمارہ اس محل کے اوپر والی بارہری میں تابوت کے اندر بند ہے آؤ ہمیں ساتھ ہم اوپر چلتے ہیں۔“

پھر ناگنی کچھ سوچ کر بولی۔ ”مگر غمزدہ میرا خیال ہے کہ مجھے انسان کی شکل میں نہیں جانا چاہیے۔ میں سانپ بن کر تمہارے ساتھ جاتی ہوں۔“ ناگنی سانپ بن گئی چھوٹا سانپ اور ایک کاسبز آنکھوں والا بڑا ہی زہریلا سانپ، ہشامان نے ناگنی کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا ناگنی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر خطرہ ہو تو وہ اسے کسی طرح زمین پر چھوڑ دے۔

ہشامان نے تہہ خانے سے نکل کر محل کی اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ایک نقاب پوش پہرے دے رہا تھا ناگنی نے ہشامان کی جیب میں سے سر نکال کر کہا۔

”ہشامان تم مجھے اسی جگہ چھوڑ دو میں اس پہرے دار کو راستے سے ہٹاؤں۔“

ناگنی سانپ کی شکل میں ہشامان کی جیب سے نکل کر سیڑھی کی دیوار پر رینگتی ہوئی دروازے کے پاس چلی گئی نقاب پوش پہرے دار کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ ٹہل کر پہرے دے رہا تھا کیونکہ وہ سامنے بارہ دری تھی جس کے اندر عمارہ کا تابوت رکھا تھا نقاب پوش پہرے دار نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا وہ پہرے دے رہا تھا۔

رات کا آخری پہرہ تھا آسمان پر ستاروں کی چمک بھینکی پر زری تھی کیونکہ صبح ہونے والی تھی ناگنی آخری سیڑھی پر سے رینگ کر سامنے والی دیوار کی طرف جانے لگی تو نقاب پوش کی نظر اس پر پڑ گئی اس نے بجلی کی تیزی کے ساتھ جھک کر سانپ پر تلوار پھینک دی۔

ناگنی کا خیال کیا بلکہ یقین تھا کہ وہ سامنے والی دیوار پر پہنچ جائے گی اس دیوار سے وہ اس پہرے دار پر حملہ کرنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایک ہزار سال بعد ناگنی پر ایسی آفت دوسری بار پڑی تھی۔

تلوار سیدھی ناگنی کے جسم پر آ کر پڑی اور ناگنی کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے ناگنی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا پھر اسے کچھ بھی ہوش نہ رہا یہ ناگنی کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا جو دوسری بار ہوا تھا اور اسی لئے ناگنی نے ہشامان اور شرمیک کو پہلے بتا دیا تھا کہ اگر کبھی میرے

جسم کے ٹکڑے ہو جائیں اور میں مرجاؤں تو اسے ہالہ پہاڑ کی ترائی میں ناگ مندر کے تالاب میں لے جا کر ڈال دینا تو میرا شریرو بارہ زندہ ہو جائے گا۔

ناگنی نے بے ہوش ہوتے ہوئے ایک عقل مندی کی بات کی کہ جب جسم پر تلوار پڑی اور جسم دو ٹکڑے ہو گیا تو اس نے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو سیر حیلوں پر لڑھکادیا تاکہ وہ واپس سیدھا ہشامان کے پاس پہنچ جائے کیونکہ خطرہ تھا کہ نقاب پوش پہرے دار اس کے جسم پر تلوار مار دے قید نہ بنا دے ایسی حالت میں ناگنی کا پھر سے زندہ ہونا بڑا مشکل تھا۔

ہشامان سیر حیلوں پر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور پہرے دار کو دیکھنے لگا ناگنی اسے ڈسے گی اور وہ مرجائے گا لیکن ہشامان نے دیکھا کہ نقاب پوش پہرے دار نے زور سے تلوار نکالی اور اس کے ساتھ ہی پہرے دار کی بجائے سانپ کے دو ٹکڑے لڑھکتے ہوئے اس نے قدموں میں آن کرے ہشامان کی تو جان ہی نکل گئی یہ ناگنی کے جسم کے ٹکڑے تھے یہ کیا ہو گیا کیسے ہو گیا ہشامان دماغ چکرانے لگا اس نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھا لیا اور جلدی سے ناگنی کے جسم کے دو ٹکڑے ٹکڑے جو سانپ کی شکل میں تھے اٹھا لئے اور رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لئے اور اوپر چڑھنے لگا۔

اب وہ نقاب پوش پہرے دار سے سب سے پہلے ناگنی کے ٹکڑے کا انتقام لینا چاہتا تھا وہ اوپر چل کی سمت پر آ گیا پہرے دار نقاب پوش نے ہشامان کو اپنے سامنے دیکھا تو تلوار لہرا کر اس پر حملہ کر دیا یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ اس نے چیخ نہیں ماری تھی ورنہ سارے نقاب پوش ہوشیار ہو جاتے اور پھر عمارہ کو وہاں سے نکال لے ہاں مشکل ہو جاتا۔

ہشامان نے بڑے آرام سے نقاب پوش پہرے دار کے ہاتھ سے تلوار جھین کر اسے اپنے ہاتھ میں تمام کیا نقاب پوش نے خنجر نکال لیا اور دیک کر ہشامان کے سینے میں گھونپ دیا ہشامان نے خنجر جھین کر محل سے نیچے ٹھہر گئے مارتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا ہشامان نے نقاب پوش

سے دار کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کیونکہ اب خطرہ تھا کہ وہ لڑ کر اپنے ساتھیوں کو بلا سکتا تھا نقاب پوش نے ہشامان گردن کو بوج کر دیا نا شروع کر دیا۔

ہشامان کو بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ یہ تو ایسے ہی بات تھی کہ آدی پتھر کے ستون کو دو ٹکڑوں ہاتھوں سے پکڑ کر شروع کر دے۔ ہشامان نے نقاب پوش کو نیچے گرا کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اب وہ آواز نہیں نکال سکتا تھا ہشامان نے اس کا نقاب اتار دیا۔ وہ کاپ گیا اس کا نقاب تھی تاکہ کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا ہاتھوں میں گہرے گڑھے تھے ان گڑھوں میں کھڑے چھوٹے ڈیلے حرکت کر رہے تھے۔ ہشامان نے بے دار کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تاکہ آواز پیدا نہ پھر اس نے خنجر سے پہرے دار کی دو ٹکڑوں میں نکال کر باہر پھینک دیں اس کے بعد ہشامان نے نقاب پوش کی ہڈی رگ کاٹ ڈالی اس کے جسم سے خون کی لہلا پانی باہر نکلنے لگا اسے سانپ کی بات یاد آ گئی کہ یہ زہری مخلوق تھی شاید اس لئے ان کی رگوں میں زہر کا پانی گردش کر رہا تھا نقاب پوش پہرے دار کی جان بچ گئی۔

ہشامان کا جوش انتقام ابھی بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا اس پہرے دار کی لاش کو اٹھا کر محل سے نیچے سمندری لاش میں پھینک دی تو کیسی چٹانوں پر گرتے ہی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سمندر میں گر پڑے۔ ہشامان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تھا اس کے بہترین دوست ساتھی ناگنی کی لاش کی شکل میں اس کے جسم کے دو ٹکڑے اس کی جیب میں تھے سامنے بارہ دری میں عمارہ کا تابوت تھا۔

ہشامان نے آگے بڑھ کر تابوت کو کھولا اس کے اندر بے ہوش بڑی تھی ہشامان عمارہ کے بے ہوش جسم کو اٹھا کر کھڑے پڑا اور سیڑھیاں اتر کر محل کی پہلی سیڑھی پر گیا یہاں خاموشی تھی رات کا چھپچھا پہرے ہونے کی سبب شاید نقاب پوش سو رہے تھے۔ ہشامان کے لئے یہ موقع تھا وہ اپنے ہاتھ میں ہشامان تخت پیش کی حالت میں تھا لے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جو کوئی بھی اس کے سامنے آیا وہ

اسے اڑا کر رکھ دے گا۔ چاہے عمارہ اور ناگنی کی زندگیاں خطرے میں کیوں نہ پڑ جائیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اسے محل کی ڈیوڑھی تنگ کوئی نہ ملا ورنہ یہ بات ناگنی اور عمارہ کے لئے سخت خطرناک ہو سکتی تھی ڈیوڑھی میں ایک لمبے چل رہا تھا اس کی روشنی میں ہشامان نے دیکھا۔

ایک نقاب پوش کو پہرے دیتے ہوئے جو تخت کے پاس کھڑا تھا میں لمبا تیز پکڑے پہرے دے رہا تھا۔ ہشامان نے بے ہوش عمارہ کو دیوار کے ساتھ زمین پر اندھیرے میں لٹا دیا اور خود دیوار کے سائے میں آگے بڑھا نقاب پوش کو آہٹ سی محسوس ہوئی اس نے نیزہ سیدھا کر دیا اور پوچھا کون ہے ہشامان نے اسی زبان میں کہا۔ تمہارا باپ محل میں ہشامان تخت غضب ناک ہو چکا تھا ناگنی کے قتل ہو جانے پر اسے اس قدر دکھ ہوا تھا کہ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا نقاب پوش نے جب یہ لفظ سنے تو نیزہ لہراتا اسے حملہ کرنے کے انداز میں جھکا تا آگے بڑھا۔ ہشامان اندھیرے سے باہر نکل آیا اس نے کہا۔

”آؤ میرے شکار میں تمہاری گردن توڑ کر اس کی گیند بنادیں گا۔“

”پہرے دار نے چلا کر کہا۔“ کون ہو تم بد بخت جو موت کو آوازیں دے رہا ہے۔“

ہشامان نے کہا۔ ”میں خود موت ہوں تمہاری۔“ اور ہشامان نے چھلانگ لگا کر نقاب پوش کی کمر کے گرد دو ٹکڑوں ہاتھ ڈال کر اسے اتارنے زور سے جھٹک دیا کہ اس کی کمر کی ہڈی کڑکڑا کے چھ سات جگہوں سے ٹوٹ گئی اور وہ ہشامان کے بازوؤں میں یوں جھونٹے لگا جیسے کوٹنی سے لٹکتی ہوئی کوئی ٹھری ہو۔ ہشامان نے اسے زمین پر لٹا دیا اور نیزہ اس کے سینے میں گاڑ دیا۔

پھر وہ عمارہ کو اٹھا کر محل کی ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا۔ باہر سمندر اس کے سامنے کافی نیچے ٹھہرے مار رہا تھا دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا بادیاں جہاز وہاں سے خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

ہشامان نے پہاڑی سے اترنا شروع کر دیا



چکرکھائی گول سڑک پر سے ہو کر وہ سمندر کے کنارے چٹانوں کے پاس آیا تو اسے ایک کشتی دکھائی دی جسے ریت میں کھینچ کر ایک پتھر سے باندھا گیا تھا شاہان نے عمارہ کو کشتی میں لٹایا اور دیکھا کہ ایک جھنگے سے ہی توڑ ڈالا کشتی کھینچ کر اس نے سمندر میں ڈال دی اور چھوٹا لگا پہاڑ کے ارد گرد سمندر میں بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں مگر سمندر آگے جا کر پرسکون ہو گیا تھا شاہان کشتی کو چلا رہا تھا اس کے کھینچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کچھ دور تک اسے پہاڑی کے اوپر نکل کا سنہری گنبد دکھائی دیتا رہا پھر وہ پہاڑی سمیت نظروں سے لوجھل ہو گیا شاہان کی کشتی اب کھلے سمندر میں تھی وہ سورج کے حساب سے مغرب کی طرف کشتی چلا رہا تھا کیونکہ اندلس کا ملک وہاں سے مغرب کی طرف ہی تھا۔ اس کے سامنے اب دو اہم کام تھے ایک تو عمارہ کو اندلس میں اس کے ماں باپ کے پاس پہنچانا تھا۔ اور دوسرا جو سب سے بڑا کام تھا جس کے بارے میں شاہان بہت زیادہ پریشان تھا۔ وہ نامی کو لے کر ہالیہ کی چوٹی پر موجود جھیل پر جانے کا تھا جہاں نامی کو سمندر کی لکڑی کی صندوقچی میں بند کر کے جھیل کے عظیم انسان نامگ مندر کے کلاب میں ڈالنا تھا۔

شاہان نے عمارہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پانی کے بار بار چھینٹے مارے آ خر وہ ہوش میں آ گئی اس نے چونک کر شاہان کو دیکھا اور پوچھا۔

”شاہان بھائی ہم کہاں ہیں۔“ شاہان نے اسے ساری کہانی بیان کی اور پھر جیب کے اندر سے نامی کے جسم کے دونوں ٹکڑے نکال کر دکھائے، عمارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے نامی کی لاش اس سے بندھی گئی۔

”اب اس کا کیا بنے گا شاہان بھائی؟“ عمارہ نے پوچھا۔

شاہان نے کہا۔ ”میں تمہیں تمہارے مگر چھوڑ کر نامی کی لاش لے کر ہالیہ کی طرف نکل جاؤں گا وہاں اس کا علاج ہوگا اور خدا نے جاپا تو اسے پھر سے زندگی مل جائے گی۔“

کشتی نامعلوم سمندر میں چل رہی تھی اب لہریں

اسے اپنے آپ مغرب کی طرف بہائے لئے جاری تھی شاہان کو سب سے زیادہ اب اس بات کی پریشانی تھی کہ عمارہ کو کھانے اور پینے کا کیا بندوبست ہوگا اور کچھ دنوں تو کم از کم اسے پینے کے لئے پانی تو ملنا چاہیے مگر اس بڑے سمندر میں بھی پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں تھا اس لئے کہ سمندر کا پانی کڑوا ہوتا ہے اگر انسان پانی لے تو اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

دو چہرہ کو عمارہ نے کہا۔ اسے سخت پیاس لگی ہے۔ شاہان اسے کیا جواب دیتا وہاں پانی کہاں سے لاتا آسان پر بندہ تک دکھائی نہ دیتا تھا چھلیاں بھی کشتی کے قریب ہی نظر نہیں آتی تھیں شاہان نے کہا۔

”عمارہ بہن پانی کے لئے تمہیں تھوڑا صبر کرنا پڑے گا شاید کوئی جزیرہ آ جائے اور وہاں پانی کے ساتھ ساتھ ہمیں کھانے کو بھی کچھ مل جائے۔“

لیکن جزیرہ تو نہ ملا وہاں دور شاہان کو ایک چٹان ہی سمندر میں ابھری ہوئی دکھائی دی۔

شاہان نے کہا۔ ”شاید یہ کوئی پہاڑی ہے جو سمندر سے باہر نکل آئی ہے اس قسم کے پہاڑ سمندر کے نیچے اکثر ملتے ہیں جن کی چوٹیاں سمندر سے باہر نکل ہوئی ہوتی ہیں۔“

دو چہرہ ڈھل رہی تھی عمارہ کا پیاس کے مارے برا حال ہو رہا تھا کہ شاہان نے اس چٹان کے ساتھ کشتی لگا دی شاہان اور عمارہ کشتی سے اتر آئے یہ چٹان کالی بڑی تھی اور اس کے ارد گرد کافی بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے شاہان نے عمارہ کو ایک طرف بیٹھایا اور خود اوپر اڑھ رہا کہ پانی کی تلاش کرنے لگا عمارہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایک جگہ شاہان کو چٹان کے اندر سے قطرہ قطرہ پانی پتھروں میں جمع ہو رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا چشمہ بن گیا تھا پانی بیٹھا تھا عمارہ نے اپنی پیاس بجھائی اور خدا کا شکر ادا کیا شاہان نے کہا کہ اس جگہ ہمیں رات میں آرام کرنا چاہیے عمارہ کو بوجھ بھی لگ رہی تھی وہ بولی۔

”یہاں رکنے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم سمندر میں ہی نکل چلیں شاید آدھی رات کو کسی جزیرے پر پہنچ

ہیں۔“

شاہان نے کہا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“ عمارہ کشتی میں بیٹھ کر شاہان کشتی کو چٹان سے دور لے جانے لگا تھا کہ ایک اس کی نظر دور اس طرف سمندر میں ان جہر سورج غروب ہو رہا تھا اور سمندر سرخ رہا تھا اور شاہان کو ایک کشتی چٹان کی طرف آتی نظر آئی یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں شاہان نے جیسے ہی اپنے آپ سے سوال کیا عمارہ اُدھر ہی دیکھ رہی تھی سورج کی بڑی روشنی میں انہیں کشتی میں تین چار آدمیوں کے دکھائی دے رہے تھے۔

شاہان نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ یہ خوف ناک آدمی ہوں تم اس چٹان کے پیچھے پتھروں کی اوٹ میں چلی جاؤ۔“ شاہان کشتی کو چٹان کے پیچھے پتھروں کی اوٹ میں لے گیا وہ خود بھی عمارہ کے ساتھ ایک اونچے پتھر کے پیچھے چپ کیا۔ اور انے والی کشتی کو دیکھنے لگا۔

کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں سفر کرتی چٹان کے آگے آ رہی تھی اب وہ بڑی آسانی سے دیکھ رہے تھے کہ کشتی میں تین ملاح سروں پر سرخ رومال باندھے کھڑے ان کے ہاتھ میں جگر بیجھ اور ایک آدمی کشتی میں کھائے بیٹھا تھا شاہان نے کہا کہ معاملہ خطرناک لگ رہا ہے عمارہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”کیا ہم بھاگ چلیں۔“

کشتی چٹان کے پاس آ کر رک گئی تینوں ڈاکو ان کی نظر آ رہے تھے کشتی میں ایک شخص بندھا پڑا تھا، اس نے ہماری بھگم کر بارعب چہرے والے قیدی کی آنکھوں کو ایک ملاح نے کہا۔

”جاؤ اور اس چٹان پر بھوکے پیاسے رہ کر موت کا مار کرو۔ تمہاری بھئی سزا ہے کہ تم سسک سسک کرو۔“ اور پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے قیدی کو چٹان کی کشتی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔

قیدی نے ایک نظر سمندری چٹان کو اوپر سے نیچے دیکھا پھر سر پکڑ کر وہاں بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہاں اسے موت صاف نظر آ رہی تھی جب ڈاکو ملاحوں کی کشتی

سمندر میں کافی دور نکل گئی تو شاہان نے عمارہ کو ساتھ لیا اور جلاوطن قیدی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ایک بار تو قیدی چونک کر پیچھے ہو گیا اور گرتے گرتے بھاگے سے کبھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کس قسم کی دیران جگہ پر بھی ایک آدمی اور ایک عورت اسے مل سکتے تھے۔ اس نے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔

”تم..... تم کون لوگ ہو۔“ وہ ہسپانوی زبان بول رہا تھا عمارہ چونکہ ہسپانوی جانتی تھی اس لئے وہ بڑی خوش ہوئی کہ اسے اپنے وطن کا آدمی مل گیا ہے اس نے بھی ہسپانوی زبان میں کہا کہ وہ اور شاہان بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچے ہیں اور وہ جیلن اپنے ماں باپ کے پاس جارہی ہے جو میڈرڈ میں تجارت کرتے ہیں۔ شاہان بھی یہ زبان سمجھتا تھا جلاوطن قیدی عمارہ سے مل کر بہت خوش ہوا۔

شاہان نے پوچھا۔ ”دوست تم کون ہوں تمہارا جرم کیا ہے اور یہ لوگ کون ہیں جو تمہیں یہاں مرنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں؟“

جلاوطن قیدی بولا۔ ”میرا نام پیڈرو ہے میں ایک تجارتی جہاز کا کپتان ہوں یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک گمنام جزیرہ ہے اس جزیرے پر میرا مال سے بھرا ہوا جہاز کھڑا ہے اور اس جہاز پر بحری ڈاکوؤں نے قبضہ کر لیا ہے انہوں نے میرے ساتوں کے سات ملاحوں کو مروا دیا ہے اور مجھے مرنے کے لئے اس چٹان پر چھوڑ گئے ہیں۔“

شاہان نے پوچھا۔ ”بحری ڈاکوؤں کا جہاز کہاں ہے۔“

پیڈرو نے کہا۔ ”ان کا جہاز بھی اس جزیرے پر ہے وہ آج رات شاید وہاں پر رکیں گے اور کل میرے جہاز کا سارا سامان اپنے جہاز پر لاد کر میرے جہاز کو آگ لگا کر چلے جائیں گے۔“

عمارہ بولی۔ ”شاہان بھائی ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

کپتان ہنس پڑا۔ ”تم لوگ خود میری طرح یہاں

پھنس گئے ہوتے میری کیا مدد کر سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں اچھی اچھی باتیں کر کے خدا کو یاد کریں اور موت کا انتظار کریں۔“

شاہان مسکرایا۔ ”ہم جلاوطن نہیں ہیں کپتان ہمارے پاس ایک کشتی بھی ہے اور ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔“

”کشتی بھی ہے کہاں ہے؟“ کپتان نے حیرانی سے پوچھا۔

”چٹان کے دوسری طرف کھڑی ہے۔“ شاہان نے اس کے جواب میں کپتان نے شاہان اور عمارہ کو غور سے دیکھا اور کہا۔

”تم لوگ یہاں کیسے آ گئے؟“ شاہان نے کہا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ میں عمارہ کو اس کے ماں باپ کے پاس اسپین شہر چھوڑنے جا رہا ہوں ہمارا جہاز طوفان میں غرق ہو گیا تھا اور ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر اس چٹان پر پہنچ گئے۔“

کپتان کہنے لگا ”یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم دونوں مل کر خونخوار سمندری ڈاکوؤں کا مقابلہ کیسے کریں گے ان کے جہاز پر دو تین بھیگی ہوئی ہیں اور وہ پچاس ڈاکو ہیں ہر ایک کے پاس تیز دھار والے تیز اور تلواریں ہیں کپتان کے پاس تو ہر وقت بارود سے بھرا ہوا پتول رہتا ہے۔“

شاہان ایک بار پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”فکر نہ کرو خدا ہماری مدد کرے گا ہم اسی وقت یہاں سے چلے چلیں گے تاکہ رات ہونے تک جزیرے پر پہنچ جائیں۔“

”کیا تم جزیرے تک نہیں سمندری راستہ بنا سکتے ہو۔“

”کیوں نہیں میں نے اس سمندر میں بہت سفر کیا ہے۔“

”تو پھر ہمارے ساتھ آؤ۔“ شاہان نے کپتان کو ساتھ لیا اور چٹان کے دوسری طرف لے جا کر کشتی دکھائی جسے ایک پتھر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔

کپتان نے کہا۔ ”ہمارے پاس تمہارا بھی نہیں

ہے ہم نہتے اتنے خونخوار ڈاکوؤں کا کیسے مقابلہ کریں گے ہمیں ایک بار پھر اچھی طرح سوچ کر لینا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تینوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ مجھے اس عورت کے مرنے کا بڑا افسوس ہوگا۔“ کپتان نے عمارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شاہان نے کہا۔ ”یہ سارا کام تم مجھ، چھوڑ دو کپتان۔“

”مگر تم اکیلے کیا کرو گے۔“ شاہان نے کہا۔ ”یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔“

کپتان نے سر جھٹک دیا جیسے اسے شاہان کی کسی بات پر بھروسہ نہ ہو، مجبوراً وہ کشتی میں سوار ہو گیا شاہان نے کشتی کو سمندر میں ڈال دیا اور کشتی کا رخ کپتان کی ہدایت کے مطابق جزیرے کی طرف کر دیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ ان کی کشتی ایک چھوٹے سے گمان اور ویران مگر سبز جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔ کپتان بڑا ہی ماہر سمندری ملازم تھا وہ کشتی کو جزیرے کی پیچھے کی طرف لے آیا تھا تاکہ ڈاکوؤں کی اس فرگاہ نہ بڑے شہری دھوپ میں جزیرے کے درخت چمک رہے تھے سمندر کی ہوا ان کی شاخوں کو ہولے ہولے چھل رہی تھی جزیرے کا یہ ساحل بالکل ویران تھا نہ کوئی کشتی دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی آدمی نظر آ رہا تھا۔

کپتان نے کشتی کو ایک طرف جزیرے کی جھالیوں کی لٹ میں کھڑا کر دیا اور اسے اچھی طرح جانچا دیا شاہان نے آہستہ سے کہا۔

”اس کشتی کی اب ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ ہم وہاں تمہارے جہاز پر جائیں گے۔“ کپتان پچھلی سی ہنسی بٹھا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم یا تو دیوانے ہو یا پھر خواب میں باتیں کر رہے ہو۔“ شاہان بھی ہنس دیا۔

شاہان نے کہا۔ ”ہاں میں سچ سچ دیوانہ ہوں۔“ عمارہ بولی۔ ”اب آگے بھی چلو گے کہ یہاں باتیں کرتے ہی رہ جاؤ گے۔“

شاہان نے کپتان سے کہا۔ ”تمہارا جہاز کس طرف تھا کپتان نے بتایا کہ اس کا جہاز سمندری ڈاکوؤں کے جہاز کے ساتھ دوسری طرف کھڑا ہے۔“

شاہان نے کہا۔ ”ہمیں جزیرے کی دوسری طرف جانا ہوگا۔“

”کیا تم نے یہ جزیرہ پہلے ہی دیکھا ہے۔“

”ہاں دوسرے دیکھا ہے مگر یہاں آج پہلی بار اس طرف آیا ہوں۔ میں اس کے جنگلوں سے واقف نہیں ہوں۔“

شاہان نے کہا۔ ”ہم جنگل میں سے نکل کر بالکل اہل کے سامنے مغرب کی طرف بڑھیں گے جہاں ہمارا جہاز کھڑا ہے۔“

عمارہ بولی ”یہ راستہ زیادہ لمبا نہیں پڑے گا۔“

کپتان نے کہا۔ ”نہیں کیونکہ یہ جزیرہ زیادہ بڑا ہے اس کی گولائی زیادہ سے زیادہ چار میل ہے اس باب سے ہمیں دو میل کا سفر طے کرنا ہوگا۔“

عمارہ نے کہا۔ ”رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں ان پہنچ جانا چاہئے۔“

خیر عمارہ یہ تینوں جزیرے کے ساحل کے ساتھ تھوڑے سے مشرق کی طرف چل پڑے جزیرہ ہر اچھا تھا درختوں بھریوں والی تھیں چڑھی ہوئی تھیں یہاں جنگلی انگوڑ بہت اور ناریل کے درخت بھی کافی تھے عمارہ نے جنگلی درختوں سے اپنا پیٹ بھرا اور زمین پر گرے ہوئے ناریل کھا کر اپنی پیاس بجھائی وہ آگے بڑھتے رہے تھے اور سورج اب ہو رہا تھا جزیرے پر رات کے سائے چھانے لگے آگے جا کر ساحل مغرب کی طرف گھوم گیا یہاں سمندری چٹانیں ساحل پر دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں آگے اور گہرے سبز رنگ کی چٹانیں تھیں جن پر کہیں کچل جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں ابھی تک وہ ساحل کی ریت پر رہے تھے جہاز نہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاہان نے کپتان سے پوچھا۔ ”جہاز دکھائی

نہیں دے رہے۔“ کپتان نے سمندری طرف نگاہ جما کر کہا۔ ”میرا

خیال ہے کہ ہمیں کچھ دور اور چلنا ہوگا ہو سکتا ہے کہ ایک میل کا دور سفر باقی ہو۔“ وہ چلتے چلتے چارہ تھے اسی طرح انہیں سفر کرتے کرتے رات ہو گئی۔

جہاز کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا عمارہ بے حد تھک گئی آخر وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ”اب مجھ سے اور چلا نہیں جاتا۔“

شاہان نے کپتان سے کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم عمارہ کے پاس بیٹھو اور میں آگے جا کر جہازوں کا پتا کرو کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سمندری ڈاکو کوچ کرنے کی تیاری کر رہے ہوں ایسی صورت میں وہ تمہارے جہاز کو آگ لگا دیں گے۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں میں عمارہ کو اس ویران جزیرے کے جنگل

میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ شاہان نے کپتان اور عمارہ کو پیچھے ایک جگہ جزیرے کے ساحل کے پاس چٹان کی اوٹ میں چھوڑا اور خود آگے روانہ ہو گیا۔ رات کے وقت جزیرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور ایسا خاموش اور سنسان تھا کہ کچل کر ڈر لگتا تھا شاہان کافی دور آگے نکل گیا جزیرے کا ساحل ایک بار پھر گھوم گیا یہاں پہنچ کر شاہان کو پہلی بار سمندر میں کھڑے دو جہازوں کے خاکے دکھائی دیے۔ جن میں سے ایک جہاز میں روشنی ہو رہی تھی شاہان کو بڑی خوشی ہوئی آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ دوسرے جہاز کا صرف کالا کالا سایہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

شاہان تیز تیز چلنے لگا جب وہ جہازوں کے قریب پہنچا تو جنگل کی طرف گھوم گیا یہاں درختوں کے درمیان سے گزر کر وہ جنگل کے آخری کنارے پر آ کر رک گیا آگے ریت کا ساحل شروع ہوتا تھا پھر سمندر تھا۔ اور سمندر میں دونوں جہاز کھڑے تھے۔

کنارے پر بیٹھے ڈاکو نہیں ہانک رہے تھے کوئی لینا ہوا تھا اور کوئی کرجب دکھا رہا تھا اور ریت پر قلا بازی لگا رہا تھا ان کے درمیان آگ کل رہی تھی جس پر وہ ایک

سالم بکرا بھون رہے تھے شاہان کو ان کے تھپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی دونوں جہازوں میں سے ایک مال بردار تھا اور اس کا مالک کپتان تھا دوسرا جہاز سمندری ڈاکوؤں کا تھا۔ شاہان غور کرنے لگا کہ حملہ کس طریقے سے اور کس طرح سے کیا جائے شاہان نے اندازہ لگایا کہ ڈاکو پچاس سے زیادہ ہے شاہان کو اس وقت ناگنی بہت یاد آئی۔ جو دو ٹکڑے ہو کر اس کی جیب میں رومال میں لپیٹی پڑی تھی اور جسے دو پہننے کے اندر اندر ہمالیہ کے عظیم ناگ مندر میں لے کر جانا تھا۔

شاہان نے سوچا کہ شاید ابھی ڈاکوؤں نے دوسرے جہاز کا سامان اپنے جہاز پر نہیں لاد دیا ہو سکتا تھا مال لاد لیا ہو اور اب سفر کرنے کے لئے سب کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس وقت اگر ناگنی ہوتی تو ڈاکو جہاز کے اوپر جا کر پتہ لگا سکتی تھی کہ مال لادنا چاہے کہ نہیں۔ شاہان کو اتنی دور سے اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا شاہان واپس ہوا تاکہ کپتان کو کچا کر خبر کر دے دوسری طرف شاہان کے جاتے ہی کپتان نے عمارہ سے کہا۔ ”تم یہاں آرام کرو میں تمہارے لئے پانی کا پتہ کرتا ہوں۔“

عمارہ نے کہا۔ ”نہیں کپتان بھائی تم مت جاؤ مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔“

کپتان نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے اس جزیرے پر تو کوئی بھی نہیں ہے اور پھر مجھے بھی سخت پیاس لگی ہے میں بس ابھی آیا تھا۔“

عمارہ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اکیلے رہے لیکن کپتان کچھ ضدی اور نادان شخص تھا وہ عمارہ کو اکیلا چھوڑ کر جنگل میں پانی کی تلاش میں چلا گیا عمارہ کو ڈر لگنے لگا کیونکہ وہاں گھب اندھیرا تھا عمارہ بے چاری ایک پتھر کے پیچھے ہو کر سہی بھی بیٹھی تھی عمارہ نے شاہان کو یاد کیا کاش وہ جلد واپس آجائے۔ اتفاق سے دو سمندری ڈاکو بھی ادھر پانی کی تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ پانی کا کھوج لگاتے ان چٹانوں کی طرف آگئے جس کے قریب ہی عمارہ چھپی ہوئی تھی۔

عمارہ نے بھی ستاروں کی چمکی روشنی میں انہیں دیکھ لیا تھا اس کا سارا جسم خوف سے ٹھنڈا پڑ گیا وہ کپتان کا شاہان کو آواز بھی سننے لگی تھی خطرہ تھا کہ ڈاکو آواز سن کر اس کی طرف نہ آجائیں۔ مگر ڈاکوؤں نے عمارہ کو اندھیرے میں بھی چٹان کے پیچھے چھپے بیٹھے دیکھ لیا تھا وہ اسی جگہ رک گئے اور پھر رینگ رینگ کر عمارہ کی طرف بڑھنے لگے عمارہ نے خبر پٹی تھی ڈاکو اس کے سامنے۔ غائب ہو گئے تھے وہ یہ بھی کہ شاید وہ چلے گئے مگر اسے اپنا خبر تھی کہ دونوں سمندری ڈاکو اس کے پیچھے رینگتے ہوئے آ رہے ہیں۔

ایک ایک ایک ڈاکو اچھل کر عمارہ کے اوپر گر اور اس نے عمارہ کا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا دوسرے نے عمارہ کی گردن میں کپڑا ڈال کر کسنا شروع کر دیا عمارہ کا دم گھٹ گیا اس کی آنکھوں کے ارد گرد تارے ناچنے لگے اور وہ بے ہوش ہو گئی سمندری ڈاکوؤں نے عمارہ کو اٹھایا اور جنگل میں غائب ہو گئے آہستہ کپتان کو چاہئے تھا کہ وہ عمارہ کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتا۔

شاہان واپس آیا تو عمارہ غائب تھی وہ بڑا پریشان ہوا اونچی آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا ادھر ادھر اندھیرے میں تلاش کیا مگر وہاں عمارہ ہوتی تو اسے ملتی اسے تو سمندری ڈاکو سیدھا اپنے جہاز پر لے گئے تھے اور اپنے سردار کے سامنے پیش کر دیا تھا عمارہ بے ہوش تھی سردار نے عمارہ کو غور سے دیکھا اور بڑا حیران ہوا کہ یہ عورت اس سسٹان اور ویران جزیرے میں کہاں سے آئی اس نے غراتے ہوئے کہا یہاں ضرور اس کا کوئی ساتھی بھی ہوگا۔ عورت اکیلی اس جزیرے پر نہیں آ سکتی اس کا لباس بتاتا ہے کہ یہ شہر کی عورت ہے جنگلی نہیں ہے جاؤں جہاں سے یہ عورت اٹھائی ہے وہاں اس کے ساتھی کو تلاش کرو اور اس کا سر کاٹ کر میرے سامنے پیش کرو۔“

”جو حکم سرکار اور دونوں سمندری ڈاکو نے سن کر واپس جنگل میں اس چٹان کی طرف چل پڑے۔ جہاں سے انہیں عمارہ بھی تھی دوسری طرف شاہان واپس آ گیا کپتان پریشانی کی حالت میں اسے ملا اور سارا

سنایا۔

شاہان نے قدرے غصے سے کہا۔ ”تمہیں کس کا تھا کہ اسے اکیلے چھوڑ کر چلے جاؤ ضرور سمندری ڈاکو اسے پکڑ کر لے گئے ہوں گے۔“ کپتان نے افسوس سے ہونے کہا۔

”دوست شاہان میں اپنی غلطی مانتا ہوں مجھے لگ کر دوا ڈاکو اب عمارہ کو تلاش کرتے ہیں۔“ شاہان بولا۔ ”میں تمہارا اور سمندری ڈاکوؤں کا ارد گرد کیا ہوں ضرور عمارہ کو ڈاکو ان جہازوں کی طرف لے گئے ہوں گے۔“

کپتان بولا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس جزیرے کی جنگلی اسے اٹھا کر لے گیا ہوں، کیونکہ رات کے سمندری ڈاکو اس جنگل میں آنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“

شاہان سوچ میں پڑ گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”تمہارا دل بھی درست ہو سکتا ہے لیکن ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے آگے چلو۔“

اتنے میں انہیں پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی گھسے چوں پر چل رہا ہو۔

شاہان نے کپتان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دور دیکھا۔

جیسے اسے پیچھے ہٹنے جانے کو کہہ رہا ہوں۔

کپتان وہیں گھاس پر بیٹھ گیا شاہان بھی ایک لڑی کے پیچھے چھپ گیا جزیرے کے اوپر چونکہ بالکل آیتھا اس لئے چاندنی میں جھاڑیاں اور درخت اب نظر آ رہے تھے ان کے سامنے ایک چھوٹا سا کھلا میدان تھا جہاں جھاڑیوں کے جھنڈے تھے سامنے درختوں سے وہی دو سمندری ڈاکو ادھر ادھر تکتے احتیاط سے بڑھتے ہوئے باہر نکلے شاہان نے کپتان کے کان میں کچھ کہا۔ ”تم نے سمندری ڈاکوؤں کو دیکھا ہوا ہے کیا یہ وہی جنگلی لوگ ہیں۔“

چاندنی میں کپتان نے انہیں غور سے دیکھا اور کہا۔ ”یہی سمندری ڈاکو ہیں۔“

شاہان بولا۔ ”یہی لوگ عمارہ کو لے گئے ہیں۔ عمارہ کو اذیت دے کر انہوں نے اس سے ہمارے بارے میں پوچھ لیا ہوگا اور اب یہ ہمیں یہاں پکڑنے آئے ہیں۔“

کپتان نے کہا۔ ”کہ اب کیا کریں ہم بہتے ہیں اور ان کے پاس بھڑ ہیں۔“

شاہان نے آہستہ سے کپتان کا کندھا دبا کر کہا۔ ”اب یہ ہوگا کہ میں تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں گا۔ تم یہاں آرام سے بیٹھ کر تماشہ دیکھو۔“

کپتان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ شاہان کا مطلب کیا ہے اور وہ کس قسم کا تماشہ دکھانا چاہتا ہے شاید وہ مذاق کر رہا ہے مگر یہ مذاق کرنے کا وقت نہیں تھا۔

کپتان نے کہا۔ ”کیا تم مذاق کر رہے ہو۔“ لیکن شاہان آگے چاٹکا تھا وہ جھاڑیوں میں سے رینگتا ہوا سامنے والی چھوٹی سی جگہ میں آ گیا۔ ابھی تک وہ گھاس پر ہی رینگ رہا تھا چاندنی رات میں کپتان اسے گھاس پر رینگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سمندری ڈاکو اکی آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ شاہان کو تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ڈاکوؤں پر چھپ کر دوا کرنا جو بھی ڈاکو ذرا قریب آئے شاہان اٹھ کر سامنے آ گیا ڈاکو ایک دم جھمکے کہ جس شکار کو وہ تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ بھی ہے دونوں ڈاکو خنجر لہراتے ہوئے شاہان پر ٹوٹ پڑے وہ شاہان کو بڑا آسان شکار سمجھ رہے تھے اور بات بھی ایسی ہی تھی کیونکہ شاہان اکیلا اور نہ تھا ڈاکو دو تھے اور خنجر ان کے ہاتھوں میں تھے۔

جس وقت ڈاکوؤں نے شاہان پر حملہ کیا تو کپتان کا دل ڈوب گیا اسے یقین تھا کہ شاہان ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں ہو چکا ہے اور اب اسے شاہان کی لاش اسی جنگل میں ڈاکوؤں کے جانے کے بعد دفن کرنی پڑے گی اسے شاہان سے بڑا افس ہو گیا تھا اور کپتان نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دوست کی لاش گمواں اور درختوں کے حوالے کرے اور واپس چلا جائے جھاڑی کے پیچھے چھپا کپتان بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے شاہان کو پیچھے



گر کیا ہوا ہے اس پر پتھر کے دار کر رہے ہیں شاہان چاہتا تھا کہ ڈاکو اپنی حسرت نکال لیں مرنے کے بعد اس کی رگوں کو یہ پچھتاوا نہ رہے کہ انہوں نے شاہان پر وار نہیں کئے تھے ڈاکو اب کچھ کچھ حیران سے ہونے لگے تھے کیونکہ انہوں نے شاہان پر اپنے ہتھیار مارے تھے اس کا تو قیصر ہی ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔

شاہان بڑے آرام سے نیچے بڑا مسکرا رہا تھا جب دونوں ڈاکو تک گئے اور پتھر ان کے ہاتھوں کو زخمی کرتے ہوئے ٹوٹ گئے تو شاہان نے دونوں کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے دونوں کی گردنیں پکڑ کر پوری طاقت سے ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے شہا کی آواز آئی اور دونوں کی کھوپڑیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور دماغ باہر نکل آئے شاہان اس کی لاشیں وہیں چھوڑ کر کپتان کی طرف واپس مڑا۔

کپتان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا منظر اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا کہ شاہان کے اندر اس قدر طاقت ہوگی اسے معلوم نہیں تھا ابھی تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ شاہان نے نیچے پڑنے پڑنے ڈاکوؤں کے وار بچائے تھے اور پھر اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر دونوں کے سر کرا کر انہیں ہلاک کر دیا تھا شاہان آیا تو کپتان نے کہا تمہارے جسم میں ایک رپوٹ جیسی طاقت کہاں سے آگئی تم تو ایک دبے پتے لوجوان ہو۔ شاہان۔

شاہان بھی سمجھ گیا کہ کپتان یہی سمجھ رہا ہے کہ اس نے پتھروں کے وار بچائے ہیں شاہان ہنس دیا اور صرف اتنا کہا۔

”وہ اس قسم کی لڑائیوں کا بڑا ماہر ہے اب آگے لکھو ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے ڈاکوؤں کے جہاز پر پہنچ کر عمارہ کو رہا کر دانا ہے اگر وہ چلے گئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی.....“ اور وہ دونوں جزیروں کے تاریک جنگل میں سمندری طرف بڑھنے لگے۔ جہاں سمندری ڈاکوؤں کا جہاز کھڑا تھا۔

ساننے ہی ڈاکوؤں کا جہاز سمندر میں کھڑا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کپتان کا تجارتی جہاز بھی تھا۔ چاندنی رات میں دونوں جہاز ساتھ ساتھ کھڑے صاف نظر آ رہے تھے شاہان اور کپتان درختوں کے پیچھے ان جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں خاموشی تھی۔ شاید سارے ڈاکو سہمے تھے شاہان نے کہا۔

”ہمیں اسی وقت حملہ کر دینا چاہئے۔“ کپتان بولا۔ ”حملے سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”یعنی ہم دونوں مجھے ان لوگوں والے ڈاکوؤں پر حملہ کریں۔“ شاہان نے کہا۔ ”بہت سی ایسی باتیں ابھی تم دیکھو گے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اس لئے بہتر یہی ہے۔ کہ تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو اور خاموشی سے دیکھتے جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں اور صرف ایسا کرو کہ جو میں کہوں۔“

چپ چاپ کرتے جاؤ۔“ شاہان نے ایک نظر سے دونوں ڈاکوؤں کا جائزہ لیا۔ اسے یقین تھا کہ عمارہ کو ڈاکوؤں نے اپنے جہاز میں ہی رکھا ہوگا شاہان سے ایک غلطی ہوئی تھی اب چاہئے تھا کہ دونوں ڈاکوؤں کو ہلاک کرنے سے پہلے پوچھ لیتا کہ عمارہ جہاز میں کس جگہ پر ہے پھر اسے خیال آتا کہ ہو سکتا تھا کہ عمارہ ان ڈاکوؤں کے قبضے میں نہ ہو بلکہ اسے کوئی دہندہ اٹھا کر لے گیا ہو لیکن اگر دہندہ اٹھا کر لے جاتا تو وہ ضرور شور مچاتی اور کپتان اس کی چیخوں کی آواز سن سکتا تھا اس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں نے پہلے کسی طریقے سے عمارہ کو بے ہوش کیا ہوگا اور پھر اسے اٹھا کر جہاز پر لے گئے ہوں گے شاہان نے کپتان سے کہا۔

”تم اسی جگہ ٹھہرو میں ڈاکوؤں کے جہاز کی طرف جا رہا ہوں۔“ کپتان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم اکیلے جاؤ گے۔“ شاہان نے کہا۔ ”ہاں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔“

کپتان نے کہا۔ ”تم اتنے سارے ڈاکوؤں میں کیسے زندہ رہو گے۔“

شاہان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری لگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے تم یہاں سے مت ہٹو واپس اسی جگہ آؤں گا۔“ کپتان چپ چاپ سا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ شاہان درختوں سے نکل کر سمندر کی طرف گیا کپتان نے دیکھا بھیجی چاندنی شاہان دوسری طرف سے ہو کر جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا بڑی دور تک وہ شاہان کو دکھائی دیتا رہا اور پھر رات اندھیرے اور چاندنی میں گم ہو گیا کپتان نے اوپر کی طرف دیکھا ایک خاموشی اور اندھیرا تھا اور کچھ دیر تک جہاز پر اس کے ساحل کی طرف سے سمندری ہوا بھی تھی جنگل اس کے پیچھے سناٹا تھا اگر کوئی اس کے پاس سے نکل کر دہندہ اس پر حملہ کر دیتا تو اس کے پاس ہلکے کرنے کے لئے کوئی معمولی سا جوتو بھی نہیں لگا رہا تھا ابھی تک یہی ثابت ہوا تھا کہ اس جزیروں میں کوئی دہندہ نہیں ہے کپتان آنکھیں میچا کر جہاز کے سامنے جہاز کو نظر آ رہا تھا جس میں اس کا لاکھوں روپے کا سامان بھرا ہوا تھا اور جواب ڈاکوؤں کے قبضے میں تھا شاہان کی باتوں سے زیادہ اہم خبر نہیں تھا اہم خبر یہ تھی کہ بھلا ایک پتلا لوجوان اتنے ڈاکوؤں کا اکیلے کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ بس خاموشی سے اس ڈرامے کو دیکھتے رہتا تھا جو شاہان اسے دکھا رہا تھا۔

دونوں جہازوں پر موت کی خاموشی طاری تھی ان اوپر سے ہو کر سمندر کی لہروں کے ساتھ ساتھ لڑوں کی طرف جا رہا تھا رات اتنی سناٹا تھی کہ ہلکی لہریں کے باوجود وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا لڑوں جہاز کے بادبان لپٹے ہوئے تھے اور لنگر گرے گئے تھے۔

شاہان بڑی احتیاط سے چھپ چھپ کر آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ عمارہ ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی ڈاکو اسے نقصان پہنچا سکتے تھے شاہان کی جیب میں لاش کی لاش کے دو ٹکڑے شکل میں رکھی ہوئی تھی جب بھی اس کا خیال اپنے ساتھی کی لاش کی طرف جاتا تو اس کا دل ہلکے سے رہ جاتا شریک اس کے پاس نہیں تھا وہ راج

کمار کی کوئی کہہ ہندوستان کے جنگلوں میں ستر کر رہا تھا اسے بھی ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی کہ گانگی کے ساتھ کیا بھیانک حادثہ گزر چکا ہے۔

شاہان کو کپتان نے دور سے ہی بتا دیا تھا کہ اس کا جہاز کون سا ہے وہ ڈاکوؤں کے جہاز کے پہلو میں آگیا وہ ساننے سے جہاز میں سوار ہونا نہیں چاہتا تھا تا کہ خاموشی ہی خاموشی میں عمارہ تک پہنچ جائے اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ سمندر میں سے ہو کر جہاز کی دوسری طرف آجائے وہاں کوئی کشتی بھی نہ تھی شاہان نے سمندر میں آہستہ سے چھلانگ لگا دی سمندر کی بڑی بڑی لہریں دور دور سے آکر ساحل سے ٹک رہا پس چلی جاتی تھیں جب ایک لہر واپس جانے والی تھی تو شاہان سمندر میں اتر آیا لہر اسے اپنے ساتھ دور تک لے گئی یہاں سے شاہان واپس تیرتا ہوا رات کی خاموشی میں جہاز کے قریب آگیا لنگر کا رسہ آدھا سمندر میں تھا اور باقی آدھا اوپر جہاز کے عرشے کے جنگل کی طرف جا رہا تھا شاہان تیرتا ہوا رسے کے پاس آگیا پھر وہ رسے پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

شاہان لمبی کی چال سے اوپر جا رہا تھا بس اسے ایک ہی ڈر تھا کہ اگر ڈاکوؤں نے اسے دیکھ لیا پکڑ لیا تو ہو سکتا ہے وہ عمارہ کو قتل کر دیں گے کیونکہ وہ شاہان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ہو سکتا ہے کہ طیش میں آکر وہ اپنی ناکامی کا بدلہ عمارہ کو ہلاک کر کے لینے کی کوشش کریں اگر عمارہ وہاں نہ ہوتی تو یا شاہان کو خیال نہ ہوتا کہ عمارہ وہاں ہو سکتی ہے تو وہ بے دھڑک ڈاکوؤں پر جا کر حملہ کر دیتا مگر اب ایسا نہیں تھا اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھنا پڑ رہا تھا۔

شاہان نے جہاز کے عرشے پر سر نکال کر دیکھا عرشہ پر ایک ڈاکو پہرہ دے رہا تھا اور آدھ بھی رہا تھا کبھی وہ اٹھ کر چلے پھرنے لگتا اور کبھی بیٹھ کر اونگھنے لگ جاتا اس کے ہاتھ میں ایک منگلی تلوار تھی جس وقت پہرے دار نے اونگھنا شروع کیا۔

اسی وقت شاہان جلدی سے جنگل بھلا نکلا کر

عرشے پر آ گیا اور جھک کر دے پاؤ بھاگ کر جہاز کے بڑے ہوا دان کے پاس آ کر کمرک گیا اور نیچے ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ اس سحرے پہرے دار نے اب اٹھ کر بیڑیوں کے دروازے کے آگے چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔

پہرے دار کو خبر بھی نہ ہوئی کہ شاہان اس کے جہاز پر پہنچ چکا ہے۔ اب اس کے سامنے نیچے جانے کا مرحلہ تھا شاہان کے دماغ میں ایک ترکیب آئی اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اس پہرے دار کو کا حلیہ بدل کر نیچے جانے اس طرح سے کچھ دیر تک اور خاص طور پر رات کے اندھیرے میں کوئی راسے پھونکے گا یہ سوچ کر شاہان نے ہوا دان کی دوسری طرف آ کر بڑے بڑے کچھ پڑے تھے وہاں سے آگے کھٹکنا شروع کر دیا اور پہرے دار کی عقب میں آ گیا خدا جانے پہرے دار کو اس کی موت نے آواز دی تھی اس نے سچ سچ شاہان کے قدموں کی آواز سن لی تھی کہ وہ ایک دم سے رک کر دن کھا کر ان رسوں کے گچھے کی طرف دیکھا جہاں شاہان چھپا ہوا تھا اور تلواریں اس طرف آ گیا شاہان بھی تو چاہتا تھا کہ کسی طرح سے وہ دروازے سے کچھ دور ہٹ جائے۔

شاہان ایک طرف اندھیرے میں ہو گیا ڈاکو جوئی اس کی طرف اندھیرے میں آیا اس کی گردن پر جیسے کوئی بھاری شے آ کر لگی۔ اور وہ منہ کے بل رسوں پر گر پڑا اس کے بعد اس پہرے دار کو غصے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ شاہان نے کافی زور سے مکا مارا تھا۔ اور اسے مکا لگتے ہی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بھی آئی تھی یہی وجہ تھی کہ شاہان نے پہرے دار کے جسم کو لاش سمجھ لیا اور اسے پکڑ کر اندھیرے میں لے گیا وہاں لے جا کر اس کے کپڑے اتار کر خود پہنے اور سر پر لال رومال باندھا اپنے بالوں کو نکھیر دیا اور ہاتھ میں تلوار پکڑ لی شاہان کا رنگ گندمی تھا جیسے قدیم مصر کے لوگ کا ہوا کرتا تھا اس لئے وہ بڑی آسانی سے ڈاکو لگ رہا تھا۔ پھر ڈاکو کی لاش کو اسے رسی کے پٹھوں کے درمیان جوچھوٹا سا کنواں بن آیا تھا وہاں پھینک دیا تھا کیونکہ سمندر میں لاش پھینکنے سے آواز پیدا ہوتی اور ڈاکو

خبردار ہو سکتے تھے۔

شاہان ڈاکو کے حلیے میں بیڑیوں کے پاس آ کر پہرے دینے لگا تاغی کی لاش کے دونوں ٹکڑے رومال میں لپیٹ کر اس نے اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا اس نے بیڑیوں میں جھک کر دیکھا کوئی اوپر آ رہا تھا شاہان جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور چل پھر کر پہرے دینے لگا دل میں "آئے والے لوگوں رہا تھا کہ اس سخت کو بھی اوپر آنے کے لئے یہی وقت رہ گیا تھا کیونکہ اس وقت رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی آنے والا بھی ایک ڈاکو ہی تھا جو شاید نیچے کی کمری سے نکل آ کر اوپر کھڑا ہوا میں سوئے آ گیا تھا۔ شاہان نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ کہ کہیں اس کی آواز پر ڈاکو کوئی شک نہ ہو جائے ویسے بھی وہ آنے والے ڈاکو سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا آنے والا ڈاکو بھی ایک ہی تھا۔ آتے ہی اس نے شاہان سے کہا۔ "کیوں دوست میرے سو روپے دے رہے ہو ناں۔" شاہان کی بلا جانے کہ یہ کیسے سو روپے تھے جو وہ آحق ڈاکو اس سے یا اس پہرے دار سے لینا چاہتا تھا جس کی لاش رسوں کے درمیان پڑی تھی۔

اس نے معمولی سی ہوں آں کر دی۔ اس پر تو پیسے غیبی ڈاکو غصے سے باغرا کر بولا۔ "یعنی تم کمرے ہو میں ابھی یہ منجر تمہارے دل کے آریا کر دوں گا بولو سو روپے دو گے یا نہیں۔ بولو۔" سخت ڈاکو کا پارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔ یہ تو سارے کے کرائے پر پانی بھیر سکتا تھا شاہان نے کہا۔ "دو کا ضرور دوں گا۔"

شاہان نے یہ جملہ اس لئے جلدی سے ادا کر دیا تھا کہ اس کا منہ بند ہو جائے گا اور یہ پرے ہٹ کر کمر آ ہو جائے گا لیکن اس بد نصیب کی بھی موت اسے بار بار آوازیں دے رہی تھی اس نے چونک کر کہا۔ "تمہاری آوازیں بدل گئی ہے تم کون ہو؟" اور پھر شاہان نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔

شاہان نے چونکہ ڈاکو اس کا لباس پہن رکھا تھا اس لئے وہ ڈرا آہستہ سے چل رہا تھا لیکن وہ چونکہ بھی

تھا کہ کسی پر اس کا راز نہ کھل جائے آئے سانسے جو کھڑی کی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں ہی تھیں وہ چار پانچ ہی تھیں ان میں خاموشی تھی ڈاکوؤں نے شاید ان کوٹھڑیوں میں بھی لوٹ کا مال رکھا ہوا تھا ڈاکو شاید نیچے والی منزل کے عرشے پر ہوا دان کی کھڑی ہوا کے نیچے سو رہے تھے کیونکہ وہاں کی اتنی تیزی ہوتی جتنی جہاز کے اوپر ہوتی ہے شاہان اس جگہ کی تلاش میں تھا۔ جہاں ان ڈاکوؤں نے عمارہ کو قید کر رکھا تھا وہ جگہ یا تو کوئی کوٹھڑی یا چٹائی منزل کا گودام ہو ہی ہو سکتا تھا۔

شاہان نے فیصلہ کیا کہ پہلے جلدی جلدی ان کوٹھڑیوں کی تلاش لی جائے ایک کوٹھڑی کے دروازے کو اس نے آہستہ سے اندر کی طرف دھک کا دیا دروازہ تھوڑی سی چڑھا ہٹ کے ساتھ کھل گیا اندر اندھیرا تھا شاہان نے اندر جا کر آکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

کوٹھڑی میں کوئی انسان نہ تھا۔ صرف بڑے بڑے ٹاٹ کے بندل تھے اسی طرح دوسری کوٹھڑی میں بھی لوٹ مار کا سامان پڑا تھا۔ تیسری کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے بند تھا شاہان کے دل میں شک ہوا کہ شاید اس کوٹھڑی میں ڈاکوؤں نے عمارہ کو قید کر کے باہر سے تالا لگا دیا ہوگا تالا کھولنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا اس نے تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر آہستہ سے جھٹکا دیا تالے قبضے اور کھڑی سمیت اکھڑ کر شاہان کے ہاتھ میں آ گیا وہ کوٹھڑی میں آ گیا اندھیرے میں بھی اندر دیکھے ہوئے مسافروں کے لوٹے ہوئے صندوق اور ریشمی کپڑوں کے تھان اور چاندی کے گلدان گلاب پاش اور پتنگ پڑے تھے عمارہ یہاں بھی نہیں تھی۔

شاہان اب چھٹی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا وہ تیسری کوٹھڑی سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک ڈاکو تلواریں کمر میں لٹکائے جمائی لیتا اس کی طرف آ گیا۔ اور شاہان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راز داری سے بولا۔ چوری کرنا تھی دوست تو مجھے بھی ساتھ ملا لیتے اب تمہیں مجھے بھی حصہ دینا ہوگا نہیں تو میں ابھی سر اڑا کر آواز دے کر بلا لیتا ہوں اور دوسرے لئے تمہاری گردن کے بغیر لاش سمندر میں

مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔"

شاہان نے آہستہ سے کہا۔ "میرے ساتھ اندر آؤ۔" اور شاہان اس تیسرے بد نصیب ڈاکو کے لئے کوٹھڑی میں آ گیا وہ ڈاکو تھکتے جنہوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کا سامان لوٹ کر ان کے اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کیا ہوگا۔ ان پر کوئی بھی رحم نہیں کھا سکتا تھا کوٹھڑی کے اندر آتے ہی شاہان نے دروازہ بند کر دیا اور کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی کہاں ہے جو جنگل سے ملی تھی۔" ڈاکو نے کہا۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم۔ تمہاری آواز ہمارے دوستوں کی طرح نہیں ہے تم ہم کون ہو۔ اس نے پھر وہی حرکت کی جو اس سے پہلے اس کا ڈاکو بھائی کر چکا تھا۔

اندھیرے میں شاہان نے ڈاکو کی گردن کا نشانہ لے لیا تھا ڈاکو نے تو اپنی تلوار پوری طاقت سے دوچار کر دی ماری اور تلواریں شاہان کی گردن سے ٹکر کر نیچے ہوئی تھی لیکن شاہان نے اس طرف دھیان نہ دیا اور بڑے سکون کے ساتھ شہ رگ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور پھر شاہان نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔

بہر حال شاہان سمجھ گیا کہ عمارہ دوسری منزل میں نہیں ہے اب پہلی منزل کا گودام ہی دیکھنا رہ گیا تھا شاہان اس قسم کے پرانے بادبانی جہازوں میں بہت سفر کر چکا تھا وہ جانتا تھا کہ کون سا راستہ نہ کھر کوجا تا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے جہاز کی چٹائی منزل پر آ گیا۔ یہاں ایک جانب وہ ڈیک تھا۔ جہاں ڈاکو سوئے ہوئے تھے اور خراٹے بھر رہے تھے دوسری جانب گودام تھا گودام کا دروازہ بند تھا اور باہر مونا سا تالا لگا تھا۔ شاہان نے تالے کو اکھاڑ ڈالا کیونکہ ٹوٹنے سے آواز پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کر شاہان اندر چلا گیا۔ مگر یہاں بھی اندھیرا تھا پر شاہان کی نظر اس اندھیرے میں بھی دیکھ لیا کرتی تھی گودام میں مختلف قسم کے کاٹ کپڑے پڑے تھے۔ کونے میں ایک پرانا سا پتنگ دکھائی دیا۔ جس پر کوئی اونٹ سے منہ پڑا ہوا تھا شاہان لپک کر پتنگ کے پاس گیا یہ عمارہ تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جسم پیسے سے تر تھا تھا۔ اور وہ نیم بے ہوش کی حالت میں تھی۔ شاہان



نے آہستہ سے اسے بیدار کیا۔

عمارہ نے آنکھیں کھول کر شاہان کو دیکھا اور اس کے دیران چہرے پر خوشی کی لہر پھیل گئی شاہان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یونانیوں میرے ساتھ آؤ۔ عمارہ پہلے تو ڈاکوؤں کے لباس میں شاہان کو پہچان نہ سکی لیکن جب وہ اس پر جھکا تو وہ اس کی آنکھوں کی چمک کو فوراً پہچان گئی وہ چمک پر سے انہی اور شاہان کے پیچھے چلتی گودام سے باہر آگئی ڈاکو سو رہے تھے ان کے خزانوں کی آوازیں اب جھت سے نکل کر نیچے آرہی تھیں شاہان عمارہ کو ساتھ لے کر سڑکیاں چڑھ کر جہاز کی دوسری منزل کے ٹکڑے راستے میں سے گزرنے لگا اچانک ایک کوشٹری کا دروازہ کھلا اور اندر سے جہاز کا سردار کسی کو گالیاں بکتا باہر نکلا۔

اس کی نظر جو عمارہ پر پڑی تو تھوڑا کھل کر گر جا۔ "تم کو یہ کون انصاف کر کے لے جا رہا ہے۔" اس نے شاہان کو اپنا ہی ڈاکو سمجھا تھا۔ جو سرداری کی امانت میں خیانت کر کے اسے انصاف کر کے لے جا رہا تھا سردار نے تھوڑا سا بھرپور دیکھا۔ "تم نے سر پر لوہے کا تو باندھ رکھا ہے۔"

"اب تیری موت آگئی ہے۔" اور سردار نے شاہان کی گردن پر تھوڑا سا دوسرا دیا اس بار سرداری تھوڑا کے دو ٹکڑے ہو گئے اس نے تھوڑا کھل کر خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی تھی کہ سردار نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کو آواز نہیں دی تھی اگر وہ دوسرے ڈاکوؤں کو بھی بلا لیتا تو عمارہ کا مارا جانا یقینی تھا۔

شاہان نے سوچا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس سردار کو ہلاک کر دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو نہ بلا سکے۔ بس جب سردار نے تھوڑا کھلا تو شاہان نے ایک بازو اٹھا کر اپنا بھرپور ہاتھ سرداری کی گردن پر مارا سرداری کی گردن ایک دم ٹیڑھی ہوئی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی وہ دھڑا دم سے گر پڑا اور شاہان نے اسے عمارہ سے کہا۔ "جلدی سے اسے سمیٹ کر اندر لے چلو۔"

"دونوں مل کر سرداری کی لاش کو سمیٹ کر اس کے کیمین میں لے گئے لاش کو کیمین میں بند کر کے دونوں تیزی سے باورچی خانے کی طرف گئے وہاں مٹی کے تیل کا ڈرم بڑا تھا۔

شاہان نے نیچے عرشے سے اوپر آنے والا راستہ بند کر دیا پھر اس نے مٹی کا تیل سارے راستے میں پھیلا دیا اور دو پتھروں کو گھرا کر ایک کپڑے کے ٹکڑے کو آگ لگا دی اور وہ جلتا ہوا کھڑا آگ پر ڈال دیا۔

شاہان نے عمارہ کو ساتھ لیا اور جہاز کے لنگر پر سے اتر کر ساتھ والے تجارتی جہاز پر عمارہ کو چڑھایا اور خود کپتان کو لینے ساحل سے جنگل کی طرف بھاگا کپتان نے بھی شاہان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے شاہان یوں بھاگا چلا آ رہا ہے قریب آ کر شاہان نے کہا جلدی سے اپنے جہاز پر آؤ کپتان بھی اپنے جہاز کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت ڈاکوؤں کے جہاز پر سے کہیں کہیں سے دھواں اٹھنے لگا تھا جب یہ لوگ اپنے جہاز پر پہنچے تو ڈاکوؤں کے جہاز کے اوپر والے دروازے میں سے آگ کا ایک شعلہ بھڑک کر باہر نکل آیا۔ ڈاکو اندر بند ہو گئے تھے وہ شور مچا رہے تھے اور دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کپتان نے شاہان کے ساتھ مل کر اپنے جہاز کا لنگر اٹھایا اور بادبان کھول دیے پچھلے پہر کی ہوا چلنے لگی تھی، ہوائے بادبانوں کو پھلادیا اور جہاز چلنے لگا دوسرے جہاز کے ڈاکوؤں نے دروازہ توڑ دیا تھا اور چلے ہوئے جہاز میں سے سمندر میں چھلکے مار رہے تھے اور کپتان کے جہاز کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سمندر کی لہریں انہیں قریب نہیں آنے دے رہی تھیں۔ ویسے بھی کپتان کے جہاز کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی بہت جلد ڈاکوؤں کے جہاز کو آگ نے اپنے شعلوں کی لپٹ میں لے لیا تھا اس کے بادبان پھڑکنے لگے جیسے سمندر میں آتش بازی چل رہی ہو۔

شاہان عمارہ اور کپتان اپنے جہاز کے عرشے

پر کھڑے اس جہاز کے نظارہ کر رہے تھے بحری ڈاکو جزیرے کی ساحل کی طرف تیرتے ہوئے جا رہے تھے کسی ایک اندر ہی جل کر سیاہ ہو گئے تھے کپتان نے کہا۔ "ان لوگوں کو خدا نے ظلم کی سزا دی ہے اب یہاں جزیرے پر ہی اپنی باقی زندگی بسر کریں گے۔ کیونکہ اس طرف شاید ہی کوئی جہاز آتا ہے۔"

شاہان نے کہا۔ "ہاں..... ظلم کا بدلہ مل کر ہی رہتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ کسی پر ظلم نہ کرے۔"

عمارہ بڑی خوش تھی کہ اب وہ اپنے وطن جاسکے گی شاہان نے کپتان سے پوچھا۔

"اس مقام سے اتھین کی بندرگاہ کا فاصلہ کتنی دور ہے۔ اور انہیں وہاں تک پہنچنے میں کتنے دن لگ جائیں گے۔" کپتان نے شاہان کو بتایا۔

"اگر ہوا ٹھیک چلتی رہی اور راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو وہ پندرہ دنوں کے بعد اتھین پہنچ جائے گی۔" جہاز میں کسی ماہ کو خوراک اور پانی موجود تھا۔

شاہان نے ناگنی کے جسم کو ایک صندوقچی میں بند کر کے جہاز میں اپنے کیمین میں رکھ دیا اور جہاز نے اتھین کی طرف اپنا لمبا سفر شروع کر دیا سمندری سفر آرام سے کٹ گیا۔

جہاز سولہویں دن اتھین کی بندرگاہ پر جا کر لگ گیا۔ شاہان کو واپسی کی جلدی تھی وہ جتنی جلدی ہو سکے وہ ہالیہ کے ناگ مندر میں جا کر ناگنی کے کٹے ہوئے جسم کو قدس تالاب میں رکھنا چاہتا تھا عمارہ اپنے وطن اتھین پہنچ گئی تھی اب اسے اپنے ماں باپ کے گھر پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی بندرگاہ سے ان کا گھر ایک دن کے فاصلے پر تھا ان کپتان نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ عمارہ کو اس کے گھر پہنچا دے گا شاہان نے عمارہ کو کپتان کے حوالے کیا اور اسی شام ایک ایسے سمندری جہاز میں سوار ہو گیا جو ہندوستان جا رہا تھا۔ یہ ایک پرہیزگار جہاز تھا جو ہندوستان جا رہا تھا رات کو اتھین کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر وہ دوسرے روز کلمے سمندر میں پہنچ گیا تیز ہوا کی وجہ سے جہاز کی رفتار

بھی بہت تیز تھی جہاز کپتان بڑا انصاف کھا اور خوش اخلاق تھا وہ شاہان کا دوست بن گیا۔

شاہان نے اسے بھی بتایا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے ہندوستان جا رہا ہے جہاز افریقہ، مدغاسکر اور برما سے ہوتا ہوا ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر جا کر ٹھہر گیا یہی شاہان کی پہلی منزل تھی کالی کٹ اتر کر شاہان نے ایک رات ہونٹوں میں قیام کیا اس کے پاس ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی جس میں ناگنی کی لاش پڑی تھی اور ایک چھوٹی ڈلی سونے کی تھی یہ ڈلی اس نے بازار میں جا کر فروخت کر دی جو رقم ملی اس کی مدد سے وہ ہالیہ کے پہاڑوں کو جاتے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

سات دن بعد شاہان ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچا جہاں سے ہالیہ پہاڑ کا سلسلہ شروع ہوتا تھا آج سے سو برس پہلے نہ موڑگا ڈیاں تھیں نہ بیس تھیں مسافر کچروں وغیرہ پر یا پیدل سفر کرتے تھے شاہان نے ناگنی کے لاش کے ٹکڑے صندوقچی میں سے نکال کر دوبارہ رومال میں ڈالے اپنی کمر کے گرد باندھ دیا اسی خیال سے کہ کہیں صندوقچی گم نہ ہو جائے پھیل ناگ مندر وہاں سے کافی دور بلند پہاڑیوں میں تھی وہاں تک جانے والا راستہ بڑا خطرناک تھا اور تنگ گھاٹیوں تو کیلی چٹانوں خطرناک چڑھائیوں اور برفانی علاقوں سے ہو کر گزرتا تھا شاہان کو ان سارے خطروں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اور وہ اس کے لئے تیار تھا۔

قصبے میں ایک رات بسر کرنے کے بعد دوسرے روز وہ ایک چھوٹے سے مندر میں پہنچا وہ ناگنی کے بارے میں یہاں سے کسی پجاری سے پوری معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا ان علاقوں میں وہ ہزار سال پہلے آیا تھا مگر تب سے کہ اب تک زمانہ بدل گیا تھا پہلے والا مندر ڈھسے چکا تھا اور اس کی جگہ دوسرا ناگ مندر بن گیا تھا پجاری تو شاہان کو نہ ملا البتہ وہاں سے ایک بوڑھا سادھو مل گیا۔

جب شاہان نے اسے بتایا کہ وہ مسلمان سیاح ہے اور ناگ مندر کی سیر کرنا چاہتا تھا تو سادھو نے کہا۔





## صحرا گرد

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

اس سے پہلے کہ گولی نوجوان تک پہنچتی اس نے ایک عجیب درد ناک کراہ سنی اس غیر انسانی آواز نے نوجوان کو کرب و اذیت میں مبتلا کر کے دھلا کر رکھ دیا اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی اور پھر.....

لفظ لفظ اور سطر سطر..... خوف و ہراس کے گرداب میں..... غوطہ زن..... دل گرفتہ کہانی

ہیں ہوں کی بالکونی میں کھڑا ان واقعات کو یاد کر رہا تھا جسے اگر میں آپ سے بیان کروں تو آپ اسے میرے دماغ کا خلل سمجھیں گے۔ کوئی بھی سننے والا اس پر یقین کرنے کو بھی تیار نہ ہوگا جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ یہاں اس بالکونی سے سمندر کی ٹھانیں مارتی لہروں کا دھیمہ دھیمہ شور صاف سنائی دے رہا تھا اور چوڑھویں کے چاند کی روشنی میں قاہرہ شہر کی مسجدوں کے

آسمان کو چھوتے مینار ایک سمور کن منظر پیش کر رہے تھے لیکن میرا ذہن ماحول کے اس بحر کو پوری طرح محسوس نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ تو کئی برس پہلے پیش آنے والے واقعات کو دہرائے میں مصروف تھا۔ وہ واقعات جو کافی عرصہ میرے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنے رہے۔ وہ واقعات جن کا میں ایک حصہ تھا مگر مجھے نہ جانے کیوں ان پر آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی

”بیٹا میں تمہاری امت کی قدر کرتا ہوں لیکن تم مسلمان سیاح کی حیثیت سے وہاں نہیں جاسکو گے۔“

”پھر میں کیا کرو۔“

”میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ناگ مندر میں صرف ہندو لوگ ہی جاسکتے ہیں۔“ اس کے ساتھ شاہان کے دماغ میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ ایک ہندو جوگی بن کر وہاں کا سفر کرے پھر تو کوئی اس پر شک نہیں کرے گا اور وہ بھی پورے اطمینان سے اپنا مشن بھی پورا کر لے گا۔ شاہان وہاں سے واپس سرانے میں آ گیا اسی روز شام کو اس نے سر منڈا لیا جسم کو موٹے سیاہ کپڑوں میں چھپایا ہاتھ میں ترشول لیا ہندو جوگی کا روپ بدل کر ناگ مندر کے لیے اور خطرناک پہاڑی سفر پروانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اب شریم کی سنئے۔

شریم راج کماری کو لے کر اس کے باپ کی ریاست کے قریب پہنچ گیا تھا وہ ایک جنگل کی پکڑ پکڑی سے گزر رہا تھا۔ راج کماری ایک تیل گاڑی میں سوار تھی یہ تیل گاڑی شریم اور راج کماری نے راستے میں ایک دیہاتی سے لے لی تھی راج کماری تیل گاڑی چلا رہی تھی شریم اس کے ساتھ بیٹھا تھا شام کا وقت تھا جنگل میں اندھیرا ہو رہا تھا ایک دریا جنگل کے ساتھ درختوں سے دور ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا راج کماری اور شریم باتیں کرتے جا رہے تھے انہوں نے جنگل میں کھوڑوں کے نہانے کی آواز سنی شریم نے کہا۔

”خاموش تیل گاڑی کو درختوں کے نیچے کرلو۔“

ان کا خیال تھا کہ وہ یہ کیا راستہ چھوڑ دے تاکہ جو کھڑسوار اوجھڑا رہے ہیں وہ آگے نہ بڑھ جائے۔

راج کماری نے تیل گاڑی سڑک سے اتار کر کھتے درختوں میں جھاڑیوں کی اوٹ میں کرنی تیل بڑے آرام سے گھاس کھانے لگا راج کماری کو لے کر شریم جھاڑیوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”تم ان جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی رہو، میں آگے

جائوں گی۔“

”اس کئے سرورانی عورت کا خاوند ہے، آنے دو۔“ دوسرے قاتل نے تلواریں نکال کر کہا۔

”اس کا بھی سر کاٹ کر اس کی بیوی کے سر کے ساتھ لے جا کر فروخت کر دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے عورت کا خاوند گوارا ہر اتادہاں آن پہنچا۔“

(جاری ہے)

آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا۔

”شرق مشرق ہے۔“

انہی دنوں میرا سامنا مصر کے اس فسون سے ہوا جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے مگر اس کی حقیقت کی تہ تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ میں نے اس فسون کو چشم خود دیکھا ہے۔ میں تو اسے جادو ہی کہوں گا جس پر کوئی ایسا شخص یقین نہیں کرے گا جو دنیا کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس چیز کو بیان نہیں کیا جاسکتا وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ یہی وہ چیز ہے جو آج میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں اور مجھے یہ بتانے میں خوشی ہو رہی ہے کیونکہ میں ان کو بتا رہا ہوں جو اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

آج میرے سارے بال سفید ہو چکے ہیں لیکن اس وقت ایک بھی بال سفید نہ تھا اور میں ایک تھکا دینے والے دن کے اختتام پر عرب بدوؤں کے ایک قبیلے میں پہنچا۔ میں سارا دن تپتے ریگ داروں میں پیدل چلتا رہا تھا میری منزل کوئی اور تھی مگر جہنم کی آگ پر ساتے سورج کے نیچے صحرا کی جتنی ریت پر سفر کرتے ہوئے میں اپنا راستہ کھو چکا تھا۔ میں اکیلا سفر کر رہا تھا۔ دن بھر صحرا کی ریت پر اس بے رحم سورج کے گرم و گرم پر میں شام کو اس نخلستان میں پہنچ گیا تھا۔

وہ بدو عرب تھے ایک ایسا قبیلہ جس کی خانہ بدوشوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہ تھی مگر آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عرب فطرتاً بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور یہ قبیلہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس قبیلے کے شیخ کے خیمے کا دروازہ ہر مسافر کے لیے کھلا تھا۔ میں آگے بڑھا اور قبیلے کے سردار شیخ سعید محمد کو سلام کیا جس نے روایتی گرم جوش سے میرا استقبال کیا۔ نہادو کہ جب میں تازہ دم ہو گیا تو دہنے کے بننے ہوئے لذیذ گرم گرم گوشت سے میری دعوت کی گئی۔ اس کے بعد خوشبودار قہوے کی چمکیوں نے میری ساری تھکان اتار دی۔ شیخ سعید میرے سفر کی روداد پوری دل چسپی سے سن رہا۔ مصر میں ایک عرصے کی صحراوردی نے مجھے عربی زبان بڑی اچھی طرح سکھا دی تھی اور اب تو میں اسے الہی زبان کی طرح ہی بولتا

مجھے آج ایک لمبے عرصے بعد دوبارہ قاہرہ شہر میں آنے کا اتفاق ہوا۔ میں تو شاید اپنے بیٹے وقت کی ککب کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے یہاں دوبارہ نہ آتا مگر حالات مجھے یہاں پہنچ لائے۔ مجھے یہاں کچھ کاروباری معاملات سمجھانے تھے۔ میرے جو حالات آج ہیں وہ اس وقت نہیں تھے۔ آج تو میرے بالوں میں سفیدی اتر چکی ہے اور رگوں میں بھی برف نے بھرا کر لیا ہے مگر اس وقت میں نوجوان اور توانائیوں سے بھرپور تھا۔ مصر کے ریگ دار میرے قدموں کے نیچے تھے اور نظریں بلند ہر اموں کی چوٹیوں پر۔

میں ایک فرانسیسی کمپنی میں ملازم تھا جس کا کام قدیم مصری فراغند کے مقابر کی تلاش تھا۔ میں اس کمپنی میں صرف پیسے کی خاطر شامل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ میرا جنون تھا۔ مصری تاریخ میرے لیے ایک نشے کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں تاریخ کے ان سنگی اوراق کو اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے محسوس کرتا اور پڑھنا چاہتا تھا۔ صحرا میری زندگی کا خواب تھا جہاں میں ان دُش شدہ ذہانچوں کو بے آرام کرنے کے لیے پھر رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ کمپنی جس کے لیے میں کام کر رہا تھا میرے اس نشے، اس جنون کو پورا نہیں کر سکتی اس لیے بعض اوقات میں اکیلا ہی صحرا گردی پر آمادہ ہو جاتا۔ جہاں کسی آثار قدیمہ کی ہینک پڑتی تو خود ہی اکیلا اس کی طرف چل پڑتا۔

بہر حال میں اس تفصیل سے آپ کو پور نہیں کروں گا کہ میں یہ کیسے کرتا بس اتنا بتانا کافی ہوگا کہ میرا جنون مجھے ایسے ٹیڑھے میڑھے صحرائی راستوں پر لے گیا جو قافلوں کی آمد و رفت کے مروجہ راستوں سے بہت دور تھے۔ میری عمر اس وقت بمشکل بیس بائیس سال ہوگی۔ اس عمر میں انسان کسی رکاوٹ، کسی مشکل کی پرواہ نہیں کرتا اور دنیا اسے ایک لذیذ شیریں چھل کی طرح نظر آتی ہے۔ یہی ان دنوں میرا حال تھا لیکن مجھے تجربے نے وہ سکھایا جو ریڈارڈ کپلنگ نے سکھا تھا یعنی

تھا۔ جب رات کی خنکی اترنے لگی تو شیخ نے میرے لیے ایک علیحدہ خیمہ نصب کر دیا۔

یہ صحرا کی مہمان نوازی تھی۔ ایک نیزہ شیخ کے خیمے کے باہر ریت میں گڑا رہتا جو اس بات کا اعلان تھا کہ جو کوئی بھی مہمان کو گزند پہنچانے کی کوشش کرے گا پہلے اسے شیخ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ مصر کے ریگ داروں میں شام کا دھند لگا کیسے اترتا ہے۔ ابھی آسمان صاف اور چمک دار ہے اور اگلے ہی لمحے وہ پورا تاریکی رنگ میں نہا جاتا ہے اور پھر فوراً ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ستارے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ محلی بنڈلی رات اپنی بھرپور جوانی اور نشے سمیت اتر آتی ہے۔ اس رات بھی اس دور دراز تنہا صحرا میں رات اترنے کا یہ سحر انگیز اور دل کش نظارہ میری پوری توجہ سمیٹے ہوئے تھا اور خاموشی کی زبان میں روح سے باتیں کر رہا تھا۔

میرا خیمہ مہمان نوازی کی روایات کے مطابق قبیلے کی سرحد پر نصب کیا گیا تھا جس کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور میں اس سحر انگیز رات کی شوخ جوانی کو اپنی آنکھوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اس چھوٹے سے نخلستان کے چار یا پانچ کھجور کے درخت نظر آرہے تھے جن سے پرے دور دور تک ریت کا آہستہ قافلین بچھا ہوا تھا جو دور تک جا کر افق سے مل جاتا تھا۔ کچھ اونچے نیچے ٹیلے نظر آرہے تھے جن پر ہزاروں لاکھوں بگنوں کی مانند جھلکاتے، ٹٹمٹاتے ستارے عجیب نشہ کر رہے تھے۔ یہ ان خانہ بدوش بدوؤں کے لیے شاید معمول کی بات تھی مگر میں پوری طرح اس کے سحر کا شکار تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک میں اٹھ کر بیٹھ گیا رات سے میری توجہ ہٹ گئی کیونکہ مجھے دور ایک ٹیلے کے اوپر کچھ ہچکل محسوس ہوئی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا کچھ ہی دیر بعد میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی شخص ہے جو ٹیلے سے نیچے اتر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہوا وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔ اس کی چال میں ایک عجیب سی لڑکھاہٹ تھی۔ جب وہ ادھر سے اُدھر لہتا ہوا چلتا تو اس چاندنی رات

میں عجیب سا نظارہ ہوتا۔ وہ ایک لمبی پھٹی پرانی عبائیں لمبوس تھا اور یوں چل رہا تھا جیسے بہت کمزور اور لاغر ہو۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا وہ گہرے گندمی رنگ کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ خردلی چہرہ اور زرد آنکھیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیموں کی طرف ہی آ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا ہوں لگا جیسے بڑاؤ کا ہر کتا اس کی آمد سے باخبر ہو گیا ہو۔ انہوں نے اکٹھے ہو کر اس کو گھیر لیا۔ میں نے ایسا نظارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ لاغر بوڑھا ان کتوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی لالچی سے ڈرانے لگا مگر کتے تعداد میں زیادہ تھے اور چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھا ایک طرف ہٹتا ہوا میرے خیمے کی طرف آیا اور پھر صحن دروازے پر پہنچ کر ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ گر گیا۔ میں اٹھ کر خیمے کے باہر لگا۔ اس اثناء میں کئی دوسرے لوگ بھی اپنے خیموں سے نکل کر اس کی طرف بڑھے مگر میں سب سے پہلے وہاں پہنچا اور بوڑھے کی گری ہوئی لالچی اٹھا کر کتوں کو ڈرا دھمکا کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد میں جھکا اور اچھی بوڑھے کا سر قہوے سا اوارا تھا کراس کو سہارا دیا۔ ایک ہلکی سی آواز اس کے حلق سے نکلی اور اس نے میرا ہاتھ مغربی سے پکڑ لیا اور اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی مٹی مٹی کی ایک صراحی خیمے کے دروازے کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ میں فوراً صراحی تک پہنچا اور اسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ پیالے میں پانی ڈالا اور بوڑھے کے منہ میں پکانے لگا۔

بھوم میرے ارد گرد بالکل خاموش کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے خاموش شیم داگاہوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔ پانی پینے کے بعد بوڑھا میرے بازوؤں کا سہارا لیتا ہوا دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے کو یوں اٹھتے دیکھ کر ارد گرد کھڑے عرب بدو میرے بارے میں داد و تحسین کے نعرے بلند کرنے لگے جو میں عربی زبان اچھی طرح جاننے کے باوجود بھی سمجھ نہیں سکا کیونکہ یہ الفاظ میرے لیے اجنبی تھے۔ عین اسی وقت شیخ سعید محمد وہاں پہنچ گیا اور بھوم کو چیرتا ہوا



آگے آیا چیتروں میں لمبوں بوڑھے شخص کو احترام سے سلام کیا اور اس سے حال احوال پوچھنے لگا۔ اس شخص نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنا سر ہلایا اور دوبارہ پانی کی صراحی کی طرف اشارہ کیا اور اشارے سے ہی کھانے کا مطالبہ کیا۔

جلد ہی اس کے لیے کھانا آگیا۔ وہ بار بار بے صبری سے غٹاٹ پانی پی رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آس پاس کھڑے عربوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے ہاتھ سے اپنی پٹنوں، اپنے لمبوں اور سینے کو چھو کر مجھے سلام کیا اور ایک طرف چل پڑا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے ایک بھی لفظ نہیں بولا تھا۔ قبیلے کے کتے ایک دفعہ پھر ہونٹنا شروع ہو گئے۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے اس شخص کو جاتا دیکھ رہے تھے جو جلد ہی صحرائی اندھیری وسعتوں میں گم ہو گیا۔ جب سارے لوگ پلٹ کر اپنے خیموں میں جانے لگے تو شیخ سعید محمد نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نہایت سیدھے اور متاثر کن الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اس کے اس انجینی مہمان کی خاطر مدارت اور دیکھ بھال کی۔ یہ بدوی شیخ شریک طرح بہادر اور عورت کی طرح نرم دل تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔

اچانک ہمیں دور صحرائی اس جمبول بوڑھے آدمی کے تعاقب میں بھاگنے والے کتوں کی غرائیں سنائی دیں اور پھر فوراً ہی غرائیں گیدڑوں کی چیخوں میں بدل گئیں۔ ایسی کرب ناک اور ہولناک چیخیں میں نے صحرائی وحشتوں میں پہلے ہی نہیں سنی تھیں پھر اچانک یہ آوازیں بھی تم گئیں مگر وہ کتے واپس نہیں آئے۔ میں نے شیخ کو مخاطب کرنا چاہا اور اُدھر دیکھا مگر وہ شاید جا چکا تھا اس لیے میں بھی اس واقعے پر سوچتا اور حیران ہوتا ہوا واپس اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔ لیٹتے ہی نیند کے جمبوٹے آنے لگے مگر میرا ذہن اس پہلی آنکھوں والے آوارہ گرو سیلانی کے گرد گھوم رہا تھا پھر تجانے کب مجھے نیند کی دیوی نے اپنی آنکھوں میں لے لیا۔ میں کتنی دیر سو یا کچھ اندازہ نہیں مگر جب آٹھ کھلی تو سحر کی ٹھنڈی

الھیاں صحرائے کے سینے کو لگداری تھیں۔ جھپٹنے کی روشنی خیمے میں پھیل چکی تھی اور کوئی چیز خیمے کے پردے کو کھرچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ اپنا رپو لیا اور اٹھایا اور لپک کر خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھایا اور باہر جھانکا۔ ایک سایہ سانچے کے چھ کھسکا محسوس ہوا۔ میں نے سمجھا یہ پڑاؤ کا کوئی کتا ہو گا جو کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں یہاں بلیک رہا تھا۔ میں مطمئن ہو کر واپس مڑنے ہی والا تھا کہ اسی وقت صبح کے سنائے میں ایک ہلکی سی آواز سنی۔ چونک کر اُدھر اُدھر دیکھا تو محسوس ہوا کہ صبح کے اس دھندلے لگے میں کچھ دور مشرق کی جانب ایک تہا سایہ کھڑا تھا۔ ان دنوں جوانی کی طاقت کا نشہ تھا۔ میں بائیس سال کی عمر میں سب ہی بہادر ہوا کرتے ہیں۔ اپنا لہجہ شانوں پر اڑھتے ہوئے میں اس سائے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا جب اس سائے نے ایک ہاتھ سے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں فوراً پیچان گیا کہ یہ وہی پراسرار انجینی تھا جو رات میرے خیمے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب تک آیا اور اس سے پوچھا کہ کیا اس نے مجھے بیدار کیا ہے۔ اس نے کچھ بولنے کی بجائے صرف اثبات میں سر ہلادیا۔ مجھے اس کی خاموشی عجیب سی لگی مگر میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔ اب اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور مڑ کر پڑاؤ سے دور ایک طرف چلنے لگا۔ میں بھی بنا سوچے سمجھے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اگرچہ معمول کے مطابق پڑاؤ کے گرد محافظوں کا پہرہ تھا مگر اس وقت حیرت انگیز طور پر کوئی محافظ ہمارے سامنے نہ آیا۔ پڑاؤ سے کچھ دور جا کر وہ بوڑھا کارا اور میری طرف مڑا۔ اس نے اپنی خیدہ انگشت سے ایک دفعہ پڑاؤ اور پھر میری طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد اس شاہراہ کی طرف اشارہ کیا جو دریائے نیل کے کنارے تک جاتی تھی۔ اس کی اس حرکت سے میں نے اندازہ لگایا کہ

یا تو وہ گونگا ہے یا پھر خاموش رہتا پسند کرتا ہے اس لیے میں پوچھنے لگا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ میں پڑاؤ کو چھوڑ کر اس طرف چلا جاؤں۔“

میری بات سن کر اس کی عجیب اور زرد آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”نوراً؟۔۔۔۔۔“ میں نے پھر پوچھا۔ دوبارہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”کیوں؟۔۔۔۔۔“ میں نے زچ سا ہو کر پوچھا۔

اس نے ایک بار پھر مجھے خاموشی کی زبان میں سمجھانے کی جو کوشش اس کا مطلب تھا کہ مجھے اس پڑاؤ میں جان کا خطرہ ہے اور مجھے سورج طلوع ہونے سے پہلے ان بدوؤں سے دور چلے جانا چاہیے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس انجینی کی سنجیدگی کا کیا عالم تھا مگر میں نے اسے پاگل ہی سمجھا۔ میں نے اپنا سر جھکا اور ناگواری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے مڑنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت میں نے اس کی عجیب آنکھوں میں عجیب سی افسردگی دیکھی جس سے میں متاثر ہونے لگیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا، مڑا اور صحرائی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں نے جو راستہ چنا تھا وہ آگ کی طرف جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی خیمے میں جا کر دوبارہ سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا اور پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج آگ برساتا طلوع ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ گونگے بوڑھے سے صبح سویرے ملاقات مجھے ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہی تھی میں سوچنے لگا کہ شاید یہ خواب ہی تھا مگر مجھے اس پر زیادہ غور و فکر کرنے کی سہلت نہ ملی کیونکہ اچانک ہی خیمے کے باہر ایک عجیب اور پرشوری لپچل شروع ہوئی تھی۔

میں نے فوراً باہر جا کر مصورت حال جاننے کی کوشش کی۔ جو کچھ میں نے باہر دیکھا اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں اپنی جگہ جم سا گیا اور ساکت اس کی طرف دیکھنے لگا کیا آپ جانتے ہیں سموم کیا ہے؟۔ صحرائی لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں اس

روز یہ میرے سامنے تھا۔ اپنی صحرائی زندگی میں میں نے اس کے متعلق سنا بہت تھا مگر آج میرا واسطہ اس سے پڑ ہی گیا تھا۔ یہ طوفان اس قدر شدید تھا کہ ریت کی ایک بلند دیوار سی تن گئی تھی اتنی بلند کہ سورج اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ یہ دیوار اتنی دبیر تھی کہ سورج کی روشنی اس میں سے کوئی راہ نہ پار ہی تھی اور دن میں رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

ریت کے اس طوفان میں مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ چونکہ مجھے پہلے بھی اس طوفان سے واسطہ نہ پڑا تھا اس لیے اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر مجھے معلوم نہ تھیں میں یونہی ہولنوں کی طرح کھڑا اسے دیکھ جا رہا تھا مگر مجھے احساس ہوا کہ یہ عرب بدو اس صحرائی طوفان کے لیے پہلے سے تیار تھے کیونکہ ان کے گھوڑے، اونٹ اور گدھے ایک محفوظ جگہ پر مضبوطی سے باندھ دیے گئے تھے۔ خود انہوں نے سر اور منہ اپنے رومالوں سے ڈھاب رکھے تھے اور اُدھر اُدھر بھاگ کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ اڑنی ریت میری آنکھوں کو اندھا کر رہی تھی۔ مجھے سانس لینا بھی دشوار تھا کیونکہ میں اپنے حلق میں ریت بھرتی محسوس کر رہا تھا۔ ان عرب بدوؤں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے سر اور منہ پر کپڑا لپیٹ لیا اور کھجور کے ایک درخت کے پیچھے دبک گیا۔ اس وقت میں سوچنے لگا کہ شاید یہی وہ خطرہ تھا جس سے مجھے اس گونگے بوڑھے نے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی اور میں اس کی بات مان کر اس سے بچ سکتا تھا۔ اگر میں اس کی بات مان کر سورج نکلنے سے پہلے یہ قبیلہ چھوڑ کر دریائے نیل کی طرف نکل جاتا تو اس وقت کسی گاؤں میں پناہ حاصل کر چکا ہوتا۔ مگر پھر میں سمجھ گیا کہ یہ طوفان ایک چھوٹا خطرہ تھا شاید اسلی خطرہ ابھی کہیں آگے تھا کیونکہ کچھ ہی دیر میں طوفان گزر گیا اور پڑاؤ میں موجود ہر شخص اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

طوفان گزر جانے کے بعد پڑاؤ کو دوبارہ ترتیب



## بہترین دعا

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں کیں۔ ہم ان میں سے کوئی بھی یاد نہ رکھ سکے۔ ہم نے کہا: ”حضور! آپ نے اتنی دعائیں کی ہیں کہ میں کچھ بھی یاد نہ رہا۔“

آپ نے فرمایا: ”میں کیا تمہیں وہ دعا نہ بتاؤں جو تمام دعاؤں کی جامع ہو۔ تم یہ کہا کرو۔“

”اے اللہ! ہم تجھ سے وہ تمام اچھی چیزیں مانگتے ہیں جو تیرے نبی کریمؐ نے تجھ سے مانگیں اور ان تمام برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں جن سے تیرے نبی کریمؐ نے پناہ مانگی۔ تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ اور کوئی اور حرکت و طاقت تیری رضا کے بغیر نہیں ہوتی۔“

(محمد رمان ملک - سنہ ۱۴۰۵ھ)

ہوا خوری کے لیے باہر نکلا تو میرے قدم مجھے اس جگہ تک لے گئے۔ زیادہ تر عورتیں پانی بھر کر جا چکی تھیں۔ چند ایک پانی سے بھرے گھڑے اپنے سر یا کولے پر لٹکائے واپسی کا ارادہ کر رہی تھیں ان میں سیکنہ بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے قدم سست ہو گئے۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو وہ پہلے تو جھکی بھر کر گئی اور اپنا گڑا اس نے چشمے کے کنارے پر رکھ دیا۔ دوسری عورتیں آگے نکل چکی تھیں انہوں نے سیکنہ کے رکنے کی کوئی پرواہ نہ کی اور چلی گئیں۔ یہ میرے لیے بہتر تھا۔ میں سیکنہ کے قریب پہنچا تو وہ گھڑی مجھے دیکھتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

”تمہارا نام سیکنہ ہے نا۔۔۔؟“ میں نے جانتے بوجھے اس کا نام پوچھا۔ جواب میں اس نے بجائے کچھ کہنے کے صرف اثبات میں سر ہلادیا۔

”کیا تم کوگی ہو۔۔۔ بولی نہیں ہو۔۔۔؟“ میں

پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ لہو کی گردش جسم کی حرارت کو بڑھانے لگی کیونکہ باریک نقاب کے پیچھے اس کی روشن آنکھیں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ وہ بدوی حور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور سختی کا چوٹی پیالہ میرے قریب رکھ دیا۔ میری بے پناہ نگاہیں اس کے نقاب زدہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں مگر اس کی لامبی سیاہ پلکیں اس کے رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں وہ مجھ سے لگا ہیں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ کچھ بے تاب اور مضطرب سی تھی اور جلدی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید وہ میری موجودگی سے بے چین تھی۔ بنا کچھ بولے پل بھر بعد وہ اٹھی اور جانے کے لیے مڑی تو میں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کسی وحشت زدہ رہتی کی طرح اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ تو چلی گئی مگر میری روح بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ میں کافی دیر تک لیٹا اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ کھانے پینے کا شوق بھی نہ تھا۔ صرف اس کی آنکھوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ جوانی کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جوانی ہوتی ہی بے اصول ہے جب درختوں پر بھل سکتے ہیں تو ان کو تو ناگنا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صحرائی بدوی لڑکیاں اس عمر میں جوان ہو جاتی ہیں جب شہروں میں رہنے والی لڑکیاں ابھی بچیاں ہی ہوتی ہیں اور سیکنہ جس کی مخمور نگاہیں مردوں کی روح تک اتر جائیں وہ ابھی صرف سترہ برس کی تھی مگر صحرائی کھلی فضاؤں نے اسے مکمل جوان بنا دیا تھا۔ دوسری کینزوں سے مجھے اس کا نام معلوم ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ وہ شیخ سعید محمد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

یہ عرب قبیلہ بہار کے آغاز سے یہاں اس نخلستان میں خیمہ زن تھا۔ یہاں سمجھوروں کے اچھے خاصے درخت تھے اور ان درختوں کے نیچے ایک قدرتی چشمہ بھی تھا جہاں غروب آفتاب کے وقت قبیلے کی عورتیں نقاب اوڑھے اور اپنے سروں پر گھڑے اٹھائے پانی بھرنے آیا کرتی تھیں۔ اس روز شام کے وقت میں

میں کتے بھونکنے لگے تو مجھے وہ یوں ڈھا کوٹا اجنبی یاد آ گیا جس نے مجھے یہ جگہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر مجھے اپنے جسم کا ایک انگ ٹوٹا محسوس ہوا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا اور پھر جانے کب سو گیا مگر آگلی صبح جب آنکھ کھلی تو میرا جسم چپ رہا تھا مجھے بخار ہو چکا تھا۔

شیخ سعید محمد خود میری خیریت دریافت کرنے آیا اور اس نے حکم دیا کہ میری تھاردراری اچھے طریقے سے کی جائے۔ میں صحرائی سفر کرنے کے دوران اپنے ساتھ دوائیوں کا انتظام ضرور رکھتا تھا جو آج میرے کام آ رہا تھا۔ شیخ سعید محمد کے غلام اور کینز تھوڑی تھوڑی دیر بعد میری خبر گیری کر رہے تھے مگر اس کے باوجود بخار اترنے میں تین دن لگ گئے۔ میں اس دوران میں اپنے خیمے میں ہی آرام کرتا رہا۔ شیخ سعید محمد کی کینز میرے لیے کھانا اور قہوہ وغیرہ لے کر آتیں۔ ان کے چہروں پر باریک روشنی نقاب ہوتے مگر ہر ایک اپنے خیموں اور جوانی سے علیحدہ علیحدہ پہچانی جاتی تھیں وہ نہ آتی جس کا مجھے انتظار تھا اور جس کی غیر موجودگی مجھے واقعی بیمار بنا رہی تھی۔ جس کی سیاہ غزال آنکھیں میرے خوابوں کا محور بن چکی تھیں۔ وہ سیاہ آنکھیں جو میرے خوابوں میں ستاروں کی طرح چمکتی تھیں۔ میں اپنے خیمے کے دروازے پر اس کے چھوٹے چھوٹے برہنہ پاؤں کی آہٹ کا منتظر رہا مگر بے سود۔ جو تھوڑے روز جھپٹے کا عالم تھا اور میں بستر پر لیٹا اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ آگئی۔ اس کے ہاتھوں میں سختی کا ایک پیالہ تھا جو شیخ سعید محمد نے بطور خاص دینے کے گوشت سے بنوا کر میرے لیے بھجوائی تھی۔ وہ خیمے کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ڈوبے سورج کی کرنیں اس کے دل کش اور مسکون سر آپے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ سورج کی یہ کرنیں اس کے پاؤں تک لہا دے میں اس کے جسم کا ہر ایک زاویہ ہر ایک خط نمایاں کر رہی تھیں۔ میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنے بھول گیا اور پھر اس قدر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ جیسے ابھی

دیا جانے لگا۔ ہر چیز کو واپس اپنی مقررہ جگہ لے جایا گیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا، کپڑے بھاڑے، منہ سے رومال ہٹایا اور اپنے خیمے کی طرف دیکھنے لگا جو ہوا کے زور سے اکھڑ چکا تھا۔ شیخ کے آدمی اب اسے دوبارہ نصب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیخ سعید محمد کے خیمے سے باہر آئی تھی اور ایک ریت آلود غالیچہ بھاڑنے لگی۔ اس کا لباس کچھ زیادہ پتیلی نہ تھا مگر اس کے گلے میں بڑا چاندی کا ہار سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سر کے بال کندھے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں چاندی کی ہی بازیب تھی جو اس کے ہر حرکت پر چمک چمک جاتی۔ آنکھیں دہن، اٹھتی ہوئی ناک، چمکتی ہوئی غزال آنکھیں، بھری بھری جوانی اور جوانی کا اٹھتا ہوا جو بن۔ میں کسی صورت کی طرح بے خود کھڑا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سانس رک گیا ہو۔

اسی وقت دھوپ میں اس کی آنکھیں چمکیں اور مجھے یوں لگا جیسے پراسرار تارکیوں کے دو تلاب ہیں جن میں مجھے اپنا آپ جھلما نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید میری نظروں کی بے باکی کو محسوس کر لیا تھا اور نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں بے خودی کے عالم میں اپنی طرف متوجہ پا کر اس عرب دوشیزہ کے چہرے پر جاکر لالی نمودار ہوئی اور اس نے فوراً نقاب کا ایک سرا مچھٹ کر اپنے چہرے کو ڈھک لیا پھر وہ مڑی اور بھاگ کر خیمے کے اندر گھس گئی۔

ایک نظر صرف ایک نظر اس نے میری طرف دیکھا تھا مگر محبت کے یونانی دیوتا کیو پڈ کا تیر بھی ان نظروں کے سامنے کندھا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو مجھے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی اس لیے میں واپس اپنے خیمے میں آ گیا جو اس وقت تک دوبارہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس کی تمام اشیاء بھی اپنی مقررہ جگہ پر رکھ دی گئی تھیں۔ میں باقی کا سارا دن وہاں لیٹا ان دو سیاہ آنکھوں کے متعلق سوچتا رہا مگر شام ڈھلنے کے بعد جب صحرا





کچھ بول نہ پایا۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنی انگلی سے افق کی طرف اشارہ کیا جہاں صبح کی روشنی کے ساتھ کچھ سیاہ ہولے برآمد ہو رہے تھے۔ اس طرف دیکھتے ہی میں کاپ کر رہ گیا اور گھٹنوں کے بل سیکڑے کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں اپنے آپ کو لاچار اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میرے جوش کا پاگل پن مجھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کالی چٹان کے سائے میں رک کر میں نے اتنا وقت ضائع کر دیا تھا کہ تعاقب کرنے والے موت کا ہگل بجاتے ہمارے سروں پر آن موجو ہوئے تھے۔ اب بھاگنے کا وقت باقی نہیں بچا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں سیکڑے کو اس ہولناک جگہ پر مرنے کے لیے لے آیا تھا اور اب وہ آدمی جو غیر انسانی راستوں کا مسافر تھا ہالوں کی طرح فحش کرتے ہوئے اشاروں سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت میرا دل مکمل ماؤف ہوا جا رہا تھا اور سیکڑے کا جسم خوف سے بری طرح کچکپا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی میں اس کی آنکھوں میں پچھلتی وہ بے چارگی بھی نہیں بھول سکتا جو میں نے اس وقت دیکھی۔

بے رنگ صحرائی چھپکیاں اپنے بلبوں سے نکل کر ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ اب وہ سیاہ ہولے افق سے نکل کر سورج کی روشنی میں آگئے تھے اور ہر لمحہ میری وحشت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ جلد ہی ہم تک پہنچ جائیں گے۔ وہ گونگا بوڑھا عجیب انداز میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا اور سیکڑے اس کو دیکھ کر خوف سے سکڑے جا رہی تھی۔ بوڑھے نے پہلے آنے والے عربوں کی طرف اور پھر اپنے پیچھے چٹان کے عقب میں اشارہ کیا۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، بھانسنے کا وقت بھی گزر چکا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ سفید گھوڑی باوجود تیز رفتار ہونے کے شاید دو انسانوں کے بوجھ کے ساتھ ان عربوں کے گھوڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اب آنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں اور ہمیں بھانسنے کی بجائے کسی جھپٹے کی جگہ کی تلاش تھی جو یہاں ٹپ ٹپ سکتی تھی۔ میں اپنی

سستی کو سنے لگا جس کی وجہ سے حملہ آور ہمارے سروں پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب بھی اگر ہم نے جلدی چھیننے کی کوئی جگہ تلاش نہ کی تو پکڑا جانا یقینی تھا۔ تعاقب کرنے والے چار تھے جن کی سربراہی شیخ سعید محمد کر رہا تھا۔ اب وہ تقریباً پانچ سو گز دور رہ گئے تھے۔ جب اس جھون بوڑھے نے میرے بازو کو پکڑ کر سمجھوڑا تو میرے حواس میرے قابو میں آئے۔ اس کی آنکھوں میں وحشی سی چمک تھی اور چہرے پر پتلی اثرات تھے کہ جلدی کرو۔ اس کی نگاہوں کا مطلب مجھے ہوئے میں نے سیکڑے کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”جلدی چٹان کے اوپر چلو یہ آدمی میں نہیں چھپا دے گا۔“

وہ چلائی۔ ”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں۔“ اس کی بات سن کر میں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اس بوڑھے سے پیچھے لپکا۔ فاصلہ جو نظر آتا تھا وہ اس سے زیادہ تھا۔ چٹان پر چڑھائی بھی مشکل تھی۔ میرے راہ نمائے ہاتھ بڑھا کر میری مدد کی۔ میں اس پھسلن زدہ چٹان چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور سیکڑے کو بھی سنہیال رہا تھا۔ اس کا خوف اس جگہ کی بیابانی اور تعاقب کرنے والوں کی وجہ سے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ اس صحرائی بوڑھے سے بھی بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی بلکہ خوف سے پاگل ہوئی جا رہی تھی اور بری طرح زردی تھی۔ وہ بوڑھا گھوڑی دور اوپر چٹان میں موجود ایک چھوٹے سے غار کے سامنے رک گیا جو اونچائی میں پندرہ یا سولہ انچ سے زیادہ نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہوا میں اپنے ہاتھ چلانے لگا۔ اس کا لبادہ ہوا میں اڑ رہا تھا اور آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ہم اس غار کے اندر رینگ جائیں۔ خوف سے چلتی کسمپاسی سیکڑے میری گرفت سے لٹکی اور چٹان پر تین چار قدم نیچے پھسل گئی۔ وہ یہ غار دیکھ کر ڈر گئی اور چلائی۔

”نہیں اس جگہ نہیں۔۔۔ یہ بوڑھا ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔۔۔ اس جگہ نہیں۔“ اس دوران میں گھڑ سوار وہاں آن پہنچے تھے۔ چٹان کے دامن میں سعید محمد گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور

اب ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی بندوق سیدی کی شست باندھی نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ حالانکہ یہ عرصہ پہلے کی بات ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے آج ہی کی بات ہو اس نے میری دنیا بدل دی۔ ہمارے نیچے چٹانی بھول بھلیوں میں قسمت کی دیوی شیخ کی کہنی کے پاس کھڑی تھی۔ ٹھیکر کھینچنے کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی اور پھر اس رشتے سنانے میں فائر کی آواز کوئی فوراً ہی ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ میں نے سیکڑے کو نیچے پیٹتے دیکھا وہ میرے قدموں کے پاس گر گئی اور اس کا ہواں سیاہ چٹانوں پر بہنے لگا جن پر وہ کچھ پر پہلے لیٹی ہوئی تھی۔

میری دنیا میری نگاہوں کے سامنے تاریک ہونے لگی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم مغلول ہو رہا ہو۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے سیکڑے کے بے جان ہوتے جسم کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کالی چٹانوں پر سرخ لہو اور سیکڑی آنکھوں میں حبت کی کک دیکھ کر میں خود بھی اس کے قریب ہی تقریباً ڈھس گیا۔ اس سے اپنی آخری ہنگامی میرے سینے پر لی۔ اس وقت مجھے سورج کی گرمی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر میں نے شیخ سعید محمد کی بندوق لوڈ ہونے کی آواز سنی مگر اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے صرف ایک اور گولی کا انتظار تھا مگر اس کو نکلے بوڑھے نے مجھے سیکڑے کے مردہ جسم سے تقریباً نوچ کر علیحدہ کیا اور اس تاریک غار کے اندر کھینچ لیا۔

میرا سکت ٹوٹ گیا اور میں چیخ اٹھا۔ اب عرب بدو چٹان کی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ پچاس گز دور تھے۔ مجھے شیخ سعید محمد کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور بوڑھا مجھے اپنی پوری قوت کے ساتھ ٹھیکٹ رہا تھا۔ میں غار کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے سیکڑے کے مردہ جسم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے وہیں ہمارا اور بدوؤں کو اپنے قریب آتے دیکھتا رہا۔ اچانک اس کو نکلے بوڑھے کی مزاحمت رک گئی۔ اس نے مجھے بچانے کی اپنی پوری کوشش کی تھی مگر موت شیخ سعید محمد کی صورت میں اب میرے سر پر آن پہنچی تھی۔

اگر میں غلط نہیں تھا تو بوڑھا صاحب اپنی جان بچا رہا تھا۔ مصر کا ذکر بغیر جادو کے مکمل ہی نہیں ہوتا۔ یہ کہانی بھی مصر کے رینگ زاروں میں لکھی جا رہی تھی تو پھر اس میں جادو کہاں تھا شاید جادو یہی تھا کہ سیکڑے نے اپنی جان دے کر میرے جھلی، مٹلی اور جسمانی پیار کو بچے پیار میں بدل دیا تھا اور اب میں اس کے لیے جان بھی دیتے کو تیار تھا مگر یہاں ایک اور جادو بھی تھا جو اس لمحے میرے ارد گرد پنپ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ شیخ سعید محمد کی گولی مجھ تک پہنچی میں نے ایک عجیب سی دردناک کراہ سنی۔ یہ آہ میرے عقب سے آگئی تھی ایسی آواز میں نے پہلے بھی نہیں سنی تھی۔ اس غیر انسانی آواز نے میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑادی۔ میں نے غیر ارادی طور پر سر کو پیچھے دیکھا تو چٹان کی چوٹی پر وہ بوڑھا اپنے بازو پرنڈے کے پر کی طرح پھیلائے کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اس کے سلق سے وہ غیر انسانی کراہ بلند ہوئی یہ تو کسی انسان سے نہ کسی جانور سے مشابہہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک عجیب سی شان پیدا ہو چکی تھی۔ وہ مکمل طور پر بدلا نظر آ رہا تھا۔

تیسری بار پھر اس نے وہ غیر انسانی چیخ بلند کی اور پھر چٹان میں سینے چھوئے چھوئے غاروں میں سے ایک میں سے ایک گیدڑ نے اپنا سر باہر نکالا۔ عموماً گیدڑ دن کی روشنی پسند نہیں کرتے وہ ایک شبینہ جانور ہے دوسرے جانداروں سے کئی کترانے والا مگر اس وقت دن کی روشنی میں جب سورج پوری طرح چمک رہا تھا ایک عجیب حیرت مجھے طغیر رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا گیدڑ، دوسرے کے بعد تیسرا، چوتھا، پانچواں پھر پتہ نہیں وہ پانچواں، پانچ سو میں کتنی جلدی بدلا اور پھر شاید وہ پانچ ہزار بن گئے۔ چٹان میں بے ہر سوراخ سے گیدڑ نکل رہا تھا اور وہ ایک غول کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ میری حیرت ایک طرف رہ گئی اور مجھے خوف نے آن گھیر لیا۔ میں اپنا غم اور دکھ بھول گیا۔

یہ صحرا اب ریت کا نہیں بلکہ گیدڑوں کا صحرا بن





## سویلی کی چمگادڑیں

عمران قریشی - کوئٹہ

اچانک آسمان پر خونی چمگادڑوں کا غول امڈ آیا، اور پھر ان آدم خور خونی چمگادڑوں نے پورے علاقے کو تھس تھس کر کے رکھ دیا اور جو بھی ان کے قابو میں آیا وہ نیست و نابود ہو کر رہ گیا۔

قسمت کا مارا اگر سات سمندر پار بھی چلا جائے تو سکون نہیں ملتا ایک سبق آموز کہانی

**جزیرہ سوئی** نہایت خوبصورت اور سرسبز درختوں کے گھیرے میں واقع پر اسرار اور پرخطر راستوں والا جزیرہ تھا۔ سمندر میں چھپی ہوئی خطرناک چٹانوں اور لہروں کے درمیان تو دوں کے درمیان سے صبح و سلامت لنگر کر جزیرے کی حدود میں قدم رکھنا نہایت مشکل اور ناممکن مرحلہ تھا۔ لیکن اسٹیمر کا اسٹیئرنگ سائی لیو کے تجربہ کار ہاتھوں میں تھا وہ متحدہ بار سوئی کے جزیرے تک

کا سفر کر چکا تھا۔ جزیرے پر مستقل رہنے کا ارادہ ناگزیر وہ حالات پر مشتمل تھا اس کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے تنویر کے چہرے پر افسردگی بھرے تاثرات تھے۔ وہ موہاٹل پر اپنے مختصر گھرانے سے بات چیت کر رہا تھا۔ بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ اور وہ گھر سے بہت دور پر اسرار جزیرے کی رہائش کا منتفی تھا۔ زندگی کے انہوں کے اختتام پر اور موت کی وادی

گیا تھا۔ ان کا ایک سمندر تھا جو ٹھنڈی بارہا تھا دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے ہر طرف گیدڑی طرح تھے اور ان سب کا رخ عرب بدوں کی طرف تھا۔ وقفے وقفے سے وہ غیر انسانی کراہ سحر کے سنائے کا سینہ چیر رہی تھی۔ ہزاروں موٹے تازے گیدڑوں کا غول عرب بدوؤں کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا شیخ سعید محمد ایک بہادر اور جری شخص ہے مگر اس غول بیابانی کے سامنے اس کے پاؤں اکڑ گئے۔

میں نے چاروں گھڑ سواروں کو خوف کے عالم میں واپس بھاگتے ہوئے دیکھا سفید گھوڑی بھی بغیر سوار کے ان کے ہمراہ بھاگ رہی تھی اور ان کے پیچھے زرد رنگ کے گیدڑوں کا غول ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ آخری دفعہ میں نے اس کو نکلے بوڑھے کی غیر انسانی چیخ سنی اور پھر گیدڑ پلٹنا شروع ہو گئے۔ میں بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھا میری مدد کرنے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو جمع کر کے سامنے لے آیا تھا۔ جب تک میں اپنے حواسوں میں آتا اور میرا دماغ کام کرتا وہ بوڑھا مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اب گیدڑ بھی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں اس کالی چٹان پر تنہا اپنی محبت کی لاش کے پہلو میں گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ صحرانوردانہ کوٹنگا ہو چکا تھا ہر طرف سکوت مرگ طاری تھا۔

میں ہمت کر کے اٹھا اور اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کے لیے صحرا کی ریت میں لکھو دی جس پر کوئی نشانی نہ تھی مگر میں نے اپنی جوانی اس کی قبر پر چھوڑ دی۔ اس دن سے میں ایک قسم کے گناہ کے حصار میں ہوں میں نے سعید محمد کا پیار بھرا اعتقاد کھو دیا تھا۔

شام ڈھلے میں اٹھا اور بغیر کسی منزل کے ایک طرف چل پڑا۔ میں نہیں جانتا وہ کوٹنگا بوڑھا کہاں چلا گیا تھا جس کی شکرگزاری نے موت سے مجھے بچا لیا تھا مگر اب میرا رہبر کوئی نہ تھا۔ میں اندازے سے ہی ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں میں کتنے دن چلتا رہا جو تھوڑا بہت سامان میں پڑاؤ سے ساتھ لے کر چلا تھا اور



کی شروعات پر انہوں کی یادداشتیں ہی ہے۔ اس کی زندگی کا اختتام ہونے والا تھا۔ اور موت سے قبل وہ جی بھر کر انہوں سے بات چیت کر لیتا چاہتا تھا۔ چند دنوں کے بعد بڑی عید تھی۔

قربانی کا دن..... وہ قربانی کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ جانور کی نہیں..... بلکہ اپنی قربانی..... ماں کی آنکھوں کا آپریشن..... چھوٹی بہن کی شادی اور اکلوتی بیٹی کو اچھے اسکول میں داخل کروانا تھا۔ وہ پردیس آنے کے بعد یہاں کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے مقصد کو بکھر بھلا چکا تھا۔ مقصد کی یاد اب آئی جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے جسم میں موجود خون کی مقدار تیزی کے ساتھ کم ہو رہی ہے۔ بیماری کا کوئی علاج نہیں تب اسے مقصد یاد آیا اس کی تمام جمع پونجی شراب نوشی اور عیاشیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ زندگی کے دن کتنے تھے۔ اس لئے اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ اور سائی کیساتھ مل کر بہت بڑے صنعت کار کی اکلوتی لڑکی کو اغوا کیا۔ تاوان کے طور پر اچھی خاصی رقم ہاتھ آئی۔

لیکن بد قسمتی سے صنعت کار کی لڑکی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ تاوان لینے کے باوجود لڑکی کے ناپٹنے کے بعد صنعت کار نے تمام شہر کی پولیس کو ان دونوں کے پیچھے لگا دیا۔ ان دونوں کے لئے شہر میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اور مجبوراً انہوں نے دو دروازے کے جزیرے سویلی کا رخ کیا۔

تو جزیرے پر آنے سے قبل تاوان سے حاصل کردہ رقم اپنی ماں اور بہن کو بھجوا چکا تھا۔ یوں اس کی قربانی مکمل ہو چکی تھی۔ رقم تقریباً چھ لاکھ کے نگ بھگ تھی۔ اتنی رقم اس کے مختصر گھر لانے کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔

سائی یو نے اسٹیر کو جزیرے کے دیران ساحل کے کنارے صدمہ دیا۔ اور نیچے اتر کر لنگر کو تہیہ دینے لگا۔

تو نے تنہی دیکھی لگا ہوں سے جزیرے کا جائزہ لیا۔ اور گرد و دور درنگ سبز درختوں کا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن درختوں کے درمیان چند کچے اور جدید گھروں کا سلسلہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں کچھ بھی دکھائی دیتی تھی۔ آسمان پر

گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور یوں بامعاذی کا آغاز ہونے والا تھا۔ اسٹیر کو لنگر انداز کرنے کے بعد سائی نے تویر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”جناب کیا آپ آسیب پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر نہیں رکھتے تو یقین کر لیجیے یہاں متعدد موجود ہیں۔“

تویر چلا نک لگا کر اسٹیر سے نیچے اتر آیا۔ اور سائی کے پیچھے جزیرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”ان باتوں پر یقین کرنا بے وقوفی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جسے میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ میرے خیال میں سب سے بڑا آسیب لوٹان انسان خود ہے۔“

سائی کیسکراتے ہوئے بولا۔

”کچھ دیر آپ کو آسیب دیکھنے کا اتفاق ہونے والا ہے۔ آپ حیرت زدہ ہونے کے لئے تیار ہو جائیے۔“

تویر افسردہ لہجہ میں ہمکام ہوا۔

”میں موت کی صورت میں آسیب دیکھنے کے بعد بلاشبہ حیرت زدہ ہو چکا ہوں مزید عجائبات اب باقی نہیں ہے۔“

ساحل سمندر کی سفید ریت سے آگے درختوں کے گھنے سلسلے کے درمیان کچے راستے کا آغاز ہوا۔ وہاں میں خشکی طاری ہونے لگی تھی۔ سمندر کی طرف بجلی چمک رہی تھی حالانکہ دوپہر تین بجے کا عمل تھا۔ لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں نے کچے راستے پر آگے بڑھنا شروع کر دیا سائی لیو دوبارہ بولا۔

”سویلی میں راتیں جاگتی ہیں۔ اور دن سوتے ہیں کچھ عرصہ قبل جب میرا یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ تب میں نے دن کے وقت جزیرے کے درمیان میں واقع سویلی جزیرے کا تعقیب معائنہ کیا۔ شہر زیادہ بڑا نہیں تھا..... مکان مضبوط لکڑیوں سے تیار کردہ تھے۔ صرف چرچ کی عمارت سینٹ سے بنی تھی۔ سویلی کی عوام اپنے گھروں میں خوابیدہ تھی۔ اور میں تمام شہر میں گھومنے پھرنے کے بعد واپس اپنے اسٹیر کی طرف آ گیا۔“

تویر نے پوچھا۔

”کیا تمہارا رات کے وقت دوبارہ شہر میں جانے

اتفاق ہوا۔“ سائی لیو انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”کبھی بھی نہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہاں کے ایک بہت خطرناک ہیں۔ انسانی گوشت کھانا ان کی طبیعت میں شامل ہے۔ وہ خون پینے کے بھی عادی ہیں۔“

مرا چاک چرچا ہٹ کی آواز کے ساتھ ایک چمکاؤ تیزی کے ساتھ اڑتی ہوئی تویر کے سر کے پاس سے گزر کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ سائی لیو سکراتے ہوئے بولا۔

”مجھے اس خون پینے والے جانور پر ہرندے سے نفرت تھی۔ جزیرے پر ان کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔“

تویر نے پوچھا۔

”کیا ہم ان آدم خوروں کے درمیان اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمارا جزیرے پر رہنے کا ارادہ طاقت پزیر تو نہیں۔“

سائی لیو بولا۔

”آپ کو گھر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے چند دن قبل جزیرے کے سرکردہ افراد سے میری بات چیت ہو چکی ہے۔ انہوں نے ہر دن کے لئے ایک صحت مند انسان کی ضرورت کا اظہار کیا ہے جس کا وہ خون پی سکیں۔“

سویلی جزیرے سے کچھ ہٹ کر وینا آئیر لینڈ واقع ہے۔ یہاں انسانوں کی کثرت ہے۔ یہ آئر لینڈ ایسے خطرناک علاقوں کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ جنہیں موڈی کاریاں لاحق ہیں۔ وہ وینا آئیر لینڈ میں سمیری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ان میں سے ایک دو کو یہاں لانا میرے لئے مشکل نہیں۔“

سائی لیو خاموش ہو گیا۔

تویر نے پوچھا۔ ”سویلی تک آنے کا راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ جہیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم روزانہ ان جہیوں کو لے کر وینا آئیر لینڈ پر جانے کے بعد واپس آؤ گے۔“

سائی لیو نے غرے لہجہ میں جواب دیا۔ ”وہاں تک جانے کے محفوظ ترین راستے سے“

یوں آگاہوں۔ وینا آئیر لینڈ درحقیقت ان پہاڑی جہیوں سے کافی پہلے واقع ہے۔ اس لئے مجھے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

درختوں کے وسیع دھریض سلسلے کا اختتام ہوا۔ اور وہ رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں متحدہ دو کمروں پر مشتمل لکڑی کے مکان لائن درختوں کے چلے گئے تھے۔ ان کے دروازے بند تھے۔ سائی لیو کے کہنے کے مطابق سویلی جزیرے کے رہائشی اندر آرام فرماتے تھے کچھ آگے جا کر جزیرے کے اکلوتے چرچ کے آثار نمودار ہوئے۔ کچھ دیواروں اور صحت سے ترتیب دیا ہوا چرچ ایک بہت بڑے ہل پر مشتمل تھا۔

جس کے اندر بہت بڑا فائوس نصب تھا۔ یہ فائوس موم بتیوں سے حریں تھا۔ کرسیاں اور بیچ مینگی لکڑی سے تیار کردہ تھے۔ چرچ کے پاس سے گزرنے کے بعد راستے نے مور کاٹا اور نیچے کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ یہاں مکانوں کی تعداد کم تھی وہ ایک دوسرے سے کچھ ہٹ کر واقع تھے۔ ان مختصر مکانوں کے آگے لکڑی کا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اور ہر آدمے کے سامنے لان واقع تھا۔ ایک مکان کے سامنے بیچ کر سائی لیو رک گیا اور تویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”ہماری اس رہائش کا بندوبست سویلی کے سب سے بڑے رکن زوہیری میم کی طرف سے کیا گیا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان معاہدہ چرچ میں طے پایا۔“

گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ دونوں نے بڑ بڑا کر مکان کے اندر کا رخ کیا برآمدے کے آگے بنے ہوئے کمرے میں دو کرسیاں رکھی تھیں ان کے سامنے میز پر اٹھا دروازے کے ساتھ کھڑکی تھی اور کھڑکی کے سامنے والی دیوار میں آتش دان بٹا دکھائی دے رہا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد سائی لیو نے دروازہ بند کر دیا۔ اور تویر کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے لمحہ کمرے میں چلا گیا۔ توہڑی دیر بعد جب وہ باہر آیا تو اس نے ہاتھوں میں کھینچی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے آتش دان میں آگ لگانے کے بعد کھینچی کو آگ پر رکھ دیا۔ اور لوہے کی سلاخ سے ککوں کو کریدتے ہوئے بولا۔

”جناب ہمارے لئے جزیرہ محفوظ ترین مقام ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔ کہ

ہم پوشیدگی کے لئے سوہلی جزیرے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ حالات معقول ہونے کے بعد ہم اپنی منزلوں کا رخ کریں گے۔“

تویر کے چہرے پر ایک دفعہ پھر افسردگی کی لہر ابھرنے لگی اس کی کوئی منزل نہیں تھی وہ صرف انجام کا منتظر تھا۔ اس لئے موضوع تبدیل کرنے کے لئے بولا۔

”جزیرے پر ہماری خوراک کا کیا بندوبست ہے؟“

اسٹیمر میں ایک مہینے کی خوراک اور آپ کی ادویات موجود ہیں۔ بارش رکنے کے بعد میں انہیں یہاں منتقل کر دوں گا۔ اسٹیمر کے نیچے حصے میں انسانی لاش بھی رکھی ہوئی ہے وہ سوہلی والوں کے لئے آج کا تھقہ ہے۔“

تویر کو اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ کھانے پینے کے سامان کی موجودگی سے آگاہ تھا۔ لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسٹیمر کے نیچے حصے میں ایک عدولاش بھی ان کے ہمراہ موجود تھی۔ اس کے انتظار پر سوہلی لیونے اسے بتایا کہ ”وہ لاش اس نے سفر سے قبل ٹکڑی تم دے کر سرد خانے سے حاصل کی تھی جتنا عرصہ سوہلی میں قیام کے لئے درکار تھا اس کے لئے جزیرے والوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے انہیں خوش رکھنا ضروری تھا اور ان کی خوشی کے لئے خون کی دستیابی لازمی تھی۔“

کچھ دیر بعد کافی تیار ہوئی کافی پینے کے بعد سوہلی سامان لانے کے لئے اسٹیمر کی طرف چلا گیا۔ تویر کو کمزوری محسوس ہو رہی تھی وہ اٹھ کر لمبھتہ کرے میں آگیا

کئے رکھا۔ صبح موسم کھل گیا اور خوشگوار دھوپ نے جزیرے کا محاصرہ کر لیا۔ ناشتے میں ڈبل روٹی، مٹھن اور کافی کا اہتمام تھا سانی لیوناشہ کرنے کے بعد لاش کا انتظام کرنے کے لئے ویٹا جزیرے کی طرف چلا گیا گزشتہ رات کی بھرپور نیند کی وجہ سے تویر اپنے آپ کو صحت مند اور خوشگوار محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے سانی لیو کے جانے کے بعد جزیرے کی سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ باہر جنگلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی آپ وہ خوشگوار بھی سرسبز دھوپ ہوئے درختوں کا رنگ آ نکھوں کو بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا جزیرہ حسب معمول سنسان پڑا تھا۔ رہائشی گھروں میں پوشیدہ تھے تویر کے دل میں انہیں دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا وہ جس راستے سے گزر رہا تھا وہاں دور دوریہ مکانات کا سلسلہ دور تک جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ان مکانات کے ارد گرد درختوں کی کثرت تھی اس نے ایک گھر کا انتخاب کیا اور دروازے کی طرف چلا آیا یہاں برآمدہ نہیں تھا اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے ساتھ کھڑکی بنی ہوئی تھی کھڑکی کے پٹ بھڑے ہوئے تھے دکھا دینے پر چوہ پٹ کھل گئے اندر گھر اندھیرا غامضی تھا تویر نے جب میں سے موبائل باہر نکالا اور نارنج آکر نہ کر کے کمرے کے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ کمرہ آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پینک کے پاس الماری رکھی تھی الماری کے اندر برتن تھے پینک کے اوپر چمچت کے ساتھ ایک انسانی وجود الٹا لٹکا ہوا تھا اس کے گرد سیاہ جھلی کا محاصرہ تھا تویر کو اپنے جسم کے روکنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

دور سے دیکھتے پردہ وجود ایک بڑی چگاڑی سے مشابہت رکھتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ انسان تھا اس کے ہاتھ سے پیچھے دو آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن کے اندر سیاہ چٹیلان نہیں تھیں تویر نے ہڑبڑا کر کھڑکی کے پٹ بند کئے اور پکی سڑک پر گھر اٹھ کے عالم میں آگے بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کیا سوہلی جزیرہ چگاڑی نما انسانوں کا مسکن ہے خون اور گوشت چگاڑیوں کا من کھاجا ہوتا ہے جزیرے کو چھوڑ دینا بہتر تھا۔ وہ دونوں ہزاروں کی تعداد میں رہائش پذیر چگاڑیوں سے مقابلہ

کرتے کر سکتے تھے۔ درختوں کے درمیان میں راستہ طویل ریاض پہاڑی کے اوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہ اوپر کی طرف چل دیا۔ راستے کے دونوں کناروں پر لٹریب رکاوٹوں کی جھاڑیاں تھیں سوچنے کی بات یہ بھی کیا اسنے وہ صورت جزیرے کے خالق وہاں کے حیوانی رہائشی ہو سکتے تھے پکی سڑکوں کا ایک چال تھا جو جزیرے کے اندر پھیلا ہوا تھا ہر قسم کی ضروریات سے مزین گھر تھے گرجا گھر کی عمارت بھی یہ سب ان خوابیدہ مقامی باشندوں کے بس سے باہر تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر سرسبز ڈھلوان تھی۔ جہاں سے نیچے نکلا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ تویر نے اپنا کوٹ اتار کر سرسبز گھاس پر پھیلا دیا اور اس پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

اگلے دن بڑی ہمدردی اس کے گھر میں مسائیں کا تانا باندھ جانے لگا۔ قربانی کا گوشت تقسیم ہوگا بچے اور بڑے زرق برق کپڑے بہن کرعید ملنے کے لئے رشتہ داروں کے گھروں کا رخ کریں گے۔ لیکن وہ ان باتوں سے بہت دور نکل چکا تھا۔ سوہلی میں صرف تنہائی اور بے بسی کا عالم تھا یہاں زندگی محفوظ تھی لیکن اینڈ کی آلودشت سے محسوس ہوتی تھی۔ تنہائی کی شغلی آبنار پھلتے ہوئے جسم پر برقی تھی۔ لیکن اس ٹھنڈک میں معلوم سی شغلی پانی جاتی تھی۔ قدموں کی ہلکی چاپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

اس نے آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پہاڑی راستے پر کوئی ہلکے قدموں سے چلتا ہوا اوپر کی طرف گرہا تھا۔ تویر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ قدموں کی چاپ قریب آنے کے بعد بھٹکتا دھانی جانب مڑ گئی۔

تویر نے پھر پکی کے ساتھ کوٹ پہنا اور پکے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستہ سنسان پڑا تھا۔ دھانی طرف سرسبز جھاڑیوں سے بھرپور ڈھلوان تھی۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے اسے سرخ اور سفید رنگ کے کپڑوں کی ٹھٹھک دکھائی دی۔ وہ تیزی کے ساتھ ڈھلوان سے نیچے کی طرف اترنے لگا۔ یہاں خادار جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اسے آگے بڑھنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن

پراسرار وجود جو حقیقتاً جزیرے کا رہائشی نہیں تھا کیونکہ وہ دن کے وقت باہر تھا خادار جھاڑیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ پھر جھاڑیوں کا اختتام ہوا اور وسیع رقبہ زمین پر سرسبز گھاس کے خٹلے کے درمیان چند درخت دکھائی دینے لگے۔

تویر نے جب سرسبز گھاس کے کھلے حصے میں قدم رکھا تب وہ وجود درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو کر نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ تویر درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔ درختوں کے قریب پہنچنے پر اسے کسی لڑکی کی ہچکچاہٹ لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ عمر سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ لڑکی کی عمر بچپن سے تین کے درمیان ہو سکتی تھی تویر نے درختوں کے درمیان نگاہ دوڑائی۔

لڑکی کھٹے درخت کے نیچے رکھے ہوئے بہت بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ تویر نے اس کے سر پرے کا جائزہ لیا عمر اس کے اندازے کے عین میابقی بچپن سے کچھ اوپر تھی۔ وہ سرخ نیکر اور سفید شرٹ میں ملیوں تھی۔ بھورے اور لمبے بال کمر سے نیچے تک چلے گئے تھے۔ وہ ٹینس شوخ پہنے ہوئے تھی اس کی آنکھوں کا رنگ بالوں سے مطابقت رکھتا ہوا بڑا دن تھا۔ ہونٹ سرخ اور رں بھرے تھے۔ تویر کھٹکی باندھے اسے دیکھے چلا جا رہا تھا اس کی نگاہوں کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے لڑکی نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھلی ہوئی خوبصورت صورت مندے کی طرح پھڑپھڑا رہیں تھیں چھوٹا سا ناک پونچھنے کی وجہ سے ٹھٹھکی طرح سرخ دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحے کھٹکی باندھے تویر کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر پٹی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

تویر آگے بڑھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور نرم لہجے میں بولا۔

”تمہاری طرح اس جزیرے کا رہائشی نہیں ہوں۔ قسمت کچھ کر یہاں لے آئی ہے۔“ لڑکی نے تعجب بھرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔



”آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ کہ میں جزیرے کی رہائشی نہیں ہوں۔ اگر میں جزیرے پر ہوں تو پھر یہیں کے رہنے والی ہوں۔“

تویر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جزیرے کے رہائشی سو رہے ہیں۔ جو دن کے وقت جاتے ہیں وہ جزیرے کے رہائشی نہیں ہو سکتے۔“

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس لہجے میں بولی۔

”تمہارا اندازہ درست ہے میں یہاں سے کافی دور لندن کے ایک شہر کی رہنے والی ہوں۔ سوئی جزیرے کے پاس ہمارا جہاز تاحہ ہو گیا پندرہ کے قریب لوگ سوئی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے چگاڑوں نے انہیں بریغال ہٹالیا اور ایک مہینے کے دوران ان سب کا خون نچوڑ کر ان کے ڈھانچوں کو سمندر کے اندر پھینک دیا۔“

تویر نے کہا۔ ”لیکن تم زندہ سلامت ہو۔ ان چگاڑوں سے تمہاری جان بچاؤ کیسے ہوئی؟“

لڑکی بولی۔ ”میری ستم ظریفی کہ سوئی جزیرے کی کرتا ہوا زیمیری میم کے اکوٹے لڑکے جو شوا کو میری خوبصورتی بھاگتی اس نے مجھے جزیرے والوں کے خوالے کرنے کے بجائے مجھ سے شادی کر لی۔ اب وہ رات کو میرا خون نچوڑتا ہے اور صبح میں تمہاری میں بیٹھ کر آنسو بہاتی ہوں۔“

تویر کو اس معصوم لڑکی کی بے بسی پر غصوں ہوا اور وہ تسلی دینے کے لئے بولا۔

”میرے پاس موبائل ہے اگر تم اپنے گمریات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔“

لڑکی بولی۔ ”مجھے سوئی پر رہتے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکی ہوں مجھے یاد نہیں کہ گھر کا نمبر کیا تھا۔“

تویر نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے بتایا۔ ”رنی۔“

تویر بولا۔ ”رنی ڈیئر تم فکر نہ کرو۔ یہاں سے فرار ہونا ہمارے لئے مشکل نہیں ہے میرے ساتھ سائی لیو

کے پاس اسٹیر ہے۔ وہ سوئی سے باہر نکلنے کے راستے سے بھی باخوبی آگاہ ہے۔ میں رات تمہارے متعلق اس سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔“

رنی نے کوئی جواب نہیں دیا اور چند لمحے ادھر ادھر کی بات چیت کرنے کے بعد تویر واپس کیمپن کی طرف آ گیا۔

سائی لیو کی واپسی دوپہر تین بجے کے بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ اسٹیر میں ایک ہٹا کٹا ڈچ نوجوان بھی تھا۔ اسے جذام کا مرض لاحق تھا۔ جسم سے بدبو کے بھٹکے اٹھ رہے تھے۔ مرض حال ہی میں لاحق ہوا تھا اس لئے بیماری اب تک صحت پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی ڈچ نوجوان کے ہاتھ پاؤں کوربوں سے باندھ کر اسے اسٹیر کے نچلے حصے میں لٹایا گیا تھا اسٹیر کو لنگر انداز کرنے کے بعد سائی لیو تویر کے ہمراہ خاموشی کے ساتھ کمرے میں چلا آیا اور کافی تیار کرنے لگا تویر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا تم یہ سب ٹھیک کر رہے ہو؟“ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے کتنے گناہ حید کروں گے کیا اس نوجوان کو معلوم ہے کہ رات کو اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

سائی لیو سر دلچے میں بولا۔ ”اگر اسے معلوم ہوتا تب بھی کیا فرق پڑتا۔ اسے یہاں تک لانا میری مجبوری تھی۔ اگر نہیں لے کر آتا تو سوئی والے رات کو ہمارا خون چوس لیتے۔“ اس نے پانی سے بھری ہوئی کیتھی کو آتش دان میں دھکی ہوئی آگ پر رکھ دیا۔

تویر اس دفعہ نرم لہجے میں بولا۔ ”ہم سوئی سے دور کسی اور جزیرے میں بھی پناہ لے سکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہم چگاڑوں کے درمیان اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کریں۔“

سائی لیو نے جواب دیا۔ ”اس جزیرے کے ارا گرد اور کوئی جزیرہ نہیں ہے اور دور دراز جو موجود ہیں وہ قانون کی بالادستی میں آتے ہیں۔ اس لئے قانون سے بچنے کے لئے یہ جزیرہ نہایت مناسب ہے۔“

تویر بولا۔ ”آج صبح جزیرے کی بلائی پہاڑی

جزیرہ ملاقات ایک مظلوم لڑکی سے ہوئی۔ وہ لڑکی سوئی کی رہائشی نہیں ہے۔ بلکہ لندن کی رہنے والی ہے۔ لڑکی سے دو دھیری میم کے لڑکے جو شوا نے اس سے بدعتی لڑائی کر لی وہ جزیرے سے فرار ہونا چاہتی ہے اس کے لئے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ تم اسے اسٹیر کے ذریعے بحری جہازوں کی گزرگاہ کے قریب چھوڑ کر آ سکتے ہو۔“

سائی لیو غصیلے لہجے میں بولا۔ ”جناب میں سوئی والوں سے راہ دورم استوار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوں اور آپ معاملے کو بگاڑنا چاہتے ہیں زیمیری میم سے مجاہدہ طے کرنے کے لئے مجھے کتنے پاپڑ پٹنے پڑے۔ اگر ان کے متعلق آپ کو معلوم ہو جائے تو شاید آپ دوبارہ ایسی بات نہ کرتے۔“

تویر بولا۔ ”لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا کسی مظلوم و غریب کی سبقت چڑھا کر اپنی زندگی کا تحفظ کرنا مجھے اخلاقی طور پر منظور نہیں۔“

سائی لیو نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا صنعت کاری لڑکی کو شوا کرنا اخلاق کے دائرے میں آتا ہے۔ کیا اس کی لڑکی کو قتل کر کے ہم نے اخلاق کی حدود کو نہیں پھلانگا۔ صرف چند دنوں کی بات ہے جناب حالات کے بہتر ہوتے ہی ہم سوئی کو چھوڑ کر شہر منتقل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک آپ مہربانی کر کے لڑکی کے چکر سے دوری رہئے۔ تو ہم دونوں کے حق میں بڑھو گا۔“

تویر خاموش ہو گیا۔ سائی لیو نے کافی پی ہونے کی نیت سے بستر پر لیٹ گیا لہجے اور تکلیف دہ لڑکی وجہ سے اس کا جسم جھکنے سے ٹوٹ رہا تھا۔ بستر لیٹنے ہی اس نے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

شام ہوتے ہی سوئی کے رہائشیوں نے گھروں کے باہر نکلنا شروع کیا وہ اس وقت عام حالات میں تھے ان کے جسم جھلی نما پروں سے مستحکم تھے لیکن بغور دیکھنے پر ان سے باہر نکلے ہوئے دو دانت صاف دکھائی دیتے تھے ان سب کا رنج چرچ کی عمارت کی طرف تھا۔ لڑکی کے پاس کھڑا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے

اپنے پیچھے سائی لیو کی آواز سنائی دی۔

”جناب یہ سب رات کے طعام کے لئے چرچ سے منسلک میدان میں جمع ہو رہے ہیں ڈچ نوجوان کو اسٹیر سے نکال کر میدان تک پہنچانے کے لئے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔“ تویر نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور دونوں مکان سے باہر نکل کر ساحل کی طرف چل دیئے سوئی کے رہائشی انہیں ملنگی باندھے دیکھتے رہے لیکن ان کی موجودگی سے وہ خائف یا پریشان نہیں تھے آسمان پر چگاڑوں کا غول بیالی گشت کر رہا تھا۔ صبح کے وقت خوب صورت اور لطیف دکھائی دینے والا جزیرہ اس وقت نہایت خوف ناک اور دل پر سنگین طاری کر دینے والا منظر پیش کر رہا تھا۔

ساحل سنسان پڑا تھا۔ اسٹیر کے پینڈے میں ڈچ نوجوان رسیوں سے بندھا مجبور بے بسی کی تصویر بنا دکھائی دیا۔ اس کی بے بسی کو دیکھ کر تویر کو اپنا دل بوجھل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ سائی لیو کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ کچھ دیر کے لئے تویر کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ وہ سائی لیو کی سنگدلی کا متصرف ہونے لگا۔ سائی لیو اپنے مفاد کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا کل کو اگر اس کی ذات پر بات آتی۔ تو وہ تویر کے ساتھ دغا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایسا وقت آنے سے پہلے اسے اپنے مستقبل کے لئے کچھ سوچ لینا چاہئے تھا۔

سائی لیو نے ڈچ نوجوان کو کاندھے کے پاس سے تھاما۔ اور تویر کو اس کی ٹانگیں پکڑنے کے لئے کہا۔ نوجوان نے بالکی سی مزاحمت کی کوششیں کی لیکن مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کی وجہ سے صرف کسمسا کر رہ گیا دونوں اسے اٹھائے اسٹیر سے باہر سوئی کی طرف چل دیئے۔

چگاڑوں کا مختصر شہر سنسان ہو گیا تھا۔ آسمان براؤنی ہوئی چگاڑوں بھی دکھائی نہیں دے رہیں تھیں۔ لیکن چرچ کے پاس ماحول گرم تھا۔ وہ سب ملحقہ میدان میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ تویر اور سائی لیو کے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے سیاہ چلیوں کے بغیر

سفید آنکھوں سے انہیں گھورا پھر ان کے بھوم میں ہانچل پیدا ہوئی۔ وہ ایک طرف تھک کر بھوم کے درمیان میں راستہ بنا رہے تھے۔ اس راستے میں سے اونچے لمبے قد کی عورت نمودار ہوئی۔ وہ نیلی، چمڑا اور سفید شرٹ میں ہلکے سنی اس کا صحت مند جسم لباس میں پیش نظر تمام سہایا ہوا تھا۔ سر کی بال کا ندھے کے پاس ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ خوبصورت اور پردہ زیب تھا۔ لیکن اس کی تمام خوبصورتی کو حلقوں میں گھومتی ہوئی سفید حیوانی آنکھیں مائل کر رہی تھیں وہ چکاڈڑوں پر حکمرانی کرنے والی دوسری مہم تھی۔

تئویر اور سانی لیو کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے  
 بھیڑیے کی طرح رانت نکوسے اور ہماری بھرم ڈھج  
 نوجوان کو پلاسٹک کے گڈے کی مانند اپنے کاموں پر  
 منتقل کیا اور واپس جہوم کی طرف چلی گئی۔ سانی لیو نے تئویر  
 کا ہاتھ تھامو اسے دہائی کمرے کی طرف بھیجنے لگا۔ تئویر کو  
 اپنے پیچھے جہوم میں چھینکوں کی آواز سنائی دی۔ اس  
 نے گردن کو موڑ کر پیچھے دیکھا۔ زومیری میم جہوم کے  
 درمیان میں کھڑی تھی ڈھج نوجوان کو اس نے زمین پر پٹخ  
 دیا تھا پھر تمام چھکاؤوں کا جہوم اس بے بس نوجوان  
 پر ٹوٹ پڑا۔ اسے پیچھے چلانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اورا  
 اس کی زندگی تمام ہو گئی۔

پہاڑ لکلی ہوئی تھی۔ سو بلی حسب معمول سنسان بڑا تھا۔  
 مکاناتوں کی قطاروں کے درمیان سے ہوتا ہوا سو بلی کے  
 اسی علاقے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اپنے دل کا غبار  
 لئے کے لئے کسی انسان کی ضرورت تھی۔ پہاڑ پر چڑھ  
 کر جب اس نے درختوں کے جھنڈ کارخ کیا تب درخت  
 نے اپنے نیچر کھے ہوئے پتھر کو سنسان پایا۔ رہتی وہاں نہیں تھی  
 نے جھنڈ کے علاوہ اور گرد کے علاقے کو چھان مارا  
 وہ نہیں تھی تو یہ اس کے گھر سے آگاہ تھا گزشتہ روز  
 سو بلی کی طرف واپس جاتے ہوئے اس نے اسے گھر کے  
 قریب چھوڑا تھا۔ اس کا گھر سو بلی کا سب سے عالی شان  
 و خوب صورت گھر تھا۔ گھر میں متعدد کمرے تھے لیکن  
 انہی صرف دو تھے۔ زوہیری علیحدہ گھر میں رہتی تھی تو یہ  
 پہاڑی سے نیچے اتر کر سو بلی میں واقع رہتی کے گھر کی  
 طرف چل دیا۔



پر چگاڑوں کے لئے انسانی شکار لے کر آنے والا ہے اگر ہم اسیر کے تہ خانے میں چھپ کر فرار ہونے کی کوشش کریں تو چگاڑوں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“  
رینی بولی۔ ”آپ نے ان کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ جڑیوں کی تعداد میں پرواز کرتی ہوئی اسیر کا تعاقب کریں گی پھر اس پر اتارنے کے بعد انسانی روپ دھارن کر کے ہمیں ختم کر دیں گی۔“

تویر نے اثبات میں سر ہلایا اور رینی کو دلاستہ دینے کے بعد گھر سے باہر نکل کر سو لی چرچ کی طرف آگیا چرچ کا دروازہ منقل نہیں تھا ہال کمرے سے ملحقہ کمرے میں لکڑی کا سامان اور اوزار بڑے تھے تویر بہترین ترکان تھا لکڑی کا فرنیچر بنانے میں اسے اتھارنی حاصل تھی لیکن اسے اپنے اس سرے سخت نفرت تھی۔ اس لئے ملک کو چھوڑ کر دیار غیر چلا آیا تھا لکڑی کا سامان دیکھنے کے بعد اسے اندازہ لگا نے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں مرنے والوں کی تدفین کے لئے تابوت تیار کئے جاتے تھے تاہم کافی عرصے سے کام نہ تھا۔ لیکن سامان کمرے میں ہی رکھا ہوا تھا ساتھ والا کمرہ ہاتھ روم تھا۔ یہاں ہاتھ تک شب کے علاوہ شاور اور بالٹیاں رکھی ہوئیں تھیں پانی کی ٹینکی چھت پر تھی سیرھیوں کے پاس تہ خانے کا دروازہ تھا۔ جس پر تالا لگا ہوا تھا۔

تویر نے پندرہ منٹ کے دوران تمام چرچ کو کھکا ڈالا لیکن تہ خانے کی چابی وہاں نہیں تھی مجبوراً اسے تالا توڑنا پڑا۔ دروازے سے نیچے سیرھیوں پر گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سچائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے جیب میں سے لاکٹر باہر نکالا اور روشن کرنے کے بعد تہ خانے کے اندر اتارنے لگا سیرھیوں کے لامتناہی سلسلے کو عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو تہ خانے کے کپے فرش پر کھڑے ہوئے پایا۔ فرش پر پرانا اور پوشیدہ فرنیچر بکھرا ہوا تھا۔ اس فرنیچر کے درمیان میں سیاہ رنگ کا صندوق پڑا دکھائی دیا۔ وہ تہ خانے کے دروازے کی طرح منقل نہیں تھا تویر نے اسے کھول دیا اندر سیاہ رنگ کی چڑے کی پھیلی کے اندر سو لی کی تاریکی کتاب پوشیدہ تھی

تویر نے کتاب کو ہاتھوں میں اٹھایا اور سیرھیاں چڑھ کر تہ خانے سے باہر چلا آیا بارہائی کمرہ خالی پڑا تھا سانی لیوا بھی تک واپس نہیں آیا تھا اس کے آنے سے قبل وہ کتاب کا مطالعہ کر سکتا تھا چڑے کی پھیلی کے اوپر چڑے کی ہی رسی لپٹی ہوئی تھی جسے وہ نے بند کیا گیا تھا تویر نے گرہ کو کھول کر کتاب کو باہر نکالا وہ مختصر اور ہاتھ سے لکھی ہوئی سیاہ جلد پر مشتمل کتاب تھی۔ پہلے ورق پر سو لی کا حدود درج تھا اور دوسرے صفحے پر سو لی کے رہائشیوں کی تفصیل بمع رہن و ہن بطور طریقے اور رسم درواج کے متعلق تحریر تھا۔ وہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔

ایک صدی قبل جزیرہ سو لی کوئی غیر معمولی جزیرہ نہیں تھا یہاں کے رہائشی نہایت شریف انیس اور دین دار واقع ہوئے تھے۔ غیر معمولی حدود اربعہ کی وجہ سے باہر سے آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو کچھ تھے وہ سفری جہازوں کی تاجا کی کے مہوں منت تھے اپنے وقت میں جزیرے کو پراسرار بیماری نے آگھیرا سو لی والوں کے جسموں میں خون کی کمی پیدا ہونے لگی اسوات کے سلسلے میں روانی آگئی سو لی کے رہائشی پریشان دکھائی دینے لگے انہوں نے جزیرے کے واحد وچ ڈاکٹر سے رجوع کیا وچ ڈاکٹر خود بھی بیماری کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس کے پاس بیماری کا سدباب نہیں تھا لیکن اس کے محدود دماغ کے مطابق خون کی کمی کو خون کی فراوانی سے دور کیا جاسکتا تھا اس لئے اس نے جزیرے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ مرنے والے رہائشیوں کے جسموں میں چرچ جانے والے خون سے استفادہ حاصل کر کے تیزی کے ساتھ پھیلتی ہوئی بیماری کو روک سکتے ہیں یہ ایک کراہیت آمیز طریقہ کار تھا لیکن ان کے پاس مزید چارہ کار نہیں تھا اس لئے انہوں نے مشورے پیش کرنا شروع کر دیا۔

تب انہیں حیرت انگیز طور پر اپنے جسموں میں فائدہ مند قوتیں انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ خون پینے کے عادت میں بری طرح مبتلا ہونے لگے۔ ان دنوں سو لی کا پادری ہونے کی بدولت جزیرے کے پراسرار حدود اربعہ اور رسم درواج پر کتاب تحریر کرنے کی

کوششوں میں مصروف تھا۔

سو لی والوں کو غلط عادت میں مبتلا ہوتا دیکھ کر اس نے کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ ترک کیا۔ ان کو سمجھانے بھانے لگا۔ حیرت انگیز طور پر وہ سیری باتوں کو سن کر مشتعل دکھائی دینے لگے چند رہائشیوں کے علاوہ موزوں مرض کی تباہ کاریوں سے اب تک محفوظ تھے۔ ان تمام سو لی والوں نے میرے خلاف بائیکاٹ کر دیا وہ مجھے ختم کر دینے کے لئے بے چین دکھائی دینے لگے۔ مجھے یہ جان کر دل میں خوف محسوس ہونے لگا کہ میرا جسم سخت مند خون سے لبریز تھا۔۔۔۔۔ اور ان سب کو خون کی شد ضرور تھی ان کے خطرناک ارادوں کو بھانپنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو چرچ کی عمارت میں قید کر لیا اور تیزی کے ساتھ کتاب کی تکمیل میں مصروف ہو گیا میں نے جزیرے میں پھیلنے والی بیماری کے متعلق تفصیل کے ساتھ تحریر کیا اب چند تفصیلات کے متعلق غلطی طور پر تحریر کرتا ہوں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے خونی چگاڑوں کی شہر پند فطرت سے بچنے کی تدبیر کی جاسکتی ہے۔

سو لی کی مخلوق عام چگاڑوں کی طرح روشنی سے ناگف ہے اس لئے رات کے اندھیرے میں باہر نکلتی ہے شے کی چمک یا پھر شبیہ ان کے سیاہ جسموں پر بارودی گولے کی طرح اثر انداز ہوتی ہے پانی کی بوجھاڑ بھی ان کے حملے کے خلاف مفید ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے ان کی تعداد میں کمی غیر معمولی طور پر اس بیماری کا باعث ہے خون کی عدم دستیابی کی وجہ سے انہیں کافی کافی عرصے تک زندہ رہنا پڑتا ہے یقیناً یہ بھوک کی نسل کی بیماری کا باعث ہے میری چند سطر پر آخری تحریر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

”چرچ کے باہر خونخوار چگاڑوں کا ہجوم میرے خون سے پیاس بجھانے کا منتظر ہے چند لمحے پہلے انہوں نے دروازے کو ٹوٹنے کا آغاز کر دیا ہے میرے اس حفاظتی اقدام کے طور پر موم تیلوں کے علاوہ نارنج کی ہے پانی کی چرچ میں کمی ہے لیکن میں ان چند ہتھیاروں کے ساتھ انہیں کچھ عرصے کے لئے مغنوم لکڑوں میں کامیاب ہونے سے روک سکتا ہوں۔ میرے

خیال میں دروازہ ٹوٹ گیا ہے میں مدافعتی کارروائیوں کا آغاز کرتا ہوں۔“

تحریر چانک ہی ختم ہوئی۔ میں نے کتاب کو بند کیا اور بستر کے کنارے پر کھدایا اس مختصر جدوجہد کے بعد اسے اپنے جسم میں چستی اور پھرتی کا فقدان محسوس ہونے لگا تھا۔ اس لئے کافی کے ساتھ ذیل روٹی کے چند ٹکڑے کھانے کے بعد وہ بستر پر بے سرح ہو کر گر گیا۔ رات کے قریب اسے ہوش آیا کمرے میں تاریکی کا راج تھا۔ سو لی کی چگاڑوں میں چرچ کارخ کر آئی تھیں سانی لیو کمرے میں نہیں تھا اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے تویر پریشان ہو گیا وہ گزشتہ رات اس وقت تک جزیرے پر آ گیا تھا۔

تویر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چگاڑوں نما انسان خول کی صورت میں چرچ کی طرف رخ کر رہے تھے۔ وہ ان کی مخالف طرف سے نکلتے ہوئے ساحل سمندر پر آگیا سمندر سناں پڑا تھا۔ لہروں میں طوفان کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ ہواؤں کی شدت میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا ایسے عالم میں سمندر میں پوشیدہ چٹانیں خونی ہتھیار کا کام کرتی تھیں یقیناً سانی لیو ایسے ہی حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی موت تویر کی موت کے مترادف تھی جزیرے والوں کو اگر خون و متباب نہ ہوتا تو وہ تویر کے خون کے پیاسے ہو سکتے تھے لیکن جزیرے سے اسیر کے بغیر فرار ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرتے رہنے کے بعد تویر اپس اپنے رہائشی کمرے میں چلا آیا چرچ کی عمارت کے پاس واقع میدان میں سو لی کے رہائشیوں کا ہجوم جمع تھا۔ ان کے تویر خطرناک تھے میدان کا ماحول غیر انسانی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

تویر کو اپنے رگ دپے میں خوف کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تاہم انہوں نے تویر نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور تویر کی کترا کراہنے کمرے میں آگیا۔ اس نے بستر پر پڑے ہوئے موبائل کو اٹھایا اور اس کی نارنج کورڈن کر دیا جار جنگ کم ہونے کی بدولت روشنی میں شدت نہیں تھی لیکن کسی نہ کسی حد تک وہ



تویر کے کم آ سکتا تھا۔ اس نے مکمل اوڑھا اور بستر پر لیٹ گیا بارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی وہ لپک کر بستر سے نیچا اترتا۔

سانی کیو واپس آ گیا تھا۔ لیکن دروازے کے قریب پہنچنے پر اسے غیر انسانی آوازوں کی چڑچاہٹ سنائی دی۔ وہ جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا کمرے کے باہر سویلی کے رہائشی جمع ہو رہے تھے۔ تویر بوکھلاہٹ کے عالم میں کمرے میں کھڑکی کی طرف آ گیا اس نے با آہستگی کھڑکی کے پٹ کو کھولا اور باہر جھانکا۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیا تاہم متعدد انسانی سایوں کو اس نے کمرے کے گرد گھومتے ہوئے پایا۔ اس نے گہرا کھڑکی کو بند کر کے چٹنی اوپر چڑھا دی۔ اور بستر پر پڑے ہوئے موبائل کو اٹھا کر ٹارچ روشن کر دی۔ پھر مکمل سر تک اوڑھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

دروازے کو اب دھکے دینے جانے لگے تھے چگاڈوں کے غیر انسانی وجود جب دروازے کے ساتھ ٹکراتے جب دروازے کی چوبیس بل کر رہ جاتیں تویر کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ دروازہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ پائے گا۔ وہ سوچنے لگا تہہ خانے میں رہی ہوئی کتاب میں اور کیا حلقہ نقلی تدبیر لکھی گئی تھی۔ جس پر عمل کر کے وقتی طور پر ہی کئی چگاڈوں کے خطرناک ارادوں سے بچا جاسکتا تھا۔

سورج کی روشنی رات کے وقت مفقود تھی شیشے کی چمک اور شہر بھی کمرے میں نہیں تھی پانی کی بوچھاڑ والی تدبیر قابل عمل تھی اس کی سوچوں کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا دور کہیں تزارخ کی آواز کے ساتھ بجلی گری اس کے ساتھ ہی طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا کمرے سے باہر دروازے کو دھکا مارتے ہوئے غیر انسانی وجودوں میں کھلبلی مچی اور دروازے کو دھکا مارنے کے سلسلے میں کمی واقع ہونے لگی۔ پھر خاموشی عاری ہو گئی۔ تویر نے طویل سانس لیتے ہوئے مکمل کو ایک طرف پھینکا اور بستر سے اتر کر کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ اس نے کھڑکی کو کھولنے کے بعد باہر جھانکا۔

طوفانی ہواؤں نے کھڑکی کے راستے کمرے میں گھسنے کی کوشش کی سردی کی بدولت اسے اپنے جسم میں پھری رہی اٹھتی محسوس ہوئی غیر انسانی سایوں کا مجموعہ اپنے کمروں کا رخ کر رہا تھا پانی کی بوچھاڑ نے تویر کے چہرے کو بھگو دیا اس نے کھڑکی کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا اور بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا سانی کیو کی بے وقوفی کی وجہ سے وہ سویلی میں پھنس کر رہ گیا تھا اگر وہ واپس نہیں آتا تو بارش رکنے کے بعد تویر کو سویلی جزیرے والوں کی خوراک بننے سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا تھا۔ جزیرے سے فرار ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بہترین حیراک تھا اور سمندر میں حیراکر بھی آبادی تک با آسانی رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن تیاری نے اس کے جسم کو نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ زیادہ مشقت و جدوجہد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا رات کے کسی پہر اس کی آنکھ لگ گئی وہ کھری نیند سو گیا۔

دروازے پر ہلکی دستک نے اسے بیدار کیا تویر ہڑبڑا کر بستر سے نیچے اتر آیا بارش اب بھی طوفانی انداز میں برس رہی تھی ایسے حالات میں چگاڈوں کا گھروں سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا یقیناً سانی کیو واپس آ گیا تھا دستک دوبارہ ہوئی اس کے بعد رینی کی متوجش آواز سنائی دی۔

”تویر دروازہ کھولو..... جلدی کرو..... میں مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی ہوں۔“ تویر نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹنی گرا دی۔ اور دروازہ کھول دیا وہ پانی سے شرابور سانسے کھڑی تھی دروازہ کھلتے ہی اندر چلی آئی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

”تمہارا دوست انہیں وعدے کے مطابق انسانی لاش مہیا نہیں کر سکا۔ سویلی کی چگاڈاؤں بہت مشتعل ہیں وہ تمہارے خون کی پیاسی تھیں لیکن بارش نے ان کے عزائم کو ٹپس نہیں کر کے رکھ دیا اپنی رہائش گاہوں کا رخ کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات میرے خون سے پیاس بجھائی جائے میں نے قبل از وقت چھپ کر ان کے ارادوں سے آگاہی حاصل کر لی

اور خاموشی کے ساتھ فرار ہو کر یہاں چلی آئی۔“ تویر ہولناکی کی مانند اس کی بات چیت سننے میں مگن تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد رینی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے بھاگ چلو..... ورنہ وہ ہم دونوں کو کبھی بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

تویر ہڑبڑا کر بولا۔ ”سانی کیو جزیرے پر نہیں آیا مجھے لگتا ہے کہ اس کا اسٹیر حادے کا شکار ہو گیا ہے اور اسٹیر کے بغیر جزیرے سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔“

رینی چند لمحے سوچنے رہنے کے بعد بولی۔ ”چگاڈوں شیشے اور پانی سے خائف ہیں روشنی ان پر زہریلی شعاعوں کی طرح اثر کرتی ہے ہمارے پاس شیشہ اور روشنی نہیں ہے لیکن سمندر کا پانی وافر مقدار میں ہے ہم اسے استعمال میں لا کر چگاڈوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

تویر نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔ ”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

رینی بولی۔ ”بات سنانے کی ہے۔ اگر ہم سمندر کی لہروں کے درمیان میں اپنی رہائش گاہ بنائیں تو وقتی طور پر چگاڈوں کے شر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ وہ پانی میں داخل ہو کر ہم تک پہنچنے سے قاصر ہوں گی۔“

تویر بولا۔ ”لیکن ان کے پر انہیں ہم تک پہنچانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق وہ اڑ کر سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“

رینی نے جواب دیا۔ ”ہماری رہائش گاہ مکمل طور پر کیونفوج ہوگی۔ اور رہائش گاہ کے پینڈے میں پانی کی وافر مقدار موجود ہونی چاہئے ہم پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔“

تویر بولا۔ ”میرے خیال میں رہائش سے مراد کشتی ہے تمہاری تدبیر قابل عمل ہے۔ جزیرے میں کشتی بنانے کا سامان دستیاب ہے چرچ کی تلاش کے دوران میں نے وہاں پر ضرورت کی تمام اشیاء کو وافر مقدار میں موجود پایا تھا اگر ہم ابھی سے کام کا آغاز کریں تو دو تین دنوں کے دوران ایسی کشتی بنا سکتے ہیں جس کی چھت

کپسول کی مانند بند ہو۔“

رینی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب تین دنوں تک چگاڈوں کی طرف سے یلغار نہ ہو۔ بارش کے رکنے ہی وہ مسئلہ کا آغاز کر دیں گی۔“

تویر بولا۔ ”چرچ کی چھت پر میں نے پانی کی وسیع ٹینکی دیکھی تھی۔ ہم آج کی رات اسے پانی سے بھر دیں گے تاکہ حسب ضرورت اسے استعمال کر کے چگاڈوں سے بچا جاسکے۔“ رینی نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں کمرے سے باہر نکلنے کے بعد چرچ کی طرف چل دیئے۔ بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ سردی کی شدت میں کافی حد تک اضافہ ہو گیا تھا لیکن انہیں کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

سویلی جزیرہ سنسان پڑا تھا۔ چرچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل ہو گئے ہال کمرے میں آتش دان کے پاس لکڑیوں کا ڈھیر پڑا تھا تویر نے لائٹ کی مدد سے آتش دان کو روشن کیا اور جسم کو کسی حد تک گرم کرنے کے بعد دونوں نے پلاسٹک کی بالٹیاں اٹھائیں اور سمندر کے پانی کو ٹینکی میں بھرنے کا آغاز کر دیا۔ یہ ایک مزید چارہ تکلیف دے کام تھا لیکن ان دونوں کے پاس مزید چارہ کا ذخیرہ تھا تویر کے جسم میں طاقت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن گرتے پڑتے آخر کار ان دونوں نے وسیع و عریض ٹینکی کو آدھے سے زیادہ بھر لیا لیکن بارش میں بھینکنے کی وجہ سے صبح کے قریب تویر کو بخار نے آ گھیرا۔ جزیرے پر بیماری کے افات کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ دھکتے ہوئے آتش دان کے قریب ادھوا ہو کر لیٹ گیا رینی اس کے سر ہانے بیٹھ کر اس کا سر دبائے لگی اس کے لبوں پر بارش نذر کرنے کی دعا تھی صبح سات بجے کے قریب بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

سمندر کی طوفانی موجوں نے جزیرے کو گھیرے میں لینے کے بعد تباہ کاریوں کا آغاز کر دیا سویلی کی گلیوں اور میدانوں میں پانی بھرنے لگا وہ پہرے کے ڈبڑھ بچے کے قریب تویر کو کافور محسوس ہوا اور بخار کی شدت میں کمی واقع

ہونے لگی۔ تاہم جسم میں کمزوری بہت تھی۔ ربی کی اپنی طبیعت ناساز تھی تمام رات بارش میں بیٹھنے کی وجہ سے اسے جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن صحت مند جسم کی وجہ سے مشقت طلب کام کرنے کے باوجود بھی کسی حد تک تازہ دم تھی۔ تنویر کے بیدار ہونے کے بعد اس نے طوفانی بارش کے درمیان دوبارہ رہائشی کمرے کا رخ کیا۔ اور کھانے پینے کا تام سامان چرچ کی عمارت میں منتقل کر دیا اس سامان میں سوکھے گوشت کی کثرت تھی دونوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دوبارہ کشتی بنانے کا آغاز کرنے سے قبل تنویر نے ہاتھ روم میں لگے ہوئے شاور کو باہر نکال کر اسے چرچ کے دروازے کے اوپر نصب کرنے کے بعد اسے پانی کے کنکشن سے منسلک کر دیا قدرت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

آسمان سے پانی چھاجوں برس رہا تھا اور سوبلی کا جزیرہ پانی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ چرچ کی عمارت اونچی جگہ پر قائم ہونے کی وجہ سے پانی کے ریلے سے محفوظ تھی تاہم سوبلی کے رہائشی مکان نیچے بنے ہوئے کی وجہ سے پانی میں ڈوبنے لگے تھے یہ پانی چگاڑوں کے لئے مہلک تھا لیکن ربی کے کہنے کے مطابق چونکہ چگاڑوں مکان کی چھتوں کے ساتھ اتنی لگی ہوئی تھیں اس لئے جب تک سمندر کا پانی مکان میں لمبا بھر جاتا اس وقت سے پہلے چگاڑوں کا کچھ بھی نہیں لگاؤ سکتا تھا کشتی بحالی مراحل میں بھی کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا چرچ میں تابوت بنانے کے لئے متعدد تختے بڑے تھے۔ تاہم کشتی کی چھت بنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

شام تک کچھ بھی کھائے بچے بغیر وہ دونوں کام میں مگن رہے اس دوران مختصر وقت کے لئے بارش کی شدت میں کمی واقع ہوئی پھر دوبارہ سلسلے کا آغاز ہو گیا ربی وقتاً فوقتاً چرچ سے باہر نکل کر حالات کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے کر آتی رہی تھی۔ سمندر کا پانی مکانات میں کافی حد تک بھر گیا تھا اور مختصر مقدار نے اب چرچ کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا ربی نے دروازے کو ابھی طرح بند کرنے کے بعد دروازے کے خلاء میں

کپڑے غولس دیئے لیکن پانی کی روانی میں کمی واقع نہ ہو سکی۔ رات کو تنویر کو دوبارہ بخار چڑھ گیا اس نے بے دلی کے ساتھ کھانا کھایا اور چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد دوبارہ کام میں جت گیا۔

صبح کے قریب کشتی کا آدھا ڈھانچا تیار ہو گیا اسے مکمل کرنے کے لئے تنویر کو میرا ایک دن درکار تھا جس دس بجے کے قریب بارش اچانک ہی رک گئی اور بادلوں سے سورج کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ صوب کی تمازت میں زیادہ حدت نہیں تھی لیکن چمکدار ضرور تھی اگر بارش کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہوتا تو تنویر اور ربی کو سورج غروب ہونے سے قبل کشتی کو تیار کر کے سمندر میں اتارنا تھا بصورت دیگر انہیں آج کی رات چگاڑوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

دونوں تندہی کے ساتھ کام میں جت گئے اب انہیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ ناساز طبیعت کی وجہ سے تنویر کے رویے میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا تھا وہ بات بے بات ربی کو محرک رہا تھا ربی کو اس کی کیفیت کا احساس تھا اس لئے خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر نہایت عمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام میں مصروف تھی۔

دوپہر تک کشتی کا بخلا تمام حصہ مکمل ہو گیا اب صرف اس کے اوپری حصے کو کتوں کی مدد سے بند کر کے مکمل کرنا باقی رہ گیا تھا تنویر کو شدت کے ساتھ بھوک کا احساس ہو رہا تھا اس نے صبح سے ناشتے کے بعد کچھ بھی نہیں کھایا تھا ربی نے چند گوشت کے ٹکڑے آگ پر بھون کر آلو کے تکتوں کے ساتھ اس کے سامنے رکھ دیئے تنویر نے بے صبری کے ساتھ ان پر ہاتھ صاف کیا اسے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی لیکن کھڑے ہوتے ہی چکر آ گیا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر گیا ربی نے پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر قریب پڑی ہوئی ہائٹی سے پانی نکال کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے لیکن تنویر کی بے ہوشی میں فرق نہیں پڑا۔

پھر ربی نے ہر طرح کے جتن کر لئے لیکن تنویر کو ہوش نہیں آیا۔ رات سر پر آگئی۔ اور چگاڑوں کے نکلنے کا وقت قریب آ گیا۔ اگر تنویر ہوش میں نہ آتا

تو اسے آج کی رات چگاڑوں سے اکیلے مقابلہ کرنا تھا۔ وہ ایسا بخونہ کی کشتی تھی پانی کا شاور چرچ کے ماتھے پر نصب تھا۔ صرف وال کھولنے کی دیر تھی چرچ کے دروازے پر مصنوعی بارش کا آغاز ہو جاتا تھا۔

رات ہونے سے قبل ربی نے چرچ کے داخلی دروازے کو ابھی طرح بند کر کے کنڈی لگا دی چھت کا دروازہ پہلے سے ہی بند تھا۔ وال کھول کر اس نے پانی کے اخراج کا جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر کنڈی کے بیچ پر بیٹھ کر چگاڑوں کا انتظار کرنے لگی۔ وقت نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ چرچ کی عمارت کے باہر کھمبیر خاموشی طاری تھی۔ ہال کمرے کے کھڑیاں نے آٹھ بجنے کا اعلان کیا اس وقت تک عموما چگاڑوں اپنے آشیانیوں سے باہر آ جاتی تھیں لیکن خلاف معمول آج ایسا نہیں تھا چرچ کے باہر بنے ہوئے میدان میں آج الو بول رہے تھے نوجبے تنویر کے جسم میں نحیف حرکت پیدا ہوئی اور اس نے چند لمحے کسمانے کے بعد آنکھیں کھول دیں کچھ دیر لا شعوری کے عالم میں ربی کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا۔ اس کا دماغ کچھ اٹھنے کی زردی کی طرح کل رہا تھا آنکھوں کے آگے اندھیرا طاری ہونے لگا تھا۔ وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔ ربی نے اس کی خبریت دریافت کی۔

تنویر پوچھ لہجے میں بولا۔ ”میری طبیعت بہت خراب ہے۔ کشتی کو مکمل کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں ہے میرے خیال میں آج کی رات چرچ میں بسر کرنے کے بعد کل صبح یہاں سے قریبی آبادی کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

ربی بولی۔ ”وہ آج چرچ والے میدان میں نہیں آئے۔ اگر رات کو فرار ہونے کی کوشش کریں تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوگا۔“ تنویر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں کشتی کا اوپری حصہ کھلا ہوا ہے۔ اگر انہوں

نے رات کے وقت حملہ کیا۔ تو ہمارے پاس چھپنے کی جگہ نہیں ہوگی۔ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ چرچ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ربی اور تنویر نے ہڑ بڑا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ربی بولی۔

”مجھے سوبلی والوں سے تغیر و احترام کی توقع نہیں ہے وہ دروازے پر دستک دینے کے بجائے اسے توڑنے کو مناسب خیال کرتے ہیں یہ ضرور سوبلی سے باہر کا کوئی بھٹکا ہوا مسافر ہو سکتا ہے۔“

تنویر نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ”بھلا کون.....؟“ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”ہاں یقیناً گزشتہ رات کے طوفان کے بعد کوئی بھٹکا ہوا مسافر سوبلی کی طرف آ سکتا ہے تم دروازے کے پاس جا کر دریافت کرو۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس دفعہ شدت زیادہ تھی۔ ربی اٹھ کر دروازے کے پاس چلی آئی۔ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”باہر کون ہے.....؟“ جواب میں خاموشی طاری رہی۔ پھر دوبارہ دستک ہوئی۔ ربی حیرتوں لہجے میں با آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اپنی شخصیت اور آمد کے متعلق نہیں بتاؤ گے تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ جواب میں پھر دستک ہوئی پھر کسی کے ہانپنے کی آواز سنائی دی لیکن جواب اس دفعہ بھی موصول نہیں ہوا۔ ربی تنویر کے پاس آگئی۔ اور پریشان لہجے میں بولی۔

”وہ جواب نہیں دے رہا۔“ حالات کی تضحکی کو مد نظر رکھتے ہوئے بغیر جانکاری کے دروازہ کھولنا سراسر بے وقوفی کے زمرے میں آ سکتا ہے میرے خیال میں صبح تک انتظار کر لیتا چاہئے۔

تنویر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ کہ ایک دفعہ پھر دستک ہوئی اس کے فوراً بعد کی آدی کی ٹھٹھا آواز سنائی دی۔ تنویر اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سائی لیو کی آواز تھی۔ اور تنویر کو دروازہ کھولنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ تنویر نے ہڑ بڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔



## خونی درندہ

الرجع عباس - بستی قتلے والی

جرم و سزا کی ایک انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی اور پڑھنے والا خود کو ایک انجان حیرتناک اور خوفناک دنیا میں محسوس کرے گا، حقیقت کا پردہ چاک کرتی انوکھی کہانی

جسم و جان پر سکتہ طاری کرتی عجیب و غریب دل دہلائی اور اچنبھے میں ڈالتی کہانی

میں کسی کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی گیا تھا۔ واپسی پر چابی خاصی دیر ہو گئی آکر کوئی جان پہچان والا ہوتا تو شاید رات وہی گزار دیتا لیکن خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں واپسی پر نکلا بادل اکٹھے ہو کر برسے کا ارادہ بنا رہے تھے۔ راتیں بھی اچھی خاصی اندھیری تھی۔ ابھی 5 سے 6 کلومیٹر ہی سفر کیا ہو گیا۔ ہوا شروع ہو گئی جو آہستہ آہستہ طوفان کی شکل اختیار کرنے لگی۔ اور میری پریشانی

لیکن پھر سر کو تھام کر رہ گیا۔  
رہی نے دریافت کیا۔ ”کون ہے؟ کیا تمہارا کیا کوئی جاننے والا ہے۔“

تویر نے جواب دیا۔ ”میرا ساقی لیو ہے۔ وہ جزیرے پر واپس آ گیا ہے۔ تم دروازہ کھول دو۔“ رہی آٹھ کو دروازے کی طرف چل دی۔ اس نے کڑی گرمائی اور دروازے کو کھول دیا ساقی لیو نے نہایت خستہ حالت میں سامنے کھڑا تھا اس کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ اور جسم کمزوری کی بدولت بیچ کے عالم میں کانپ رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر آ گیا اور تویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”جناب مجھے معاف کر دیجیے گا۔ لیکن راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے میں کل رات سوئی نہ آ سکا آج تمام دن طوفانی لہروں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب میں نے جزیرے پر قدم رکھا تو چرچ میں آنے کے بجائے سیدھا زومیری بیم کے مکان کی طرف چلا گیا۔ میں نے اسے ملگرفتنہ حالات سے آگاہ کیا اور اس کا انتظام نہ کرنے پر پیشانی کا اظہار کیا۔ تمام چکا ڈیز گزشتہ دن سے ہوئی ہونے کی وجہ سے نہایت مشکل میں لاش کو نہ پا کر وہ سب آپ سے باہر ہو گئیں لیکن زومیری بیم نے انہیں قابو کیا۔ اور میرے جسم کے ساتھ لیٹ گئی اس نے مجھے اپنے آپ سے اس وقت تک علیحدہ نہیں کیا جب تک خون سے اس کی پیاس نہ بجھ گئی۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”اگر کل لاش کا بندوبست نہ ہوا۔ تو کچھ ایسا ہی دوسرے دن بھی ہوگا۔ وہاں سے جان خلاصی کے بعد میں گرتا پڑتا آپ کے پاس چلا آیا میری آپ سے درخواست ہے کہ میرے کام کا بیڑہ اب آپ کو سنبھالنا ہوگا اسٹیئر سائل پر نگر انداز ہے۔ کل صبح آپ کو دینا آؤ لینڈ کے راستے کے متعلق تفصیل کے ساتھ آگاہ کروں گا۔

انہیں ہر روز ایک لاش دستیاب ہے ورنہ جو حال میرا ہوا ہے وہی کل آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔“  
تویر نے تھابت بھرے لہجے میں جواب دیا۔





تھوڑی دور آبادی کے آثار نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ لیکن قریب پہنچ کر ایسا محسوس ہوا۔ شاید یہ گاؤں صدیوں سے یوں ہی سنان پڑا ہے یہاں سے کوئی انسان گزر کر بھی نہ گیا ہو۔ لیکن کچھ مکان ابھی بھی اپنی اصلی حالت میں تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرے حواس اٹھ گئے مجھے یہ جذبہ چلا جب تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ بہت زیادہ سوچہ بوجھ کے بعد میں نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بار دوبارہ تین بار آخر مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا کہ اندر سے آواز آئی۔

مہربانی کر کے راکھش ہمیں بخش دو، ہماری جان چھوڑ دو روتا بلکتا بزرگ پہنچ نہیں کسی کی تئیں کر رہا تھا۔ میں نے پھر دروازہ ٹوک کیا تو بزرگ آدمی کے رونے میں روانی آ گئی۔

”اللہ کی قسم راکھش چلے جاؤ۔ میرا ایک بیٹا میرے پاس رہنے دو چلے جاؤ۔ مجھے یہ راز مجھے میں دیر نہ لگی کہ اس گاؤں کے لوگ کسی بڑی مشکل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ٹانگی کی رودی میرے میں زیادہ دیر تک نہیں سکتا تھا میں نے آواز دی۔ اگلے میں ایک مسافر ہوں اور طوفانی بارش والی رات آپ کے گھر گزرنا چاہتا ہوں خدا کے نام پر یقین کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر میں رات گزارنے دیں۔ میں آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

اندسے آواز آئی۔ ”تمہارا نام کیا ہے۔“  
”میرا نام حسن عزیز ہے۔“ تقریباً دو تین منٹ کے بعد دروازہ کھولا گیا۔ میں بائیک لے کر اس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ بزرگ نے مجھے ایک علیحدہ چھوٹے سے کمرے میں رات بسر کرنے کے لئے کہا۔ میں ایسی چیز کو قیمت جانتے ہوئے اس کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ساری رات اس گاؤں کے بارے میں سوچتا رہا۔ پہنچ نہیں کب آکھ لگی اور جب آکھ گئی تو دن اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا اور پورے گاؤں میں رونق بحال تھی۔ اس رونق کو دیکھ کر یقین ہوتا کہ یہ گاؤں آباد ہے۔ تب میرے ذہن میں وہ رات والا منظر کھنسنے لگا جہاں

چاروں طرف خاموشی کا راج تھا۔ کسی بھی گھر سے روشنی نہیں نکل رہی تھی۔ لیکن زیادہ دیر میں اپنے خیالوں میں نہ رہا۔ اور اوجھل کی تیاری کرنے لگا میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور اوجھل کا راستہ ناپا اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں ان گاؤں والوں کی مدد ضرور کروں گا۔ کیونکہ اب میں جلدی میں تھا۔ اور گھر والوں کو بھی نہیں بتایا تھا سب لوگ دیکھنے میں تو خوش تھے لیکن چہرے پر غوف کے سائے برقرار تھے۔ سارے راستے میں سوچتا آیا جب گھر پہنچا تو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”کہاں گئے تھے اور رات کہاں بسر کی۔“ تو میں نے سارا واقعہ گھر والوں کی گوش گزار کر دیا۔ جس کو کون کرسب پریشان ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ میرا دوست اعتراف عرف بیج میری اس کام میں مدد کر سکتا ہے جب میں نے یہ بات سنا تو کوئی تودہ میرے ساتھ اس گاؤں والوں کی مدد کرنے پر رضامند ہو گیا اور پھر ہم نے گھر والوں سے اجازت لی اور ایک نیک مشن پروانہ ہو گئے۔

آج جتنی خوشی مجھے ہو رہی تھی شاید زندگی میں اتنی بڑی خوشی نہ ملی ہو۔ تقریباً عصر کے باہم اس گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہ بزرگ بڑی خوش دلی سے ہمیں ملیں اور ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ اور پہلے والے واقعہ پر اچھا خاصا شرمندہ ہوئے لیکن میں نے کہا۔

”اگلے کوئی بات نہیں آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم دونوں دوست آپ لوگوں کی مدد کے لئے آئے ہیں۔“  
بزرگ بولے۔ ”بیٹا ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔“  
”اگلے آپ کا نام کیا ہے۔“

”بیٹا میرا نام اسحاق ہے اور میرے بیٹے کا نام محمد فیضان احمد فیاضی ہے۔“

”بابا میرا نام حسن عزیز ہے اور یہ میرے دوست ہیں اس کا نام اعتراف عرف بیج ہے۔ اگلے میں وہ لڑکا ہوں جو طوفانی بارش میں آپ کے گھر رات گزارنے آیا تھا۔ تب میں آپ لوگوں کے حالات دیکھ کر گیا تھا تو میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا تو میرے دوست نے کہا کہ ہم آپ لوگوں

کی مدد کریں گے سو ہم دونوں آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔“  
یہ سنتے ہی باباجی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔  
”بیٹا جہاں پورے کا پورا گاؤں ہار گیا ہے وہاں تم دونوں کیا کرلو گے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ جو بیج ہو جیت اس کی ہوتی ہے۔ سو دن چور کا ایک دن سا دکھ ہوتا ہے۔“  
”جو بات ہمت بہادری سے لڑی جائے جیت اسی کی ہوتی ہے۔“

”ہمیں اس پاک کتاب پر پورا یقین ہے جس کی بدولت ہم ہاری ہوئی بازی بھی جیت سکتے ہیں۔“

باباجی جلدی سے اٹھے باہر کا دروازہ بند کر کے اچھی طرح چیک کیا اور پھر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ آنکھوں سے آنسو صاف کر کے اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

”بیٹا میں توبہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات آپ دونوں کو اس نیک کام میں کامیابی عطا کرے اور تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔“ اور ہم دونوں نے کھل دل سے (آمین) کہا۔

”بیٹا یہ کوئی آج سے 5 سال قبل کی بات ہے کہ ہمارے اس ہتے نکیتے گاؤں کو کسی کی بد نظر گئی 11 ستمبر کی رات میں ایک انہونی آئی جس میں ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی اغوا ہوئی جس پر گاؤں والوں نے مختلف قسم کی باتیں کیں۔ جس کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کی ماں اس دنیا سے چل بسی۔ تیسرے روز اس لڑکی کی لاش آبادی سے تھوڑی دور پہاڑیوں سے ملی۔ جس کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ زیادتی کے بعد جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہوا اس کا جسم لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ جس کو دیکھ کر سارے گاؤں والے رنگ رہ گئے۔ جس کو گاؤں والوں نے چپ چاپ آبائی قبرستان میں دفن دیا۔ اور پھر تیسرے دن میرا بیٹا لاپہ ہو گیا اگلے دن اس کی لاش بھی وہی سے ملی جس کی حالت اس لڑکی سے مختلف نہ تھی، جتنے منافی باتیں ہوتی رہیں۔“

”کوئی کہتا اس نے اس لڑکی کے ساتھ ظلم کیا ہوگا جس کے کارن اس لڑکی کی روح نے اس کا یہ

حال کرو یا لیکن میرا دل یہ بات ماننے سے انکاری تھا کہ میرا بیٹا ایسی حرکت نہیں کر سکتا مگر میری بات پر کسی نے یقین نہ کیا اور مجھے یوں روتا بلکتا چھوڑ کر سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ اور پھر میں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے بیٹے کو ان بد نصیب ہاتھوں سے کفن دے کر منوں مٹی تلے دیا۔“

باباجی کے رونے میں روانی آ گئی۔ ہم نے بھی باباجی کو رونے کا موقع دیا اور پھر وہی سے سلسلہ شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”پھر ایسے واقعات کا ہونا معمول بن گیا کسی کی بیٹی تو کسی کا بیٹا روز اغوا ہوتا تو اس کی لاش بری حالت میں گاؤں سے باہر پڑتی جسم سے سارا خون نچوڑنے کی وجہ سے موت ہوتی۔ اور جسم پر مختلف قسم کے نشانات پائے جاتے۔ جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ کسی درندے کے دانتوں کے نشان ہیں۔ جو جسم کے مختلف حصوں کو ادھیڑ کر سارا خون چوس جاتا ہے۔“

بیج بولا۔ ”ایک منٹ بابا۔ (تسلی بریک تے پیر رکھو) مجھے ایک بات بتھم نہیں ہوئی بلکہ کی ہر لاش سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ زیادتی کے بعد جسم سے سارا خون نچوڑا گیا ہے اور پھر جسم پر درندے کے نشان یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ کسی انسان کا کام ہے۔“ جس پر میں نے بھرپور اتفاق کیا۔

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اگلے اس درندے کو کسی نے پال رکھا ہو اور اس کی خوراک انسانی خون ہو۔ وہ درندہ خون پیتا ہو اور انسان ہر عورت کو اپنی دلی تسکین کے لئے استعمال کرتا ہو۔“

لیکن اگلے نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔  
”ختم بیٹا میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ راکھش کی طرح لمبا چوڑا تقریباً 8 فٹ اس کا قد ہوگا میں نے اسے خود اپنی بیٹی کو اغوا کر جاتے دیکھا ہے لیکن یہ بد نصیب باپ اپنی بیٹی کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ کچھ نہ کر سکا۔“ اور دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر رونے لگا۔

اور پھر ہم دونوں اٹھ کر باہر آ گئے پھر نے پلان



## خون آشام

صفر علی - فیصل آباد

خونی مخلوق کی دیدہ دلیری رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ایسا لگتا کہ موت نے ہر طرف اپنے نوکیلے پنچے گاڑ دیئے ہیں ہر طرف خوف و ہراس پھیل جاتا اور پھر.....

خوف کے افق پر چمکھڑائی ہوئی..... عجیب الخلق مخلوق کی ناقابل یقین..... کہانی

پہلے ہی دو مہینوں کی خوراک گھروں میں ذخیرہ کر لیتے کیونکہ شدید برفباری کی وجہ سے پورا گاؤں ٹھہر جاتا۔ اور پھر اس عرصے کے دروان سورج بھی نہیں نکلتا تھا۔ رات کے تقریباً بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ اچانک ہی ایک سایہ حرکت میں آیا جو برف پر چلتا ہوا فرڈ کے گھر کے آگے رکا۔ فرڈ کا گھر گاؤں کے سرے پر تھا۔ دروازہ بجایا گیا۔ فرڈ اور اس کی بیوی جاگ اٹھے۔ فرڈ دروازے

فون دلچ نامی یہ چھوٹا سا قصبہ تقریباً ستر گھروں پر مشتمل ہوگا۔ یہ قصبہ بجلی اور گیس جیسی سہولتوں سے محروم تھا۔ لیکن یہاں پر رہنے والے اس پسند لوگوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ قصبہ چاروں طرف سے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر حکومت کوئی خاص توجہ نہیں دیتی تھی۔ یہاں کے لوگ نہایت سادگی سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لوگ سردیاں شروع ہونے سے

دو منٹ میں پولیس وہاں پہنچ چکی تھی ایک آفیسر نے جب دروازہ کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ ایک درندہ نما مشین اس لڑکی کے اوپر حرکت کر رہی ہے۔ جس کے ذریعے بڑی بے دردی سے اس لڑکی کے جسم سے خون نکالا جا رہا تھا۔ جج کے ہاتھ میں جو آیا اس نے مار مار کر مشین کو توڑ ڈا مشین میں جمع شدہ خون نیچے بہنے لگا اور وہ دونوں شخص جلدی سے خون چاٹنے لگے اس منظر کو دیکھ کر مجھے تے آئی شروع ہو گئی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اتنے میں افسران دونوں آدمیوں کو اٹھڑی لگا چکا تھا اور اس مکان کے اندر سے ہزاروں بوٹیں خون کی برآمد ہوئیں اور ایسے کئی راکھشش ملے جن کو کپکپڑ کے ذریعے چلاتے تھے اور خونی مشین جن کے ذریعے خون نکالتے تھے پولیس والوں نے سب سامان اپنی گاڑی میں رکھ لیا دیکھنے والی ہر آنکھ اٹک رہی کہ اس طرح کے شیطان بھی اس دنیا میں ہیں جو کہ دوسرے انسانوں کا خون چوستے ہیں۔ اتنے میں گاؤں والوں نے امتزاز عرف جج اور محسن عزیز کو کندھوں پر اٹھالیا اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میڈیا بھی پہنچ گئی سریہ گینگ کس نے پکڑ والی۔

افسر نے میرے اور جج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کو جواؤں نے۔“ اور ہمیں اس بات پر خوشی تھی کہ ہم نے انسانیت کے دشمن کو ان کے انجام تک پہنچایا۔ اگلے دن اخبار ٹیلی ویژن پر ہم دونوں کے چرچے عام تھے۔ میں جج کے گلے ملے ہوئے بولا۔

”یارتھ جیسے بہادر انسان کی ہمارے ملک کو ضرورت ہے جج کوئی امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھنے والا نہیں تھا بلکہ ایک بستی تھے والی سے تعلق رکھنے والا اور لاہور فیکٹری میں کام کرنے والا بہادر لڑکا ہے۔ اور محسن عزیز کو کھانا کلاں سے تعلق رکھنے والا بہادر لڑکا ہے ان دونوں کی زبانی یہ واقع میں نے آپ سب کے گوش گزار کر دیا اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین)



بنایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے ہم دونوں پھر پورے پلان کے ساتھ رات دن بچے گاؤں سے باہر ایک اونچے درخت پر چڑھ گئے اور ایک جگہ بہت زیادہ ٹہنیاں اکٹھی کی ہوئی تھی اس کے اوپر گھاس وغیرہ ڈال کر بٹھ گئے جس کے اوپر کھڑا ہونے سے پورے گاؤں کا نظر آتا تھا۔ جو کہ اتنا بڑا نہ تھا پیٹھے پیٹھے ہم تھکنے لگے تقریباً صبح کی آذان کا غام غم قریب تھا کہ ایک طرف سے شور مچا دیا جب ہم نے سرچ لائٹ ماری آگے والا منظر دیکھ کر جج کے ہاتھ سے ٹارچ گرتے گرتے بچی۔ سامنے کی طرف ایک گلی تھی جس کے اندر یہ واقع پیش آیا تقریباً دس فٹ لمبا، ناخن اس کے لمبے لمبے اور منہ سے آگ برسی رہی تھی دیکھنے والا اسے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا اور پھر وہ راکھشش اسے اٹھا کر کندھوں پر ڈالتا اور چلتا بنا جب وہ ہمارے قریب سے گزرا۔ ممکن تھا اگر وہ ہاتھ اوپر کرتا تو ہم دونوں کو پکڑ لیتا جب وہ درخت کے نیچے سے گزر گیا تو جب ہم دونوں بھی اترے اور اس راکھشش کے تعاقب میں نکل پڑے میں سارے راستے جج کو بھگتا گیا۔

”یاد آ رہتا ہے چڑھنے والا ہے کہیں اس کو ہماری موجودگی کا پتہ نہ چل جائے۔“ جج نصے سے بولا۔

(پارسل مسال تا اسکے توران ڈانیاں اتوں تو) میں نے جلدی سے جج کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور وہ خاموش ہو گیا تھوڑی آگے جا کر وہ یکدم گھر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ بہت زیادہ تلاش کرنے کے باوجود بھی نہ ملا۔ ہمیں اپنی ذرا سی لاپرواہی پر سخت طیش آیا۔

ابھی ہم واپس جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ ہمیں کسی کے چلانے کی آواز سنائی دی جس کے ساتھ ہنسنے کی بھی۔ ہمارا شک بالکل جج ہوتا دکھائی دیا اور پھر میں اور جج اس کے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ دو آدمی تھے جو اس لڑکی پر جادی ہونے کی کوشش کر رہے تھے ہمارے دو منٹ اور رتنا کسی بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

جج جلدی سے بولا۔ ”محسن تم پولیس کو فون کرو کیونکہ چوکی نزدیک ہے میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کے پاس گیا اور پوچھا ”کون ہے؟“

”باہر سے آواز آئی۔“ میں سیک ہوں باہر آؤ۔“

”میک!“ فرڈ اور اس کی بیوی دونوں حیران ہو گئے کیونکہ میک پچھلے ایک مہینے سے لاپتہ تھا۔ اس کے بیوی اور بچے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ گاؤں میں پولیس تو تھی نہیں اس لئے گاؤں والوں نے بھی ان کی مدد کی مگر نتیجہ صفر رہا۔

دروازہ پھر بجایا گیا۔ فرڈ جلدی سے لوٹک کوٹ پہن کر باہر نکل گیا اور اس کی بیوی واپس کمرے میں چلی گئی۔

جب صبح ہوئی تو اپنے ہر مینڈ کو بستر پر ناپا کر وہ پریشان ہو گئی اور پورا گھر چھان مارا جب فرڈ نہ ملا تو اس نے ہسپتالوں سے مدد مانگی پھر کیا تھا بات پورے گاؤں میں پھیل گئی اور سب اسے تلاش کرنے لگے۔

گاؤں کا سردار جو کہ چالیس کے قریب کا شخص تھا۔ جس کا نام مارٹن تھا۔ مارٹن نے فرڈ کی بیوی سے رات کا احوال سنا تو پریشان ہو گیا مارٹن نے فرڈ کی بیوی کو خاموش رہنے کا کہا اور اس بات کا ذکر صرف پاسٹر جوزف سے کیا۔

اس قصبے میں صرف ایک ہی چرچ تھا اور ایک ہی پاسٹر تھا۔ جو بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ پاسٹر بھی مارٹن کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ فرڈ کو بہت تلاش کیا گیا اس پاس کے جنگلات بھی دیکھے گئے مگر وہ نہ ملا۔

رات کو ہونے والی برفباری نے عیروں کے نشان بھی مٹا دیے۔

شام ہو گئی تو سردار نے کہا۔ ”اب اپنے اپنے گھروں کو جایا جائے۔ کل فرڈ کو جنگل کے اندر جا کر تلاش کیا جائے گا۔“

صبح کا اجالا پھیلا تو ایک اور بری خبر سامنے تھی کہ رات کو ڈس آفس میں غائب ہو گیا ہے۔ اس کے گھر میں صرف ڈس اور اس کا بیٹا رہتا تھا بتول اس کے بیٹے کے رات کو فرڈ نے اس کے باپ کو گھر سے باہر بلا یا تھا۔ جسے خود اس کے بیٹے نے موم بتی کی روشنی میں دیکھا تھا

اور اسے کوئی مغالطہ نہیں تھا۔

اب بات پورے گاؤں میں پھیل گئی اور انہوں نے دو لوگوں کی تلاش شروع کر دی جنگل بے حد گھنا تھا، اس لیے جنگل میں نیم تاریکی کا راج تھا۔ سب لوگ دس دس کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر جنگل کی مختلف سمتوں کو چل دیے۔

آخر ایک ٹولی کو جنگل کے بچ و بچ فرڈ کی لاش مل گئی۔ جس کا سر اس کے تن سے جدا تھا سب لوگ واپس آ گئے لاش نے کمر اور سردار اور پاسٹر کے پاس پہنچ گئے۔ پاسٹر نے جب لاش کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اور لوگوں کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اگر فرڈ مر چکا ہے تو کیا ڈاکس بھی مگر اس کی لاش تو کہیں نہیں ملی۔

سردار نے پاسٹر کی پریشانی بھانپ لی اور ان سے پریشانی کا سبب پوچھنے لگا۔ پاسٹر نے سب لوگوں کی نظروں سے بچ کر سردار کی توجہ فرڈ کے دھڑکی رگوں کی طرف کرواتا جس پر ایک قطرہ بھی خون موجود نہ تھا۔ سردار کی آنکھیں پھیل گئی مگر اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ”لگتا ہے اس پر شیر نے حملہ کیا ہے۔“ سب لوگ سردار کی بات سے مطمئن ہو گئے اور گھروں کو چلے گئے۔

لاش کو کل دفنا یا جاتا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد سردار نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو پاسٹر نے اشیات میں سر ہلایا۔ سردار کا خیال تھا کہ فرڈ کسی خون آشام کا شکار ہوا ہے۔ پاسٹر نے کہا۔ ”ابھی حالت ہو جائے گا۔“ پاسٹر چرچ سے اپنے کمرے میں گیا جو کہ چرچ میں ہی تھا۔ جب واپس آیا تو پاسٹر کے ہاتھ میں تھوڑی اور ایک ککڑی کی صلیب تھی۔ پاسٹر نے صلیب فرڈ کے دل کے مقام پر رکھی اور تھوڑی سی ضرب سے اس کے دل میں اتار دی۔

فرڈ کے مردہ جسم نے جھر جھری لی اور ساکت ہو گیا۔ سردار کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں چھا گئی۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر لاش کو صندوق میں بند کیا۔ اور صبح دفنا دیا گیا۔

اگلے صبح ایک اور شخص غائب تھا۔ اسے دو دن

تک لگا تاڑ ڈھونڈا گیا مگر وہ نہ ملا۔ یہ شخص گھر میں اکیلا رہتا تھا اس کا کوئی نہ تھا ایک بیوی تھی جو تین سال قبل انتقال پا چکی تھی۔

ادھر سردار پاسٹر سے ملا اور دونوں نے فیصلہ کر کے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو خون آشام والی بات بتا دی گئی۔ پھر کیا تھا سب گاؤں والوں کو سانپ سوکھ گیا۔ سردار نے کہا۔

”ابھی ان کی تعداد کم ہے صرف تین، ہمیں انہیں ڈھونڈ کر ختم کرنا چاہیے۔ لوگ ایسا کریں گے اپنے گھروں سے رات کے وقت نکلنے سے گریز کریں اگر بہت مجبوری کے ساتھ تنکا بھی پڑے تو ساتھ دو تین فرد ہونے چاہیے اس کے علاوہ آپ سب کو ایسی سیٹیاں دی جائیں گی جن کی آواز خاصی بلند ہوگی۔ یہ سیٹی ایئر چنسی ہوگی اور اس کے علاوہ اپنے پاس حفاظت کے لئے کوئی ہتھیار رکھا جائے۔“

یہاں کے لوگ دیے بھی روجوں کو بہت مانتے تھے اب تو شام ہوتے ہی گاؤں میں ہولناک سناٹا چھا جاتا گویا لوگ اپنی آواز نکالنے سے بھی ڈرنے لگے ہوں۔ پھر رات لوگوں کے دروازے بجائے جانے لگے۔ ساری ساری رات سیٹیاں بجتے لگیں۔ یوں اس گاؤں کی راتیں بھی حرام ہو گئیں۔ صرف چرچ کا دروازہ نہ بجایا جاتا۔

ایک بار پھر سب لوگ جمع ہو گئے اور سردار سے اس مسئلے کا حل پوچھنے لگے۔ اس بار پاسٹر نے تجویز پیش کی کہ گاؤں کے نوجوان ٹولیاں بنا کر باری باری پہرہ دیں گے۔ اور اپنے پاس ہتھیار اور مشعل وغیرہ بھی رکھیں گے۔

اسی رات نوجوان پہرہ دینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے انہوں نے رات کو ایک سایہ جنگل سے آتے دیکھا تو اس پر گولیاں چلا دیں۔ وہ سایہ چھٹا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ اس کے بعد ساری رات کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ رات نہایت پرسکون گزری۔ اور صبح ہوتے ہی ایک ٹولی جن میں پاسٹر اور سردار بھی شامل تھے خون آشاموں

## رشتے داروں کے حقوق

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب رشتے داروں کی معاشی بحالی پر زور دینے کے ساتھ کم زور اقرباء کے حقوق کی ادائیگی کی بھی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام افراد پر صدقہ کرنے کے بجائے، رشتے داروں پر خرچ کو بھی ثواب کا ذریعہ وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مفہوم:

”عام مسکین پر صدقہ سے تو ایک گنا ہی ثواب پائے گا، لیکن اگر کوئی شخص غریب رشتے دار کو صدقہ دیتا ہے تو اس کو دگنا ثواب و اجر ملے گا، ایک اجر تو صدقے کا دوسرا اصلہ کی کا۔“ (نسائی)

## وقت کو غنیمت جانو

حضرت حاجی محمد شریفؒ فرماتے ہیں: ”زندگی کا ایک ایک سانس بے بہا گو ہر ہے۔ انسان اس زندگی میں اگر ایک دفعہ بھی سبحان اللہ کہہ لے، تو جنت میں درخت لگ جاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد اگر ہزار دفعہ بھی ”سبحان اللہ“ کہتا رہے تو کوئی وجہ نہیں ملے گا۔ جنت میں درجات کی ترقی، اس دنیا میں ہی ہوتی ہے۔

دنیا دارا بعمل ہے، یہاں پر اعمال کی قیمت پڑتی ہے اور آخرت دارا لجزاء ہے، وہاں انسان کو عملوں کی جزا دی جاتی ہے۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)





## پراسرار کھانی

رضوان قیوم - راولپنڈی

پورے قبرستان میں ویرانی کا تسلط تھا اور ایک نوجوان ایک پرانی قبر میں بیٹھا چلا کاٹ رہا تھا کہ اچانک ایک کان پھاڑ دینے والی حیرت ناک اور ہیبت ناک آواز گونجی تو.....

حرم و لالچ کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش..... دل گرنتہ اور دل شکستہ کہانی

یہ مافوق الفطرت کہانی مجھے ایک ایسے ریٹائرڈ فوجی نے سنائی ہے جو کہ 1967ء میں جب مشرقی پاکستان قائم تھا وہ اس زمانہ میں محکمہ فوج میں جیسور کے مقام پر پارک آرمی کی ایک مشہور کور EME میں بحیثیت سپاہی تعینات تھا۔ اس ناقابل یقین مافوق الفطرت واقعہ کی شروعات اس نے اس طرح کی۔ میرا نام عبدالقدوس ہے اور میرا تعلق جمہور پانی جو کہ مری کے قریب علاقہ ہے وہاں سے ہے۔ GHQ راولپنڈی سے مخصوص فوجی جہاز C130 کے ذریعے 1967ء میں ڈھاکہ EME ہیڈ آفس پہنچا۔ وہاں سے آگے ہمارا جادو جیسور کر دیا گیا۔ پہلی نظر میں مجھے وہاں کی کوئی چیز پسند نہ آئی۔ وہاں کے موسم میں چپ چاپ ہٹ، پھمروں، کھٹولوں اور جوکوں کی بہتات، مشرقی پاکستان سے نئے آنے والوں کے لئے

کی تلاش میں جنگل روانہ ہوئے مگر ان کا کوئی نشان تک نہ ملا۔ تین دنوں میں پورا جنگل چھان مارا۔ اس دوران ایک ٹولہ جو رات کو پہرہ دے رہا تھا اس کا ایک آدمی ٹولے سے الگ ہو گیا اور پھر وہ بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔

اب ان کی تعداد میں ایک اضافہ اور ہو گیا تھا۔ پھر تو جیسے ہر طرف موت نے اپنے بچے کا ڈوبے۔ اس بار پاسٹر نے کہا کہ ”ایسی جگہ خون آشاموں کو تلاش کرنا چاہیے جہاں کوئی نہ آتا چاہتا ہو۔“

تب سردار نے کہا۔ ”ایسی جگہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے پرانا قبرستان جسے آبادی بڑھنے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا۔ اس قبرستان میں ایک چرچ بھی تھا جو کہ اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔“

سردار نے دس بارہ لوگوں کو لیا جنہوں نے ہاتھ میں ہتھوڑی اور نوک دار لکڑی کی صلیب پکڑ رکھی تھی۔ جب یہ لوگ قبرستان پہنچے تو قبریں نہایت بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ یہ لوگ چرچ کی طرف بڑھے ماحول میں عجیب سی وحشت برپا تھی۔

چرچ کے پاس پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چرچ کی ایک دیوار گر چکی ہے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ پاسٹر سب سے آگے تھا۔ پاسٹر تہہ خانے کی طرف بڑھنے لگا اور میز جیسوں سے نیچے اترنے لگا کہ چاک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے جا گرا۔ پاسٹر کو اپنی گردن پر چھین کا احساس ہوا لیکن پاسٹر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بائبل پڑھنا شروع کر دی۔

سانے چاروں خون آشام کاٹوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگے۔ پھر اچانک خون آشاموں نے ان پر حملہ کر دیا جس سے پچھلے لوگ اوپر کی طرف بھاگے مگر پاسٹر نے پھرتی کے ساتھ ہتھوڑی پھینک کر تہہ خانے کی کھڑکی کا کاچ توڑ دیا۔ خوش قسمتی سے اس دن سورج نکلا تھا جس سے دھوپ اندر آنے لگی۔

دھوپ کا اندر آنا تھا کہ خون آشام چیخنے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے اور کوئے میں جا گرے۔ پاسٹر نے



اکتاہٹ بے چینی کا باعث بنتی تھی۔ جس فوجی بیرک میں ہماری رہائش تھی، وہاں پچانوے فیصد فوجی مقامی بنگالیوں کی تھی۔ مجھے ان کے حلیہ اور لباس سے کوفت ہوتی تھی۔ ان کی تنگ نظری کی وجہ سے ہم چند مغربی پاکستان کے فوجی اہلکاروں نے اپنا علیحدہ گروپ بنایا ہوا تھا۔ نیز ہم مغربی پاکستان والوں کی تعداد بہ مشکل 8،7 ساتھیوں پر مشتمل تھی۔

اگرچہ اس بیرک میں میری تمام ساتھیوں سے علیک علیق تھی لیکن وحید قریشی نامی سپاہی جس کا تعلق مندرائیل راولپنڈی سے تھا اس سے میری دوستی بہت ہی زیادہ حد تک بڑھ چکی تھی۔ یہاں تک کہ میری اور اس کی دوستی پورے بیرک میں بہت مشہور ہو گئی تھی۔ وحید قریشی درحقیقت میری فطرت اور پسند کے سین مطابق تھا۔ وہ بے حد کم گو سنجیدہ اور کتاب دوست ہونے کے علاوہ کام سے کام رکھنے والے کے علاوہ دل کا بہت سخی تھا۔ وہ اکثر اتوار یا جمعہ کے روز مجھے بازار لے جا کر میری بہت خاطر تواضع کرتا تھا۔

ہم اس روز خاص طور پر جیسور کے اکلوتے بازار میں جا کر ناریل، انناس وغیرہ اور کھنٹل کا حلوہ لازماً کھاتے تھے۔ ڈیوٹی کے بعد ہم زیادہ تر وقت اکثر اکٹھے گزارتے۔ یعنی کھانا پینا ہم نہ صرف ساتھ ہی کرتے ہم دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف گہرے دوست تھے بلکہ ہمراز بھی تھے۔

وحید قریشی کے زیر مطالعہ کتب میں جہاں دیگر موضوعات کا ذخیرہ تھا۔ وہاں چند کتب بڑی پراسرار اور چادوئی موضوعات پر بھی مشتمل تھیں۔ جن کو میں نے اس سے مانگ کر پڑھنے کی کوشش بھی کی تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ”یاد تو یہ کتب مجھے کیوں نہیں پڑھنے دیتا۔“

میرے اس سوال پر وہ اکثر ٹال دیتا تھا۔ اس کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعہ کے روز ہم نے اکٹھے جیسور کی جامع مسجد

میں جمعہ کی نماز پڑھی اس کے بعد اس نے مجھے کہا۔ ”میں تمہیں اس مسجد سے سید حالالہ کے مشہور ہوٹل پر لے کر جاؤں گا۔ وہاں پہلے سے کھنٹل بھری کھائیں گے۔ مجھے بھی لالچ آ گیا۔ کیونکہ جمعہ کے روز ہمیں فوجی لشکر سے بچنے کی پتلی دال ملا کر تھی۔“

بہر حال، میں اس کے ساتھ ہویا۔ اس نے سب سے پہلے سائیکل رکشہ کو مسجد کے قریب روکا پھر مجھے رکشہ میں لے کر بیٹھا تو میں نے پوچھا کہ رکشہ جا رہا ہے تو وہ بولا چند منٹ کی بات ہے۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ وہ ذرا کروں پھر لالہ کے ہوٹل جا کر پیٹ پوچا کریں گے۔ میں بھی اس کی بات سن کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے رکشہ کو ایک دیرانے میں رکھنے کو کہا تو رکشہ والے نے بھی حیرانگی کے عالم میں کہا۔ ”جی ادھر روک دوں۔ لیکن یہ جگہ بہت دیران ہے آپ یہاں رکھیں گے۔“

”بس ادھر روک دے۔“ اس نے رکشہ والے سے کہا۔ ”اچھا جی جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے رکشہ روک دیا۔ میں بھی حیرت کے عالم میں وحید کو دیکھ رہا تھا کہ اس دیرانے میں اسے کیا کام پڑ گیا۔

بہر حال میں خاموشی سے سوچنے لگا کہ آگے دیکھوں ہوتا ہے کیا۔ وحید نے مجھے کہا۔ ”یاد تو چند منٹ ذرا اس درخت کے نیچے انتظار کر، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ میرے بولنے سے پہلے ہی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

وہاں آدم نہ آدم کی ذات رکشہ والا بھی اس عجیب ڈراؤنے ماحول سے جان چھڑا کر بھاگ گیا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں بھی تیزی سے وحید کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت آگے چل رہا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کے پیچھے آہستہ آہستہ آ رہا ہوں اس دیرانے میں ایسا مقام آجہاں دیرانے کے بالکل عین سامنے بڑی ہی دیوار تھی جو کہ غالباً کسی اسکول یا کسی سرکاری عمارت کی ہوگی۔ وہ اس دیوار کے سامنے بڑے عجیب انداز سے خاموشی سے ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کیں جیسے کسی قدیم

تصویر یا بدھ مذہب میں کوتم بدھ اس کے مخصوص انداز میں تپا کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے نہ جانے کس زبان میں کوئی عبارت پڑھنا شروع کر دی اور پھر یکدم خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس عمل میں تقریباً چار پانچ منٹ تک ساکت رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھلے سے کھول دیں۔ وہ بیسنے سے شرابور تھا۔ میں بھی حیرانگی اور پریشانی کے عالم میں اس کی اس ناقابل یقین پراسرار حالت کا مشاہدہ کرتے ہوئے خود بھی خوف سے لرزنے لگا۔ اس نے خلاف توقع مجھے اپنے قریب دیکھا تو شدید غصے کے عالم میں مجھے ڈانٹنے اور چلائے ہوئے کہا۔ ”تو میرے پیچھے کیوں آیا؟ میں نے تجھے کہا تھا اس درخت کے نیچے ذرا کر میرا انتظار کر لیکن تو نے میرا کہا نہیں مانا۔“

”وحید بھائی میں دراصل اس دیرانے میں ڈر گیا تھا اور دوسرے میں کچھ بولتا کہ آپ حیرتی سے آگے بڑھ گئے۔“ پہلے تو اس نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھا لیکن بعد میں شانت ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار مجھے معاف کر دے میں نے خواہ مخواہ تجھ کو ڈانٹ بلا دی، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”یہ کیا ماجرا ہے؟“ وحید سے میں نے سوالیہ انداز میں استفسار کیا تو اس نے ایک لمحہ کو توقف اختیار کیا اور کچھ سوچنے کے بعد گہرا سانس کھینچے ہوئے بولا۔ ”جبکہ تو نے سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا ہے تو مجھ سے وعدہ کر کہ یہ بات کسی اور سے کہے گا نہیں۔ یہ میرا ایک راز ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اس نے جب محسوس کیا کہ میں اس کے امتداد کا آدمی ہوں تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”پہلے تو میں تجھے اپنے وعدے کے مطابق لالہ کے ہوٹل سے بہترین بیج کرواتا ہوں بعد میں تجھے اپنا ایک خفیہ اور اہم راز بتاؤں گا۔“

میری آتش اشتیاق بھڑک اٹھی میں نے اس سے کہا۔ ”پہلے تو مجھے بتلا اصل معاملہ کیا ہے؟“

”میں تجھے یہ بات آرام اور سکون سے بتاؤں گا لیکن پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

وہ مجھے لالہ کے ہوٹل لے گیا۔ وہاں ہم نے خوب سیر ہو کر کھانا کھا کر پھر اس نے مجھے بتایا کہ ”میں تجھے زندگی کا ایک ایسا راز بتا رہا ہوں جس کی اصلیت کا سن کر تجھے یقین نہیں آئے گا لیکن میں تجھے حیرتی آنکھوں سے ایک بڑی عجیب چیز دکھاؤں گا۔“

میں نے تجسس سے پوچھا۔ ”وہ کیا چیز ہے؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔ ”اگر تجھ میں ہمت ہے تو تجھے حیرے سوال کا جواب سامنے آ جائے گا۔ لیکن تو نے اپنے دل کو قہام کر رکھا ہے۔“ اس کے بعد ہم دونوں سیدھا اس مقام پر سائیکل رکشہ کے ذریعے پہنچے۔ اس نے مجھے ایک مخصوص جگہ کھڑے ہو کر کہا۔ ”اس دیوار کو غور سے دیکھ اور جو میں بڑھوں اسے تو بھی دہرائتا اور پھر جو چیز بھی تجھے نظر آئے تو گھبرا نہیں میں تیرے پیچھے ہوں۔“

بہر حال میں نے ہمت کو یکجا کیا اور خوف و تجسس کی آمیزش کے جذبہ کے ساتھ اس دیوار کی جانب بغور دیکھنا رہا۔ وہ اپنے منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا میں کافی دیر تک دیوار کی جانب دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے یہ توقف بتا رہا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس نے فوراً اپنا عمل بند کیا اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”ابھی جو چیز میں تجھے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ تجھے دیوار میں نظر آنے والی تھی۔ لیکن تو نے درمیان میں بول دیا۔ اب مجھے یہ عمل پھر سے دہرانا پڑے گا تو آرام اور میرے صرف دیوار کی طرف دیکھ..... اور اگر اب تو نے مجھے ڈسٹرب کیا تو میں تجھے تھپڑ مار دوں گا۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ میں دوبارہ غور سے دیوار کی جانب دیکھنے لگا۔ سات آٹھ منٹ مسلسل دیوار کی طرف دیکھنے پر واقعی ایک نسوانی صورت نمایاں طور پر نظر آئی۔

بال کھلے لہراتے ہوئے نقش دکش اور انتہائی سحر انگیز تھے۔ لیکن یکدم ایک جھماکے سے میری نظروں سے وہ غائب ہوئی۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر واقعی میری گھٹکی بندھ گئی تھی۔ یہ تو کوئی بہت خوب صورت پراسرار مخلوق کی لڑکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”ہاں تم نے مجھے پہچانا لیکن یہ کیسے ہوا؟ میں نے اس سے پوچھا۔

”یار چل اب دیر ہو رہی ہے۔ ہیرک میں رات کے وقت میرے پاس آنا۔“ رات ہوئی تو میں اس کے پاس خصوصی طور پر پہنچ گیا اور اس سے پرخس انداز میں دیوار کے قریب نظر آنے والی ماورائی حسینہ کے متعلق پوچھا۔ وہ ایک لمحہ کو مسکرایا اور مجھے شدید تیندے کے غلبہ کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ دوسری صبح پورے ہیرک میں خبر مشہور ہو گئی کہ وحید قریشی کی آؤٹ آف ٹرن ترقی ہو گئی اور اسے ایک سال کی بنیادی تنخواہ کے برابر بقیہ بھی مل گیا ہے۔ مجھ سمیت ہیرک کے تمام فوجی اہلکار وحید کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اس نے دراصل اپنی پرموشن کے لئے ہینڈ آفس میں اپیل کی ہوئی تھی۔ وہ خلاف توقع منظور ہو گئی۔ اس کا رکھا ہوا اور مشکل ترین کام ہو گیا تھا۔ یہ راز میں ہی جانتا تھا کہ وحید قریشی جاو ٹوٹا اور عمل کرنے والا شخص ہے لیکن کیونکہ میں نے اسے زبان دی ہوئی تھی اس لئے میں اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے خاموش تھا۔

اس دوران جو نیز کشمیر کے لئے ڈھاکہ میں چند پوسٹیں آئیں۔ ہماری کور کے تقریباً 200 لوگوں نے اپلائی کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وحید قریشی اس اسکیم میں سلیکٹ ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر قسمت کا دشمن رہا۔ یعنی وہ سپاہی رینک سے فٹل کر براہ راست سینڈ لیٹینٹ بن گیا۔ ہم سب بے درپے اس کی کامیابیاں دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ کئی بار لوگوں نے اس کا راز اس سے جاننے کی کوشش کی۔

لیکن وہ بہت چالاک سے بات ٹال جاتا تھا۔ وہ

تھا تو میرا گہرا دوست مگر افسر بننے کے بعد بھی وہ بالکل نہ بدلا۔ مجھ سے اس کا رویہ پہلے جیسا ہی تھا جیسا کہ سپاہی دور میں تھا۔ ذرا بھی مغرور نہ ہوا تھا۔ وہ بدستور مجھے ہر اتوار اور جمعہ کے دن لالہ کے ہوٹل میں کھانا کھلاتا۔ لیکن حسب معمول ان دنوں بھی اس دیوار کے پاس جا کر اپنی محبوبہ سے ضرور ملتا تھا۔

میں ایک روز اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”عبدالقدوس میں جس میں پڑا ہوا ہوں وہ تو نہیں کر سکتا۔“

”نہیں میں کر سکتا ہوں بلکہ میں یہ کہتا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی ترقی کرنی ہے اور اس کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اچھا اس وقت تو چاہتا کیا ہے؟“

”تیرا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟“

اس نے مجھ سے پوچھا میرے یوں تو بہت سارے مسائل ہیں لیکن سروسٹ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پیچھے گاؤں میں میرے گھر کے مالی حالات بہت خراب ہیں اور یہ بھی وہ ہے کہ مجھ سے چھوٹے دو بھائیوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے مجھ سے یعنی دوسرے نمبر والا بھائی آج کل بے روزگار ہے۔ کاش اسے کوئی نوکری مل جائے۔ ہمارے گھر کے معاشی حالات درست ہو جائیں۔ میں نے اسے روندھی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا۔ ”ایک کام کرے گا اگر کر سکے تو تیری تقدیر بدل جائے گی۔ جیسے میری بدل رہی ہے۔“

”ہاں میں بروہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری ترقی کے لئے بہتر ہوگا۔“ میں نے کہا۔

اس نے مجھے جوش دلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک جن کو قابو کیا ہوا ہے جو کہ ابھی میرے مکمل قابو میں نہیں ہے۔ مجھے جس عامل نے جن کو قابو کرنے کا طریقہ یعنی چلہ کاٹنا بتایا ہے وہ تین مرحلوں میں ہے، مرحلہ کا علیحدہ اور بڑا صبرانہ نکتہ سخت چلہ ہے۔“

”کتنا سخت ہوگا؟“

”اے اتنا سخت ہوگا کہ تو دیکھے گا تو تیرا

اداسان خطا ہو جائیں گے اور چلہ کو شروع کرنے سے پہلے اس کے تقاضے بھی بہت سخت ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تو کر نہیں سکتا۔“

”یار تیری ترقی اور شان و شوکت کو دیکھ کر میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی تیری طرح محنت کروں۔“

”اچھا اگر تو بعد سے تو سن ہمارے اس کام کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے یعنی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“

”لیکن کرنا کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کرنا یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے کسی نئی قبر میں سے کسی مردے کا تھوڑا سا گوشت کاٹنا اور کار ہوگا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”تیری ہوا اکل گئی نا..... کیسے ہوگا؟..... ارے یہوقوف یہ کام اتنا آسان نہیں، اے جن کو قابو کرنا کوئی اماں جی کا کھیل نہیں ہے۔ دیسے تو پرداہ نہ کر میرے پاس اس کا بندوبست ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں نے قریبی قبرستان کے لاپٹی گورن کو پھنسا رکھا ہے۔ جب بھی میں نے اپنا مخصوص چلہ کاٹنا ہوتا ہے۔ اس کی پھیلی پر 200 روپے رکھ دیکھ دیتا ہوں۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح لاش کے جسم سے گوشت کاٹ کر لادیتا ہے۔“

”اس نکلے کو تو کیا کرتا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا کرتا ہوں؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”اے پاس کا قیہ بنا کر کھاتا ہوں۔“

”تو اسے کھاتا ہے۔“

”اور کیا یہ چلہ کی پہلی شرط ہے۔“ وحید مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا ہے کہ تجھ میں یہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”نہیں میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں وہ ہر عمل کرنے کو تیار ہوں جو میرے مسائل کو حل اور مجھے ترقی میں مدد دے۔“

”تو پھر ہمت کر اور مجھ سے دن طے کر۔“ میں نے بھی اپنے دوسرے مرحلہ کا چلہ کاٹنا ہے۔ لیکن تیرا

## وارننگ

ایک آدمی کا قد بہت چھوٹا تھا جب کہ اس کی بیوی بہت زیادہ لمبی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شوہر صاحب اکثر بیوی سے مار کھا کر ہار بھاگ جاتے تھے۔ ایک دفعہ حسب معمول بیوی نے شوہر سے جھگڑے کے بعد اس کی پٹائی کر دی تو وہ اپنی عادت کے مطابق عاز چھوڑ کر گلی میں بھاگ آیا۔ راستے میں اسے بیوی کا بھائی مل گیا۔ اسے مخاطب کر کے وہ غصے سے بولا۔

”جی صاحب۔ اپنی بہن کو منع کر لیں روزانہ میری پٹائی کر دیتی ہے۔ یہ میری آخری وارننگ ہے جس روز مجھے غصہ آ گیا ناں تو پھر میزمری پر چڑھ کر اتنا ماروں گا کہ یاد رکھے گی۔ پھر آپ بہن کی حمایت میں مجھ سے کچھ نہ کہیے گا۔“

(کاٹڑخان۔ پشاور)

## پاکل دیوانہ

پاکل خانے میں ایک پاکل اپنے سامنے دیکھی میں پانی بھر کر اس میں پھلی کا کاٹا لگائے بیٹھا تھا۔ اسی وقت وارڈن کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے پاکل کو دیکھا تو پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو بھئی؟“

”مچھلیاں پکڑ رہا ہوں؟“ پاکل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”غواب! کتنی پکڑ لیں صبح سے؟“ وارڈن نے مسکرا کر پوچھا۔

پاکل نے حیران ہو کر کہا۔ ”دیوانے ہوئے ہو کیا کہیں دیکھی میں بھی مچھلیاں ہوتی ہیں۔“

(عمران حمید۔ دیپالپور)



ابھی معاملہ شروع اور پہلے مرحلہ میں ہے۔ میں تجھے اس کے لئے چند ابتدائی شرائط اور طریقہ بتا دوں گا۔  
”وہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلی شرط یہ ہے کہ تو نے میرے ساتھ قبرستان جانا ہوگا اور پھر وہاں ہمیں گورن ایک تازہ لاش کے گوشت کا ٹکڑا دے گا پھر اسے ہم قیہ بنا کر آدھا آدھا کھائیں گے۔“

”کچا گوشت اور وہ بھی کسی مردے کا؟“ یہ بات میرے دل میں آئی لیکن میں نے اس کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔ اس نے پھر مجھ سے کہا۔ ”ہفتہ کی رات آٹھ بجے کا وقت طے ہوا۔“ اس نے کہا۔ ”میں ٹھیک وقت پر قبرستان آ جاؤں گا۔“

”تو دل و دماغ سے تیار ہو کر سیدھا شکور خان گورن کی جھونپڑی میں آ جانا۔“

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات جیسو کی آب و ہوا میں سخت سردی تھی لیکن خوش قسمتی سے بارش نہ تھی، میں وعدے کے مطابق پورے آٹھ بجے مذکورہ قبرستان پہنچا۔ ایک طرف سخت سردی اور قبرستان میں کیڑے مکوڑوں کا رنگ برنگی آوازیں دل کو دبلا رہی تھیں۔ میں خوفزدہ قدموں سے چلتا ہوا جب شکور کی جھونپڑی میں پہنچا تو وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ صرف وہاں ایک دیا جل رہا تھا۔ میں وہاں ایک طرف سہا ہوا اکیلا کھڑا ہو گیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس شہر غموں کے مردوں کے درمیان صرف میں ہی زندہ انسان ہوں۔ پتا نہیں وحید آتا ہے کہ نہیں۔

میرے دل و دماغ میں مختلف اندیشے منڈلانے لگے۔ ابھی میں ہی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھی مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”وہ جی آپ ہی عبدالقدوس ہیں؟“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک کھردری شکل کا ایک بوڑھا شخص اپنے ہاتھوں میں کسی کاغذ میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز پکڑے ہوئے تھا۔ ”میں شکور خان گورن ہوں۔ یقیناً آپ وحید قریشی کے دوست ہیں جنہوں نے آج آنا ہے۔“

”ہاں میں عبدالقدوس ہوں۔“

”آپ بیٹھ جائیں۔“ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”آج بہت سردی ہے۔“ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”ہاں آج واقعی کچھ زیادہ ہی سردی ہے۔ گورن نے جواب دیا۔ ”میں لکڑیاں جلا کر آگ جلاتا۔ لیکن اس لئے جلا نہیں رہا کیونکہ آج رات فجر تک آپ دونوں نے ایک نیر میں ننگے بدن سے جن کو قابو کرنے کے لئے عمل کرنا ہے؟ آپ ابھی سے اپنے آپ کو جچی و جسمانی طور پر تیار کر لیں اور ہاں میں تمہارے لئے جن کو قابو کرنے کے لئے پہلی شرط کے مطابق لاش کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لایا ہوں۔ پتا نہیں وحید قریشی آئے گا کہ نہیں۔“ میں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

”وہ ضرور آئے گا۔ اس نے مجھے 200 روپے ایڈوانس دیئے ہیں۔ تم بھی کوئی جادو وغیرہ یا جنوں کو قابو کرنے کا کوئی عمل کرتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں۔ ہم تو اس قبرستان کی مٹی کے ڈھیر میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں مر جائیں گے۔ تم نے ساہوکار کا لاکھ دوڑ سجدہ کیا ہے۔ بس ہم نے اس مٹی میں مٹی ہو جانا ہے۔ باؤجی آپ لوگوں کی طرح ہماری کوئی بڑی خواہش یا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا ہر انسان کی فطرت کے اندر کوئی نہ کوئی مسئلہ یا آگے بڑھنے کا لالچ تو ضرور ہوتا ہے۔“

میں نے اس سے کہا۔

”ہونا ہوگا۔“

”لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتا جو آپ لوگ کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے تو صرف اپنی مزدوری سے غرض ہے۔ مجھے تو ویسے بھی اس دور میں 200 روپے ہماری معاوضہ مل جائے گا اور مجھے کیا چاہئے۔“ اس نے کہا۔ ”لگتا ہے صاحب جی آگئے۔“ اس نے دروازہ کھولا تو وحید قریشی ہمارے سامنے باریک ملل کی قمیض اور کاٹن کی مختصر بگلی جوتی پہنے ہوئے کھڑا تھا۔ ”دیکھو میں نے کہا تھا ناں کہ وحید صاحب وعدے کے پکے

ہیں۔ ضرور آئیں گے۔“ وحید نے شکور خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”گوشت تیار ہے۔“

”ہاں جی۔“ اور شکور نے اخباری کاغذ میں لپیٹی ہوئی چیز وحید کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ ”دیری ملے۔ یہ تو بڑا اچھا کام کر دیا لیکن یہ بڑا خطرہ ہے اسے آدھا کر کے اس کو قیہ بنا دنا تو عمل بڑھتے وقت اسے آسانی سے سٹکا جاسکے۔“ مجھے اسے دیکھ کر ابکانی اور کراہیت محسوس ہونے لگی لیکن میں نے بالکل بھی اس کا احساس اس کے سامنے نہ کیا۔

میرے لرزتے پاؤں اور سخت سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسے کو دیکھتے ہوئے وحید نے مجھے کہا۔ ”دیکھو عبدالقدوس تم میرے دوست اور ہم راز ہو۔ اب بھی وقت ہے تم یہاں سے جاسکتے ہو۔ دیکھو جو کام میں اور تم کرنے جا رہے ہیں وہ بہت کٹھن ہے، تکلیف دہ اور خطرے والا ہے۔ اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تخت یا تختہ، سیدھا ہو گیا تو دارے کے ہارے اور اگر انا ہو گیا تو تختہ ہو جائے گا یعنی اگر جن قابو نہ آیا اور وہ بگڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔“ میں نے وحید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت اتنے مسائل کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں کہ میں جتنی طور پر تمہاری ہر بات ماننے اور اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔“

یہ سن کر وحید نے گہرا سانس لیا اور مجھے کہا۔ ”اچھا یہ بات ہے تو تمہاری مرضی، میں تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں جن قابو کرنے کے لئے پہلے مرحلے کا عمل کروانا ہوں۔ اس مرحلے میں سب سے پہلے تمہیں یہ مردہ انسان کا قیہ کھانا پڑے گا اور ساری رات ایک خالی قبر میں میرے پیچھے بیٹھ کر وہ پڑھنا پڑے گا جو میں پڑھوں گا پھر آخر میں تمہیں ایک بد شکل جن نظر آئے گا اسے دیکھ کر ڈرنا نہیں بس اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا لیکن ہاں اس عمل میں تمہیں قمیض اتارنی ہوگی اور عمل فجر کی نماز سے پہلے تک جاری رہے گا اور ایک بات تمہیں میں بتانا بھول گیا تم نے عمل کرنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کوئی چھوٹا بڑا پیشاب نہیں

کرنا جو کرنا ہے پہلے کر لیکن استنجے کے ساتھ۔“ آپ کا تو غالباً دوسرا مرحلہ ہے۔“ شکور خان نے وحید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہاں میرا دوسرا مرحلہ عبدالقدوس کا پہلا مرحلہ ہے اس کا مطلب ہے کہ آپ کا آج کے بعد آخری اور تیسرا مرحلہ رہ جائے گا۔ اس کے بعد مطلوبہ جن آپ کے عمل قابو میں آ جائے گا۔“ شکور خان نے کہا۔ ”ہاں میں پھر اپنی زندگی کی ہر خواہش اس کے ذریعے پوری کر پاؤں گا۔“ وحید نے فخریہ انداز میں کہا۔

”چلیں صاحب۔ اس گوشت کا قیہ بنا کر اسے دو حصوں میں لاتا ہوں۔“ شکور خان نے کہا۔

وحید قیہ پلے کے اندر کودا اور پھر مجھے خالی قبر میں اترنے کے لئے کہا۔ میری روح و جسم پر لرزہ طاری ہو گیا لیکن میں ہمت کے سہارے قبر میں اتر گیا۔ بہت بھیا تک سزا اندک ہی بدبو آ رہی تھی تقریباً قیہ دو حصوں میں اخباری کاغذ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اسے دو حصوں میں کھانا پڑے گا۔ ایک حصہ عمل شروع کرتے وقت جب اس کی نیت کی جائے گی اور دوسرا جب تمہیں کچھ نظر آئے گا تو پھر اور جیسے میں پڑھتا ہوں گا تم بھی زیر لب پڑھتے رہنا اور اپنی آنکھیں بند کر کے اور جب تمہیں کچھ نظر آئے تو پھر اس سے اپنے دل کا مدعا بیان کر دینا لیکن تم نے ننگے بدن پر سردی کے جھوکوں اور کیڑے مکوڑے کے کاٹنے کے باوجود بھی ذرا بھی اپنی آنکھیں کھولنی اگر کھول دی تو سوچ لو کوئی نقصان ہوا تو مجھ سے شکوہ نہ کرنا۔“ وحید نے کہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے انسانی مردہ گوشت کا قیہ کھالیا، قیہ تمہ میں رکھتے ہی ایسی کراہیت، بد ذائقہ اور کوفت ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وحید نے بھی میری طرح قیہ کھالیا وہ جو بھی عمل پڑھتا رہا میں اسے دہراتا رہا۔

ہم دونوں کی پیٹھ قمیضوں سے محروم تھی اوپر سے شدید سردی کی اذیت اور قبرستان کی خون خشک کرنے والی کیفیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن بہتر

مستقبل اور مسائل کے حل کے جوش و جذبہ کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔

رات تقریباً ایک بجے اس نے خاموشی اختیار کر لی اور میں نے اپنی آنکھیں مسلسل بند کی ہوئی تھیں کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ اپنی آنکھیں اس وقت تک نہیں کھولنی جب تک میں نہ کہوں۔ میں آنکھیں بند کئے بے سدھ رہا۔ سخت سردی اور انسانی مردار کا قیہ کھانے سے میرے پیٹ میں شدید ناقابل برداشت ابکائیاں آرہی تھیں۔ لیکن میں نے اپنے دانتوں کو بری طرح بچھینا ہوا تھا۔

اس دوران رات کے تقریباً دو بجے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے آگے کوئی شیبہ بن رہی ہے وہ بجائی طور پر کھینچی پھر غائب ہو جاتی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے کچھ سیکنڈوں کے لئے اپنی مکمل شکل اختیار کر لی وہ بہت خوفناک اور بد صورت بچے کی طرح تھی جس کے بڑے سے چہرے پر ماتھے کے درمیان ایک سرخ آنکھ تھی۔ اس کو جب میں نے دیکھا شکر ہے میرا شعور قائم تھا میں نے فوراً دل میں کہا۔ ”خدا کے لئے میرے معاشی مسائل حل کر دو۔ بھائیوں کو کہیں نوکری دلا دو۔“ پھر وہ فوراً جھٹ پیٹ غائب ہو گیا۔ اگرچہ میں بے سدھ آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ میرا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اب شاید مرنے والا ہوں۔ میرے دل میں آیا کہ آنکھیں کھول دوں لیکن میں وحید کی آواز پر قائم تھا۔ چند لمحوں بعد وحید کی آواز سنائی دی۔ ”عبدالقدوس! اپنی آنکھیں کھول دو۔“ میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

وحید نے اپنی میٹھ بینی اور مجھ سے کہا کہ تم بھی قمیض پہن لو۔ پوری رات خالی قبر میں نہ گفتہ حالت میں بیٹھ کر ایسا کیسے پورا بن ہو گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد عبدالشکور گورکن دو پرانے کبل لے کر آیا۔ ایک اس نے میرے اوپر اور دوسرا وحید پر

ڈالا۔ وہ سہارا دے کر پہلے وحید کو اور پھر مجھے اپنی جھونپڑی میں لے کر گیا۔ وحید اور میں سردی اور پیٹ کے درد سے تڑپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گرم دیسی چھلی کے سوپ کے پیالے کے ساتھ ایک کالی سی گولی ہمیں دی تو میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہاؤ جی چھلی کا سوپ آپ کو گرمی اور درد کو راحت دے گا اور یہ کالی گولی آپ کا معدہ نہ صرف صاف کرے گی بلکہ آپ کے پیٹ کے اندر انسانی قہر کی گندگی اور اثرات مائل کرے گی۔“

واقعی اس کا دیا ہوا سوپ اور گولی نے بڑا موثر کردار ادا کیا۔ ہم دونوں کے ہوش اور ذہن ٹھکانے آئے تو وحید نے مجھ سے پوچھا۔ ”اور بھی سناؤ رات کیسی گزری۔“

میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے تو تارے نظر آگئے لیکن مجھے جن بچے بھی نظر آگیا۔“

”تو تم نے اچانک عایان کیا کہ نہیں؟“

”ہاں کیا تھا۔“

”چلو بہتر ہوگا۔“

میں صبح ہوتے ہی سیدھا اسپتال گیا کیونکہ میرے پیٹ کا درد اور ناک سے بہتا نزلہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک دوا کھاتا رہا۔ جس سے میرے بہتے نزلہ اور درد کو آرام ملا لیکن میرے پیٹ میں مستقل مروڑ اور موٹن کا مرض گھر کر گیا تھا۔ چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان اپنے گھر سے خط ملا کہ مجھ سے چھوٹے بھائی کو دفتر خارجہ میں نوکری مل گئی ہے۔ میری تو خوشی کے مارے ہاتھیں مل گئیں۔ اب یہ بات مجھ پر عیاں ہو گئی کہ واقعی جن کو قابو کرنے کا میرا پہلا مرحلہ صحیح طور پر مکمل ہو گیا۔ دل کو تسلی ہوئی کہ بچہ جن نے میرا کام کر دیا۔

چند روز بعد مجھے وحید نے بلایا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ مزید ترقی کر گیا ہے۔ اور اب اسے علیحدہ چھوٹا سا بنگلہ مل گیا ہے اور دوسری طرف گاؤں سے خیر آئی ہے کہ مجھے خدانے اولاد دینے سے نوازا ہے۔ میں نے بھی

اسے اپنے بھائی کی اچھی جا ب کے بارے میں بتلایا۔ یہ سن کر وہ خوش ہوا لیکن اس نے مجھ سے کہا۔ ”اگر تم اپنی زندگی میں مزید ترقی و خوشحالی چاہتے ہو تو ہمیں اب جن کو قابو کرنے کے لئے دوسرا مرحلہ طے کرنا ہے۔“ اور نیز اس نے یہ بھی بتلایا کہ ”وہ اب جن کو قابو کرنے کے لئے آخری مرحلہ طے کرے گا جس سے وہ اس کے عمل قابو میں آجائے گا وہ مجھ پر اپنے قابو شدہ جن کے ذریعے کئی کام کرانے گا۔“

میرا یقین تو پختہ ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے دوسرا مرحلہ طے کر کے جن کو مزید قابو کر کے اس سے مزید افادیت حاصل کرنی چاہئے۔ وحید نے پھر ماضی کی طرح تاکید اور تنبیہ کی۔ ”اس بار بھی یہ کام بڑی راز داری اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔“

میں مان گیا اس بار ہمارا خالی قبر میں عمل کرنے کا دن اتوار کے روز طے پایا کیونکہ دوسرے دن یعنی سوموار کے دن کوئی قومی دن کی وجہ سے چھٹی تھی۔

وحید نے مجھ سے کہا کہ ”تم اس قبرستان میں شکور خان گورکن کے پاس آٹھ بجے آ جانا۔“ اور اس نے یہ بھی بتایا اس دفعہ ذرا عمل سخت ہوگا لیکن اگر یہ ہو گیا تو پھر میرے اور تمہارے وارے کے بنارے ہوں گے۔ اب تمہارا دوسرا اور میرا تیسرا مرحلہ رہ گیا ہے اور ہاں یہ چلہ پہلے سے ذرا سخت اور طویل نوعیت کا ہوگا۔ تم ہر قیمت پر وہاں آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا۔

نیز وحید نے مجھ سے بھی بتایا کہ اس نے 300 روپے گورکن کو ایڈوانس دے دیئے ہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔ میں نے بادل خواستہ عالی بھر لی۔

اتوار کے دن صبح ہی سے بہت سرد ہوائیں جیسوڑی فضاؤں کو غھٹرائے دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ رات کو قبرستان کی سخت سردی میں ننگے بدن خالی قبر میں چلہ کشی کرنی ہے لہذا کیوں نہ میں چھلی کی بنی ٹی لٹوں لہذا میں وہاں کی بام خصوص بنگالی چھلی خرید کر لایا۔ میں نے ہیرک کی کیشین کے ایک ویئر کو کہا۔

”ذرا اس کا سوپ بنا دے۔“ میرا خیال تھا کہ میں سوپ کے ایک دو پیالہ ہی قبرستان جاؤں گا تاکہ جسم کسی حد تک گرم رہے۔ ویئر کے لئے ہوئے سوپ کے دو پیالے پینے کے بعد میرے پیٹ میں ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بارود پی لیا ہے۔ اور وہ پھٹنے کو بے تاب ہے۔ ناقابل برداشت مروڑ کے ساتھ مجھے ہیضہ ہو گیا۔ میری بگڑتی حالت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر میرے ہیرک کے سپاہی مجھے اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ابتدائی طور پر مجھے درد کش ٹیکہ اور کچھ وغیرہ دیئے۔ لیکن مجھے آرام نہ آیا۔ درد تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دوسرے دن میں نے چلہ کٹنے کے لئے لازماً جانا تھا۔ میں نے اسپتال میں جھوٹا بھانہ کیا کہ ”میں نے بہت ضروری کسی عزیز کی شادی میں جانا ہے لیکن وہاں کے ڈاکٹر میرے ساتھیوں اور علی نے مجھے سختی سے روکا کہ تمہاری حالت بہت خراب ہے۔“

بہر حال جب میرا درد شکم شدید بڑھنے لگا اور مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو فوری طور پر ڈاکٹروں نے مجھے بے ہوش کا ٹیکہ لگا دیا صبح غنود کی کے عالم میں میری آنکھ کھلی تو میرا درد شکم ختم ہو چکا تھا۔ البتہ گلو کوڑی بوتل کی پتلی ٹیوب میرے بازو میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے ہونٹوں کی طرح اپنے گرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو وہاں ایک نرس میرے چند ہیرک کے ساتھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک میرا دوست بولا۔ ”تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ اور دوسری محسوس خبر ہے۔“ میں نے اچھے اور تھرت سے پوچھا۔

”کیا خبر ہے؟“ اس نے سکراتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے کہ بڑی جدوجہد اور مشکل کے بعد تمہاری جان بچی گئی لیکن تمہارے لئے یہ بری بلکہ محسوس خبر ہے کہ آفیسر زکالونی سے یہ خبر آئی ہے کہ تمہارے جگر کی دوست وحید قریبی قریبی قبرستان کے ایک خالی قبر میں ننگے بدن کوئی چلہ کر رہے تھے کہ وہ مر گئے۔“



## قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

پگلوں پہ آسودوں سے چراغاں کریں گے ہم  
اس طرح کہکشاں کو پریشان کریں گے ہم  
واقف ہیں ہم بھی گردشِ دوراں سے دوستو!  
اس بات پہ نہ چاک گریباں کریں گے ہم  
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

موسم کو موسم کی بہاروں نے لوٹا  
کشتی کو سمندر کے ظہری کناروں نے لوٹا  
ارے تم تو ایک قسم سے ڈر گئے  
تیری قسم دے کر مجھے ہزاروں نے لوٹا  
(نضر حیات.....روڈہ قتل)

کبھی راتوں کی کروٹیں کبھی دن کی بے چینیاں  
اے محبت خدا کے واسطے ذرا محبت سے پیش آ  
(محمد نجم جوئیہ.....روڈہ قتل)

واہ میرے محبوب بڑی جلدی خیال آیا  
بس کرو چمٹا اب اٹھانے دو جنازہ  
(محمد دانیال جوئیہ.....روڈہ قتل)

تم صاف رہو یا نہ رہو اے مہ تاباں  
ہم وہ ہیں کہ دل بھی کبھی میلا نہیں ہوتا  
کیوں عشق میں ڈوبے نہ رہیں چاہنے والے  
دریائے محبت میں کنارہ نہیں ہوتا  
(مہر پرویز احمد دولہ.....میاں چنوں)

ہے نزاکت بکے فصل گل میں معمار چن  
قلب گل میں دھلی ہے نشت دیوار چن  
وقت ہے، مگر بلبل مشکیں زلیخا کی کرے  
یوسف گل جلوہ فرما ہے، یہ بازار چن  
(انس حبیب خان.....کراچی)

آہ کو چاہے اک عمر اثر ہونے تک  
کون جیتا ہے تیری زلف کے سحر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک  
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

اپنے خیالوں میں آنے کی اجازت دو ہم کو  
ہم تمہارے ہیں بتانے کی اجازت دو ہم کو  
یہ نہ ہو ٹوٹ جائے امید وفا ہماری  
بس کچھ پل چینی کی اجازت دو ہم کو  
(شاہد علی خان.....لورالائی)

تمہارا نام لکھ کر مٹانا بھول جاتا ہوں  
تمہیں جب یاد کرتا ہوں بھلانا بھول جاتا ہوں  
بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میرے دل میں رہتی ہیں  
مگر جب تم سے ملتا ہوں تو بھانا بھول جاتا ہوں  
(جہانزیب.....کراچی)

گرنے سے پہلے میں بھی قابل پرواز تھا  
بے وفائی اس نے کی جس کی وفا پہ بڑا ناز تھا  
(ڈاکٹر رانا عاشر شہزاد.....سنگانہ صاحب)

ابھی تو دفن بھی نہ ہوئے تھے خاک قبرستان میں ہم  
کہ شہنائیوں کے ساتھ رقص کرتے جاں ہماری نکلے  
(ذکاء اللہ بھٹی.....کراچی)

تم خواب میں آئے پاس میرے  
ہم دل کی تمنا کہہ نہ سکے  
ہم خواب میں بھی ڈرتے رہے  
رسوا تو نہیں کردو گے مجھے  
(رشک نور.....فیصل آباد)

ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ لکھا اس کا بھی نام  
پھر لکھا یہ بھی کہ ”صبح“ دوپہر، شام  
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی.....شعبک موٹو قصور)

تجھ سے ملنے کی دعا لب پہ نہ آجائے کہیں  
چاند کو دیکھ کر یوں آنکھ بچائی ہم نے اے دوست  
(دلبر خان.....کوئٹہ)

حد تکمیل کو پہنچی تیری رعنائی حسن  
جو کس رسمی وہ مٹادی تیری انگوٹائی نے  
(عبدالحمید آرائیں.....سجرات)

☆☆



پڑھ کے صلی علی سرور ملا  
دیدہ دل کو کیا نور ملا  
ملا، یس آپ کا سہرا  
آپ کی شان میں کلام خدا  
رحمت دو جہاں آپ ہوئے  
رب کے اک ترجمان آپ ہوئے  
دین اسلام آپ سے پھیلا  
شرک کا داغ آپ نے دھویا  
آپ کی کیا شائستگی ہو  
قلب خوش آپ کی نظر سے ہو  
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

کئے جو ہم سے وعدے تو انہیں وفا کرنا  
مانگ لینا جان ہم سے بچ نہ جہا کرنا  
نہیں کر کر دیں گے سب کچھ قربان ہم  
مصوم سا دل توڑنے کی نہ خطا کرنا  
میں عشق کی انتہا کو چھو جاؤں جو کہو  
میرے عشق کو ہی میری نہ سزا کرنا  
زمانے کی تنخیاں سہہ کر تم کو پایا ہے  
ہو کر قریب وہ تنخیاں بھلایا کرنا  
قدم قدم پر دکھاتا ہے زمانہ دل  
گر ہو سکے تو ہر دکھ کا تم عدا کرنا  
جب فرصتوں میں ہو کسی محسوس تو  
آنا میرے پاس اور پیار سے جایا کرنا  
میری فرصتوں کی محتاج محبت کی قسم  
ہے نینا کی فطرت تو تجھ سے وفا کرنا!!!  
(ایڈووکیٹ نینا خان.....کراچی)

تیری چاہت میں تیرے دیوانے ہو گئے  
اب تو ہم انہوں سے بیگانے ہو گئے

تیری پھول سی صورت کے ہم طلبگار تھے  
پھر آنکھوں میں کیسے خواب سہانے ہو گئے  
جو تیری یاد میں کھوئے رہتے تھے اکثر  
وہ جان تمنا تیرے جیسے مٹانے ہو گئے  
تیری شوخ نگاہوں نے کردیا ڈنکی ہم کو  
کارگر تیری آنکھوں کے نشانے ہو گئے  
تیرے ساتھ گزارے تھے پیار بھرے لمحات  
جیسے اب وہ ماضی کے فسانے ہو گئے  
اپنی جان سے زیادہ تجھے چاہا ہے جاوید  
پھر کیوں غیروں سے تیرے یارانے ہو گئے  
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

دل کی بربادی کا قصہ ہم نے سن لیا  
اک دیوانی کو ہمارے دل نے جن لیا  
آئی صبا تو پوچھا حراج یار کا  
ایک ایک پہلو ادا صبا نے گن دیا  
پتا چلا کہ دیوانی تنہائیوں میں رہتی ہے  
خوش رہنے کا ہم نے اسے فن دیا  
اب اٹک نہیں بہانہ مسکراتا ہے سدا  
چلو سن بھی دیا اور تمہیں تن بھی دیا  
اب نہ کہتا تھا ہوں تمہارے ساتھ ہوں میں  
اے صبا اے کہتا کیا اس نے سن لیا  
(محمد اسحاق انجم.....سکین پور)

لہرائے سدا آنکھ میں پیارے تیرا آئینہ  
جمور ہے تیرا چاند، ستارے تیرا آئینہ  
آئینہ میں چپے رنگ کھاریں تیری زلفیں  
ابھی ہوئی زلفوں کو سنوارے تیرا آئینہ  
اس وقت ہے تکی کی طرح ہوا دوش پر  
اس وقت کہاں بس میں ہمارے تیرا آئینہ  
اب تک میری یادوں میں ہے رنگوں کا طالع  
دکھتا تھا کبھی جمیل کنارے تیرا آئینہ  
لپٹے کبھی شاخوں سے کبھی زلف سے اٹھے  
کیوں ڈھونڈتا رہتا ہے سہارے تیرا آئینہ



کاہل بہہ بہہ کے رلائے مجھے اب بھی  
رہ رہ کے مجھے اب بھی پکارے تیرا آہل  
(شرف الدین جیلانی.....نڈوالہ یار)

یہ شاہکار وطن تار تار پیراہن  
یہ جملے جملے سے چہرے پہ زرد زرد بدن  
یہ وہ ہیں جن کی سیاست سے آشنائی نہیں  
نہ اس آسکا ان کو نہ ان کا علم نہ فن  
وفا و صدق و صفا ہیں صفات اعلیٰ درست  
مگر نتیجہ فقط یہی ہائے کام و دہن  
شجر شجر ہے ستم آلود ہر کلی پر خون  
نہ پوچھ ہم نفسو حسن و آب رنگ چمن  
ہزار دہم ہیں دل میں تو اشک آنکھوں میں  
نہ آرزوئے بہاراں، نہ پرکشش سادہاں  
عجب سکوت ہے اب اطہر زندگانی میں  
نہ ان کو تاب سخن ہے نہ مجھ کو شوق سخن  
تمام عقل زیاں کار کے کرشمے ہیں واجد  
کہ قسط و جنگ ہیں اب نصیب ہر دامن  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گھنوی.....کراچی)

سنو  
تم سے ملنے بھی تو کیسے ملتے  
گو کے منزل دور نہ تھی  
مگر

کبھی راستوں نے بھٹکا دیا  
کبھی موسموں کی نظر لگ گئی  
کبھی کسی مجبوری کی زد میں آ گئے  
اور کبھی  
اور کبھی محبت ہی نہ رہی

(ایس ایم ازامحہ.....کراچی)

چھپر دیتا ہے یہ دل پھر سے پرانی کوئی بات  
کوئی دکھ کوئی گلہ کوئی کہانی کوئی بات  
ایک چپ تھی جو کہ خوشبو کی طرح پھیلی تھی  
پہلے ہی دل پر ہیں بہت زخم

صبح دم کہہ نہ سکی رات کی رانی کوئی بات  
اہل گلشن کا تو شیدہ ہے کہ بدنام کریں  
گل بھی سنتا کبھی بلبل کی زبانی کوئی بات  
وہ تیرا عہد وفا تھا کہ وفائے وعدہ  
میں کہہ کر پھر بھول گیا یاد دلانی کوئی بات  
جانے کیوں اب کے پریشان ہیں تیرے خانہ بدوش  
ورنہ ایسی بھی نہ تھی لعل مکانی کوئی بات  
جس طرح ساری غزل میں کوئی عمدہ مصرع  
جس طرح یاد میں رہ جائے نشانی کوئی بات  
اہل دستار و قبا ترش جبین کیوں ہیں شہزاد  
کہہ گئی کیا میری آشتی بیانی کوئی بات  
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد.....ننگا نہ صاحب)

دل سے دور وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
دووں انسان ہیں خدا وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
وہ مجھے اور میں اسے الزام دیتا ہوں  
مگر غلط اپنی جگہ وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
محبت تو ہم دووں کرتے ہیں دل سے  
محبت کا گناہگار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
عمر بھر ساتھ اگر ہم بنی لیں تو کیا ہوگا  
پر ہاتھوں کی لکیروں میں وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
اس کے علاوہ میں کیا مانگوں اس خدا سے  
اور کسی چیز کا طلبگار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
(نضر حیات.....روڈ ٹھل)

شام سہانی اور شاہراہ قائد کی نمی نمی چھاؤں  
ایسے گلے ہم تم رہتے ہیں کسی اجنبی گاؤں  
تھا جا رہے ہو دل کہہ رہا ہے  
آؤ ساتھ میرے تم بھی کوئی نقہ گاؤں  
شاخسار ہیں سجے شصموں سے  
دل میں کوئی نہیں آؤ سہم جاؤں  
ہر ایک حینہ پہ حسن کی چھاؤں  
سب سے بے نیاز ہے تمنا ہے تم ہی کو پاؤں  
پہلے ہی دل پر ہیں بہت زخم

اس بچے سے دل پر تم ستم اور نہ ٹھاؤں  
اگر آج تم مجھے مل گئی تو  
تجھے لے کے کہیں دور بھاگ جاؤں  
شام سہانی اور شاہراہ قائد کی نمی نمی چھاؤں  
ایسے گلے ہم تم رہتے ہیں کسی اجنبی گاؤں  
(غلام مصطفیٰ بادل.....قصور)

یہ کیا ستم مرے پروردگار ہوتا ہے  
ختم عدد میں کوئی سوگوار ہوتا ہے  
کسی کا شام و سحر انتظار ہوتا ہے  
اب آگے کیا میرے پروردگار ہوتا ہے  
وہ گھر ہمارے لئے قائل زیارت ہے  
ترا ظہور جہاں بار بار ہوتا ہے  
تمام اہل جہاں جب خاموش ہوتے ہیں  
تو ساز عشق مرا نقہ بار ہوتا ہے  
یہ ایک اپنے نفیس کا رقص میں آنا  
تجمن میں ایسے نشان بہار ہوتا ہے  
تجسسی کی یاد ستانی ہے کیوں یہاں مجھ کو  
تجسسی کی یاد سے ہاتھیں کروں نہ کیوں عامر  
اسی سے دل کو مرے کچھ قرار ہوتا ہے  
(ایس حبیب خان.....کراچی)

تیری آنکھوں کا نور ہوں میں  
تجھ سے پھر اتنی دور ہوں میں  
اپنی راہوں سے بھٹکا ہے تو  
دیکھ بیٹھی ہوں رنجور میں  
تو ہے مغرب کے نشے میں گم  
تیرے نشے میں ہوں چور میں  
تیری یادوں میں ڈوبی ہوئی  
آنسوؤں میں شرابور میں  
میں پری ہوں بدیع الممال  
کھڑی لے کر سندور میں  
تو ہے گاؤں کا گھبرو جوان



## چڑیل کا بسیرا

شازہ اعوان - راولپنڈی

اچانک چڑیل کی آواز سنائی دی، میرا بیٹا درخت کی ٹھنی پر موجود تھا کہ اس گھر کے فرد نے کلھاڑی سے میرے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی اور میں ہر صورت اپنا بدلہ لے کر رہوں گی اور پھر.....

ایک سرکش چڑیل کی سرکشی جس نے گھر والوں کو تنگ کر رکھا تھا..... خیر انگیز کہانی

جو کہانی میں آپ کو سنانے جارہی ہوں سو فیصد سچی کہانی ہے آپ کو کہانی پڑھنے کے بعد اس کی سچائی کا علم ہو جائے گا کہ یہ واقعہ کس کے ساتھ پیش آیا تو سچے۔

یہ سچی کہانی ہے کہ لاہور میں میرے شوہر کا ایک دوست رہتا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ مل کر ایک ہوٹل بنانا چاہتے تھے اس لئے میرے شوہر مجھے اور دو چھوٹے بچوں کو لے کر آگئے میری ایک بیٹی تھی جس کا نام شمن نور تھا۔ اور ایک بیٹا جس کا نام اسفندیار تھا بیٹی تین سال کی اور بیٹا ایک سال کا تھا۔

لاہور آ کر ہم نے فاروق یعنی کہ آصف کے دوست کے گھر کے ساتھ والا گھر کرایہ پر لے لیا یہ گھر ایک ٹاؤن ایریا میں شفٹ ہوئے۔ لاہور آنے کی وجہ صرف

نا زندگی کا سوچا تھا نہ زمانے کا سوچا تھا میں نے بس تمہیں اپنا بنانے کا سوچا تھا تمہارے روٹھ جانے کے انداز کی قسم تم روٹھ جاؤ تو زمانے کا سوچا تھا وقت نے نہ کی وفا تو کوئی گھٹ نہیں میں نے تم سے وفا نہیں بھانے کا سوچا تھا تم مجھے رلاؤ تو کوئی بات نہیں میں نے رو کر بھی تمہیں منانے کا سوچا تھا (محمد عظیم۔ روٹھ تھل، خوشاب)

اس کے ہونٹوں پر اتر آئی دعا میرے بعد یہ بھی صد شکر مرا نام لیا میرے بعد اپنی ہستی سے تو دیے ہی اسے نفرت تھی وہ تو کرتا ہی رہا خود سے بھنا میرے بعد ہوش اپنا نہ کسی شخص کی پہچان اسے روگ ایسا ہی کوئی اس کو لگا میرے بعد وہ جو پتھر کے خداؤں میں رہا کرتا تھا اس کی آنکھوں سے کوئی اشک گرا میرے بعد اس کو احساس ہوا میرے پھرنے سے اس نے محفل میں مرا ذکر کیا میرے بعد (راشد زمان۔ صادق آباد)

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں ہر شب تہائی میں ستانی ہیں تیری یادیں لوٹ کر اب بھی نہ آئے گا تیرے پاس ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلاتی ہیں تیری یادیں روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں تیرا نام لے کر ترقیاتی ہیں مجھے تیری یادیں جب بھی بھجھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا مجھ سے پوچھے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں لٹک بھلاتا چاہتا ہوں جس صورت کو ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں (فلک زاہد..... لاہور)

☆☆

میرے مرد

میرے دوست

غم نہ کر

ہم سب ساتھ ہیں

(گلاب خان سولنگی..... نوشہرہ فیروز)

روشنی کی اس طرح تشہیر ہونی چاہئے ظلمتوں کی پھر بری تقدیر ہونی چاہئے داعیوں ہیں اس جہاں میں کچھ ہمارے بھی حقوق میکدے میں آج اک تقریر ہونی چاہئے تجھ سے میرے ظلم کی روداد کہنے کیجئے! تیرے در پہ عدل کی زنجیر ہونی چاہئے چاندنی ہے دھوپ جیسی دھوپ سایہ دار ہے ہے اگر یہ خواب پھر تعبیر ہونی چاہئے آج پھر ہے عید شاکر پھر وہی تہائیاں وہ نہیں تو ان کی گھر تصویر ہونی چاہئے (محمد حنیف شاکر..... بھاگووالی نکانہ صاحب)

کون ہو تم

میرے انتظار کی راحت ہو تم

میرے دل کی چاہت ہو تم

تم ہوا یہ دنیا ہے

میں کیسے کہوں کہ میرے لئے کیا ہو تم

چلو میں بتاؤں کیا ہو تم

میں نے جو مانگی وہ دعا ہو تم

کرے مجھ کو جو روشن وہ دیا ہو تم

فضا میں بہکتی اک شام ہو تم

پیار میں چھلکتا جام ہو تم

میری زندگی کا دوسرا نام ہو تم

میری جھپکی زندگی کی سانس ہو تم

پھر کیسے نہ کہوں

میری جان ہو تم

(محمد انیسال جوہیہ۔ روٹھ تھل خوشاب)

دو کمروں پر مشتمل تھا اور ساتھ میں ایک کونے میں دواں روم غسل خانہ بنا ہوا تھا جبکہ آگے محن میں چھوٹا سا مین تھا محن کے درمیان میں ایک بڑا اور گھنا سا لوسٹرے کا درخت تھا۔ ہم میاں بیوی دونوں نے مل کر ایک کمرہ مہمانوں کے لئے سیٹ کیا تاکہ آنے جانے والے مہمان اس میں رہ سکیں اور دوسرا کمرہ ہم نے اپنے لئے رکھا پچھون تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا مگر پتا چڑھ سولہ دن کے بعد آصف نے ماشاء اللہ ایک ہول کھول لیا وہ 7 بجے جاتے اور دن کو 12 بج تک گھر آ جاتے تھے پھر اس کے بعد رات کو 8 بجے جاتے ہوئے پرسب نے ملازم کام کرتے تھے اس لئے آصف بس چکر وغیرہ لگا کر وہاں آ جاتے۔

میرے شوہر زیادہ تر کھانا گھر میں ہی کھاتے تھے کیوں کہ مجھے شروع سے ہی اچھے اچھے کھانے بنانے کا شوق تھا اس لئے میں گھر کے کاموں اور کھانے وغیرہ کا کام اچھے سے انجام دیتی تھی اور میرے شوہر جب بھی کھانا کھاتے کھلے دل سے تحریف کرتے تھے کیونکہ ہماری شادی 6 سال ہو چکے تھے۔ لوگ ہماری محبت کی مثال دیتے تھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔

اس دن آصف ہوٹل پر چلے گئے میں نے سارا کام ختم کیا بچوں کو کھانا کپڑے بدلے اور چھوٹے بیٹے کو دودھ کا فیڈر بنا کر دیا وہ سو گیا میں نے سوچا چلو آج آصف کی پسند کی چکن بریانی بنا دوں میری بیٹی بھی میرے ساتھ چکن میں آگئی۔

میں نے بریانی بنانی شروع کی جب بریانی بن گئی تو میں نے دم پر کھادی، میری بیٹی نے کہا ”ماما میں نے بکٹ کھانے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جاؤ بیٹا کمرے میں نیبل پر میں نے رکھے ہیں اٹھاؤ۔“

ٹھیک ہے ماما۔ ”وہ کہتی ہوئی چکن سے نکل گئی تو میں نے موٹا لٹھا یا اور اپنے شوہر کو کال کی اور پوچھا گھر کس نام آئیں گے۔“

”بس 20 منٹ صبر کرو آ رہا ہوں۔“ میں نے فون بند کیا اور جلدی جلدی راستہ بناتے گئی۔ راستہ

بنا کر میں نے ابھی رکھائی تھا کہ مجھے چکن سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت میری کمر کے پیچھے پیچھے پکاری ہو میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا میں نے آرام سے گیس بند کیا اور چلے سے بریانی اتاری۔ پھر وہی آواز ٹپ ٹپ ٹپ آئی شروع ہوئی میں نے گھبراتے ہوئے ایک بار پھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا اگر یہاں کوئی نہیں تو پھر آواز کس سے ابھی میں خوف کے مارے فکر کا پ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کس طرح چکن سے باہر جاؤں مگر میرے قدم پیسے جم گئے تھے۔

اتنے میں ایسے معلوم ہوا جیسے دو عورتیں آپس میں سرگوشی کر رہی ہوں پھر تو جانے کیسے مجھ میں اتنی ہمت آئی کہیں بھاگ کر چکن سے باہر نکل اور بھاگتے ہوئے سیدھی اپنے کمرے میں گئی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور پیسے سے میرا جسم تر ہو چکا تھا میں اتنی ڈر گئی کہ میری بیٹی نے مجھے آواز دی تو میری چیخ نکل گئی، میں تو پہلے سے ڈری ہوئی تھی اس کی اچانک آواز دینے پر مزید ڈر گئی اتنے میں باہر گیٹ (چکن کے ساتھ آگے گیٹ تھا چکن کے سامنے سے گزر کر گیٹ تک جانا پڑتا تھا) کھاول، دستک جب بار بار ہونے لگی تو میں نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے گیٹ تک گئی گیٹ کھولا تو سامنے آصف کھڑے تھے۔

”کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو کب سے دستک دے رہے ہو۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے نگر بندی سے بولے۔ ”نہن..... نہن..... نہیں کوئی بات نہیں.....“ میں نے گیٹ بند کیا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی جب وہ چکن کے بالکل سامنے گئے تو روک گئے۔

”واہ جی بڑے حے کی خوشبو آ رہی ہے..... لگا ہے تم نے بریانی بنائی ہے۔“ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں آنکھیں پھاڑے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو، کیا بات ہے بناؤ تم مجھے کافی پریشان لگ رہی ہو۔“

”..... وہ..... وہ..... آ..... ص..... ف..... وہ چکن میں کوئی ہے۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”کون ہے چکن میں۔“ اتنا کہ وہ چکن میں گئے وہاں کوئی نہ تھا۔

”یہاں تو کوئی نہیں۔“ ”آصف یہاں کوئی عورت تھی وہ روٹی بنا رہی تھی سرگوشی کر رہی تھی..... آصف مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے آصف کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”وہ مسکرانے لگے۔“ ”واہ میں اپنی پیاری بیوی کو بہت بہادر سمجھ رہا تھا مگر تم تو ڈر پوک ہو۔“ ایک بار پھر مسکرائے اور کہا۔

”یار دیکھ رات ہوئی تو پھر بھی میں مان لیتا کہ تم ڈر گئی ہو۔ ارے دن کے 12 بجے تم ڈر گئی اسی لئے کہتا ہوں کہ آرام کیا کر تم ہر وقت گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہو رات کو بھی بچے تمہیں نیند نہیں کرنے دیتے تمہیں آرام کی ضرورت ہے چلو کھانا کھاتے ہیں پھر تم آرام کرنا غور ہی رہو سو جاؤ گی تو اپنے آپ کو فریض محسوس کرو گی۔“ میں نے کہا۔ ”اسفند کب کا سو رہا ہے ابھی جاگ جائے گا پھر وہ کب سونے دے گا مجھے۔“

”ارے جان من تم بچوں کی فکر نہ کرو میں یہاں موجود ہوں بچوں کو دیکھ لوں گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلو پھر کھانا کھا لیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے تم کھانا نکالو میں منہ ہاتھ دھو لوں۔“ وہ دواں روم میں چلے گئے تو میں نے چکن میں جا کر کھانا نکالا تو اس وقت مجھے نہ کوئی آواز سنائی دی اور نہ میں ڈری۔ کیوں کہ اپنے شوہر کی باتوں سے مجھے کافی تسلی ہوئی تھی آصف منہ ہاتھ دھو کر وہاں آئے تو میں نے کمرے سے اپنی بیٹی کو بھی بلایا اور ہم کھانا کھانے لگے موسم تو گرمی کا تھا مگر چکن کے آگے محن میں جو درخت تھا اس کی ٹھنڈی ہوا سیدھی چکن میں آتی تھی۔ اس لئے ہم اکثر چکن میں ہی بیٹھ

کر کھانا کھالیتے تھے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میرے شوہر نے کہا۔ ”چلو اب تم آرام کرو۔“ ہم اندر کمرے میں آ گئے، میں بیڈ پر لیٹ گئی جب کہ شوہر سامنے چار پالی پر بیٹھے محن سے باتیں کرنے لگے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب مجھے نیند آ گئی جب میری آنکھ کھلی تو شام کے 5 بج رہے تھے میں اٹھ کر بیٹھ گئی میرے شوہر دونوں بچوں کو پاس بیٹھائے آکس کریم کھلا رہے تھے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”جاگ گئی.....“

میں نے کہا۔ ”ہی جاگ گئی۔“ تو بولے۔ ”تم سو رہی تھی محن آکس کریم مانگ رہی تھی تو میں نے باہر دکان سے لے دی۔ تمہارے لئے بھی لے آؤں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ بھی کھائیں گے۔“ ”ہاں میں بھی کھاؤں گا۔“ وہ باہر آکس کریم لینے گئے تو میں منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس وقت میں کافی فریض ہو چکی تھی میں نے دل میں سوچا کہ آصف صبح کہتے تھے کہ آرام نہ کرنے کی وجہ سے تمہیں یہ سب کچھ سنائی دیتا ہے۔ پھر میں نے محن کے فرش پر دیکھا تو دھیروں پتے گرے ہوئے تھے میں نے سوچا آصف ابھی نہیں آئے چلو جھاڑو لگا دوں میں نے جلدی جلدی جھاڑو لگائی سارے پتے اٹھا کر کچرے دان میں ڈال دیئے اور جھاڑو ایک سائیڈ پر رکھ دی۔

جب میں پیچھے مڑی تو پتے پہلے سے بھی زیادہ فرش پر دھیر لگ چکے تھے میں نے ایک بار پھر جھاڑو لی اور شروع ہوئی۔ لیکن تیسری بار تو فرش تم نظر آ رہا تھا اور پتے زیادہ، میں سوچنے لگی یا اللہ پہلے تو اتنے پتے نہیں گرتے تھے یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں آصف آ گئے ابھی میں کھڑی تھی درخت، محن فرش پر پڑے پتوں کو دیکھ رہی تھی کہ آصف نے پوچھا۔

”کیا ہوا کیوں ایسے کھڑی درخت کو گھورے جا رہی ہو۔“

میں نے کہا۔ ”دو بار جھاڑو لگائی لیکن یہ پتے۔“ انہوں نے میری بات کا ہنسے ہوئے کہا۔ ”چلو چلو



آئس کریم کھالو۔

لگے تو میں بھی ان کے ساتھ گئی لیکن میں جا کر دیکھا تو کانچ کا جگ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو چکا تھا اسے دیکھ کر تو میں نے رونا شروع کر دیا کیوں کہ پانی دلا جگ نیچے فرش پر گیس کے سلنڈر کے ساتھ ہی میں نے رکھا تھا تو پھر یہ کیسے ٹوٹ گیا جب کہ آواز تو ایسے آئی جیسے کوئی اور بے چیز نیچے کر ٹوٹی ہے میں نے روتے ہوئے آصف کو جب کے بارے میں بتایا تو آصف بھی پریشان ہو گئے۔

”یارت تم ٹھیک کہتی ہو جب تو ہم کھانا کھا کے گئے تو یہاں ہی ٹیس سلنڈر کے پاس رکھا ہوا تھا پھر یہ تو تاجیے اور یہ خون کیسا ہے، یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔“ ابھی ہم اسی بارے میں سوچ رہے تھے کہ میرے بیٹے اسفند کی زوردار چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں بھاگ کے باہر گئے تو اس کی گردن چارپائی سے نیچے لٹکی ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو اٹھایا آوازیں دینے لگی۔

”اسفند بیٹا آنکھیں کھولو۔“ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آصف یہ دیکھو میرے اسفند کو کیا ہو گیا ہے۔ آصف اس سے بولناں آنکھیں کھولے۔“ میں مسلسل روتے جاری تھی آصف نے مجھے تسلی دی۔ ”ہمارے بچے کو کچھ نہیں ہوگا چلو ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔“ جلدی سے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد اسے کچھ انجکشن لگائے اور پھر بولا۔

”یہ ساتھ والی مسجد میں قاری صادق صاحب ہوں گے ان سے دم کراؤ میرے خیال میں بچہ ڈر گیا ہے۔“ ہم دونوں جلدی سے باہر نکلے اسفند کو آصف نے اٹھایا ہوا تھا، میں نے غم کو، ابھی ہم مسجد کے باہر پہنچے تو فاروق کی کال آگئی۔

”یار آصف کدھر ہو تم تمہارے گھر کا ٹوٹ گئی بھی کھلا تھا اور دروازے بھی کھلے تھے کدھر گئے ہو آپ لوگ، کم از کم دروازے تو بند کر کے جاتے۔“

آصف نے کہا۔ ”یار اسفند کی طبیعت خراب ہے، اسے لے کر آتے ہیں۔“

میں بھی سر جھٹک کر ان کے ساتھ امداد آگئی۔ ہم نے آئس کریم کھائی اور بچوں کو لے کر باہر محن میں آ گئے کیونکہ شام ہو رہی تھی۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ہم نے درخت کے نیچے چارپائی بچھا دی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آصف کی نظر فرش پر پڑی تو وہ بولے۔

”یارت ویسے ٹھیک کہتی ہو بہت بچے گرتے ہیں۔ اچھا میں ایسا کرتا ہوں یہ جو شاخیں آگے کی طرف ہیں یہ زیادہ بکرا کرتی ہیں ان کو کاٹ دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں یہ آپ نے ٹھیک کہا کٹ دیں ان کو پھر اتنا بکرا بھی نہیں ہوگا۔“

انہوں نے کہا۔ ”تم یہ چارپائی ایک سائیڈ پر کرو میں اپنے دوست فاروق کے گھر سے آری لے آتا ہوں پھر کاٹوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ آری لے آئیں۔“ فاروق کا گھر بالکل ساتھ تھا وہ جلدی واپس آ گئے۔

پھر انہوں نے ایک شاخ کاٹی اور پھر جب دوسری شاخ کاٹنی شروع کی جو کہ کافی بڑی تھی آدھا محن اس سے ڈھکا ہوا تھا جو بنی شاخ کٹی تو شاخ کے نیچے گرتے ہی آصف کے سفید کاشن کے سوٹ پر خون کے قطرے نظر آنے لگے۔ میری خوف کے مارے چیخ نکلی گئی۔ آصف نے گھبرا کر میری طرف دیکھا تو میں قہر قہر کانپ رہی تھی انہوں نے آری اُدھر ہی بچھکی اور میرے پاس آئے۔

”کیا ہے۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”ارے کیا ہوا کچھ تو بتاؤ۔“ میں نے مشکل سے آواز نکالی وہ خو۔۔۔۔۔ خو۔۔۔۔۔ خو۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آپ کے کپڑوں پر۔“ انہوں نے جب اپنے کپڑے دیکھے تو جبکہ جب خون کے پھینٹے پڑے ہوئے نظر آئے۔

وہ بولے۔ ”یہ خون کدھر سے آ گیا۔“ وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دینے لگے۔ اتنے میں کچن سے کچھ چیز گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آصف کچن کی طرف بڑھتے

مستند ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین، طب ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت - 100 روپے

## ہیپاٹائٹس اور علاج

(کالہ ریقان)

پڑھئے ہیپاٹائٹس کیوں اور کیسے ہوتا ہے، جگر کی ساخت، جگر کا اہم کام، پوریا بننے کا عمل، ناکارہ خون کے ذرات، مفید عضو، ہیپاٹائٹس اور کینسر، جنسی علامات، مرض کی وجوہات، قدرتی نظام، گردوں کا عمل، ہیپاٹائٹس اے، اور ہیپاٹائٹس بی، ایلو پیٹھی اور ہومیو پیٹھی علاج، ہیپاٹائٹس کا طبی علاج، واقع درد جگر، نسخہ دافع ریقان، نسخہ آملہ، شربت انار، عرق کاسنی، نسخہ آب آبن تاب، خشک انجیر سے علاج، گردے کا درد، گردے کا ورم، جگر پر ورم، جگر میں گرمی، ریقان (پیلیا)، زیادہ پیشاب آنا، گردوں کے نقص، جگر میں ورم کے لئے، تلی کا رائے سے علاج، تلی بڑھنا، تلی کا ورم، آک سے ریقان کا علاج، امراض گردہ مثانہ کے چند نسخے، دن میں صرف دو بار کھائیے، دن میں آٹھ گلاس پانی پینا ضروری ہے، روزانہ پندرہ منٹ ورزش کریں، حفظان صحت کے 39 اصول، اور دیگر معلومات اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ بک ایجنسی  
نویڈاسکوٹ گریچی  
اردو بازار  
Ph: 32773302

”کیا ہوا اسفند کو رات کو میں آپ کے گھر گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا پھر اچانک کیا ہو گیا اسے۔“  
پھر آصف نے جلدی جلدی ساری تفصیل اسے بتائی تو اس نے کہا۔

”اس وقت کہاں ہو میں ابھی آتا ہوں۔“  
”بازار والی مسجد کے باہر کھڑا ہوں.....“ آصف نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

ہم مسجد میں گئے تو قاری صاحب نے اسفند کو دیکھا اور دم کرنے لگے اتنے میں فاروق بھی ہمارے پاس آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور پھر قاری صاحب سے پوچھنے لگا۔

تو قاری صاحب نے کہا۔ ”میں نے دم کر دیا ہے یہ ہوش میں آ جانے کا اور پانی دم کر کے دے دیتا ہوں اسے وقفہ وقفہ سے پلاتے رہتا۔“

اور پھر بولے۔ ”اگر آپ جس گھر میں رہتے ہو وہ چھوڑ دو تو اچھا ہوگا۔ آپ کا بچہ بری طرح سے ڈر گیا ہے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی۔“

ہم واپس گھر آئے تو آصف نے کہا۔

”فاروق تمہاری بھابی نے بھی مجھے بتایا تھا کہ کچن سے کچھ آوازیں آتی ہیں مگر میں نے سوچا شاید اس کا وہم ہے مگر اب پتہ چل گیا ہے یہ سچ کتنی تھی اس لئے ڈر کے مارے کا پ رہی تھی۔ اب میں اس گھر میں اپنے بیوی بچوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے فاروق تم کوئی اور گھر دیکھو

جلد از جلد۔ میں جب تک یہ گھر چھوڑ نہیں دیتا میں ان کے پاس گھر میں رہوں گا میں ان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

”ٹھیک ہے آصف میں دو دن کے اندر کوئی اور گھر دیکھ لوں گا۔“ فاروق نے ہامی بھری اتنے میں اسفند کو ہوش آ گیا لیکن اس کی آنکھیں ایسا تھیں کہ لال سرخ جیسے خون ہو، میں نے گھبرا کر آصف سے کہا اس کی آنکھوں کو کیا ہوا ذرا دیکھو آصف نے اشارہ کر کے مجھے

چپ کروادیا میں نے آصف سے لے کر اسفند کو اپنی گود میں لٹایا اور اس سے پوچھنے لگی۔

”میرا بیٹا کیا کھائے گا۔“ مگر وہ کچھ بول نہیں

رہا تھا بس صرف منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے جلدی سے اندر فرق سے جوں نکالا تو اس نے پیٹے سے انکار کر دیا میں بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی پھر آصف نے اسے دم کیا۔

ہو پانی زبردستی دو تین قطرے پلایا 10 منٹ کے بعد اس کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی۔ تو اس نے آدھا گلاس

جوں پی لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے اور آصف نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی تو فاروق نے اسے اٹھایا تو وہ اس کے پاس چلا گیا تو ہم نے تھوڑا سکون

محسوس کیا۔ فاروق بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا کیونکہ وہ ماشاء اللہ تھا ہی بہت خوب صورت صحت مند موٹی موٹی آنکھیں گول مثل چہرہ، وہ ایک سال کا نہیں لگتا تھا ایسا

معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی تین چار سال کا بچہ ہو۔ جب کہ میری بیٹی بھی بہت پیاری نازکی گڑھی تھی مگر وہ اس سے کئی گنا زیادہ خوب صورت تھا۔

میں پیار سے اسے خان شہزادہ کہتی تھی میری جان تھا وہ۔ پھر فاروق نے اسے میری گود میں دیا تو آصف نے کہا چلو فاروق ہم بائن خالی کرو پیٹیں کھانے پینے کا

سامان اندر کرے میں ایک سائیز پر رکھ لیں گے اب میں تمہاری بھابھی کو کچن میں کھانا نہیں بنانے دوں گا۔

فاروق نے کہا چلو میں تمہاری مدد کرتا ہوں دونوں نے سامان اٹھا کر اندر کر کے میں رکھ دیا۔

آصف نے مجھ سے کہا۔ ”بس دو دن کی بات ہے پھر کوئی اور گھر مل جائے گا ہم چلے جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”چلو بھابھی لاؤ اسفند کو میرے حوالے کر دو اور آپ اچھی سی چائے پلا دو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسفند کو فاروق کے حوالے کیا اور خود اندر کر کے میں جا کر چائے بنانے لگی۔ میں چائے بنا کر کپ میں ڈالنے لگی تو فاروق نے کہا۔ ”بھابی اسفند سو گیا ہے۔“ تو میں نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں ڈال دو میں چائے لے کر باہر آئی ہم نے چائے پی اور میں کپ

دھو کر اندر رکھنے لگی تو اسفند کے منہ سے آواز آ رہی تھی۔

جیسے کہ آہستہ آہستہ رو رہا ہو، میں جلدی سے

آگے بڑھی تو دیکھا اسفند چھت کو گھور رہا تھا اور آواز بھی نکال رہا تھا، میں نے اسے آواز دی۔ ”اسفند میرا

چاند کیا کر رہا ہے آج اپنی ماما کے پاس۔“ مگر اس نے میری طرف نہیں دیکھا بس چھت کو گھورتا رہا۔ میں نے

آصف کو جا کر بتایا تو وہ بھاگ کر آئے انہوں نے اسے اٹھایا بس اٹھانے کی دیر تھی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہم نے بہت کوشش کی کہ اسے چپ

کروانے کی مگر چپ نہ کر داسکے۔ وہ بار بار چھت کو گھورتا اور زور زور سے روتا۔

فاروق نے جلدی سے دم کیا ہو پانی اٹھایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور زبردستی پانی اس کے

منہ میں ڈالا، پانی ڈالنے کی دیر ہوئی کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور بخار سے اس کا جسم ایسے تپ رہا تھا کہ جیسے آگ ہو۔

میں اسے دیکھ کر رونے جاری تھی اور اپنے پیٹے کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔

فاروق نے کہا۔ ”آصف ایک پیر ہے جو ایسے کاموں کا ماہر ہے ہم کل اس کے پاس جائیں گے میرے

پاس اس کا فون نمبر بھی ہے میں تقریباً دو تین بار اس سے ملاقات کرچکا ہوں مجھے امید ہے اس کے پاس جانے سے اسفند ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں نے کہا فاروق تم اسے کال کرو۔ ہم ابھی اس کے گھر جائیں گے۔“ اس ٹائم رات کے نو بجتے والے تھے۔

فاروق نے کال کی اور ساری بات اس کو بتائی تو اس نے کہا۔ ”صبح 8 بجے سے پہلے تم اسے میرے پاس لے آنا۔ اور اس بچے کو ایک منٹ کے لئے بھی

اکیلا مت چھوڑنا۔“

”میں آپ کا کام ضرور کر دوں گا۔“

رات کے 12 بجے کا ٹائم تھا جب کچن کا دروازہ

کھلنے کی آواز آئی میں نے مڑ کر آصف کی طرف دیکھا

آصف نے کہا یہ تو بچن کے دروازے کی آواز ہے۔

پھر دوبارہ زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی ہم

کمرے کے دروازے میں جا کر کھڑے ہو گئے اتنے میں

درخت کے ساتھ مجھے کوئی سایہ سا دکھائی دیا۔

میں نے آصف سے کہا۔ ”وہ دیکھو درخت کے پاس کیا ہے۔“ آصف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا

اور میں بھی اندر چلنے کو کہا اور خود بھی اندر آ کر دروازہ بند کر دیا، میں بہت خوف زدہ تھی دل دھڑک رہا تھا ہم بیٹھ گئے

تو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہونے لگی جیسے کہ کوئی آرام آرام سے اٹکی سے دستک دے رہا ہو۔

”آصف نے کہا۔ ”تم بیٹھو میں دیکھتا ہوں کون ہے۔“

میں نے زور سے آصف کا ہاتھ پکڑ لیا اور رونا شروع کر دیا۔ ”آصف خدا کے لئے نہ جاؤ کوئی چیز ہوگی

آپ کو مار دے گی۔“ میں ہلک ہلک کرونے لگی تو آصف بیٹھ گئے چلو اب چپ کرو میں کھنک نہیں چارہا۔

اچانک دروازہ ہلکا شروع ہو گیا جیسے کہ زلزلہ آ گیا ہو ہم نے کلمہ پڑھنا شروع کیا کہ اچانک اسفند نے

جھجھکاری اور زلزلہ شروع ہو گیا وہ مسلسل چھت کو دیکھ کر زور زور سے رورہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”آصف اس کے

دودھ والا فیڈر مجھے اٹھا دو سامنے چار پانی پر رکھا ہے۔ میں اسے دودھ دوں۔“ آصف نے پورا کمرہ چھان مارا مگر

فیڈر نہ ملا۔

آخر کار تنگ آ کر میں نے گلاس میں دودھ ڈال کر اسے پلانے کی کوشش کی لیکن اس نے دودھ کا ایک

قطرہ نہیں پیا۔ میں بار بار اسے اپنے پیٹے سے لگاتی اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی مگر سب کچھ بیکار، وہ چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک میری طرف دیکھنے لگا

اس کی آنکھوں میں رو تھا جیسے کسی بہت بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔ میری طرف دیکھتے دیکھتے وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ میں نے جبکہ اسے پیار کیا تو کافی دیر

تک دیکھتا رہا، میں نے کہا۔ ”اسفند بیٹا اسفند بیٹا بولناں کیا ہوا ہے ماما کی جان کو۔“

اتنے میں اس کی ناک سے خون نکلا اور اس نے

زور کی سانس لی بس وہ اس کی آخری سانس تھی۔

میں نے کہا۔ ”آصف یہ دیکھو خون اسفند کی

ناک سے نکلا ہے۔“ آصف نے مجھ سے لے کر اسے غور سے دیکھا اور پھر اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

میں نے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں۔“  
اور آصف کے منہ سے جو کچھ نکلا وہ میری  
برداشت سے باہر تھا۔

”اسفند فوت ہو گیا۔“ پھر تو مجھے ہوش نہ رہا۔  
میری جینوں سے ساتھ والے ہسائے بھی دوڑے  
آئے فاروق کے گھر والے بھی آگئے سب مجھے چپ  
کروا رہے تھے سب مجھے دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے مگر میں  
اپنے بیٹے اسفند کو آوازیں دے رہی تھی۔ مگر اسے کوئی  
پرواہ نہ تھی آج نہ وہ جوں مانگ رہا تھا نہ دو وہ نہ آکس  
کریم، وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا گہری نیند سو رہا تھا۔  
آصف مجھے گلے لگا کر چپ کروا رہے تھے مگر میں کسی کی  
نہیں سن رہی تھی میں نے چار پائی سے اپنے بیٹے  
کو اکھا کر اپنی گود میں رکھا میں بار بار اس کے جسم کو چھو کر  
دیکھتی کیا بیٹہ میرا بیٹا ہے ہوش ہو۔

مٹھلی کی ایک عورت نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔  
”بیٹی حوصلہ رکھو خدا کی چیز تھی اس نے لے لی۔ اپنی بیٹی کو  
دیکھو وہ تمہیں دیکھ دیکھ کر رو رہی ہے۔“ میں نے دیکھا  
ثمن میرے پاس کھڑی رو رہی تھی اور ماں کھڑی تھی میں  
نے اسے گود میں اٹھایا بس اس کے بعد مجھے اپنا ہوش نہیں  
رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اسفند کے جانے کی تیاری  
ہو چکی تھی اسے غسل دے دیا گیا تھا میرے سر والے  
اور راولپنڈی سے میرے امی ابو سب آگئے تھے۔ ”بس  
نہیں رہا تو صرف میرا بیٹا میرا شہزادہ۔“

غسل کے بعد بیٹہ چلا کہ اسفند کی گردن پر نشان  
تھے جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ اور آنکھوں کے  
آگے کالے سیاہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے  
بعد سب اسے منوں مٹی تلے اکیلا چھوڑ کر واپس آگئے۔  
میرے امی ابو اور سرال والوں نے بہت اصرار کیا کہ  
چلو ہمارے ساتھ مگر میں اپنے بیٹے کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی  
تھی 5 دن کے بعد سب واپس چلے گئے۔

آصف میرا بچوں کی طرح خیال رکھتے۔ آصف  
نے بھی مجھے کہا چلو راولپنڈی چلے جاتے ہیں مگر میں نے  
انکار کر دیا کیوں کہ وہاں گھر کے ساتھ ہی میرے اسفند

کی قبر تھی میں اس سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔  
میرے بیٹے کو فوت ہوئے 10 مئی 1980 دن ہوئے  
تھے کہ میں واٹس روم سے باہر دو قدم آگے چلی کہ مجھے  
ایسا لگا جیسے میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے میں نے ڈر کر پیچھے  
دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں آگے چل پڑی ابھی میں  
نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرے  
کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میرے منہ سے خوف  
ناک چیخ نکلی اور میں دروازے میں ہی گر کر بے ہوش  
ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے بہت حیرت ہو رہی تھی لیکن  
میرے سامنے ایک بزرگ نورانی چہرہ لئے بیٹھے تھے  
انہوں نے پوچھا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے بیٹی۔“  
میں نے کہا۔ ”نیک ہوں بابا جی۔“

پھر فاروق نے تعارف کرایا کہ یہ پیر صاحب  
ہیں حسین احمد پھر مجھے علم ہو گیا یہ وہی پیر ہیں جن  
کو فاروق جانتا ہے انہوں نے پورے گھر کا جائزہ لیا  
اور پھر ثمن تعویذ بنائے ایک میرے لئے ایک میری بیٹی  
ثمن کے لئے ایک میرے شوہر آصف کے لئے۔ تعویذ  
دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”کسی بھی حال میں تعویذ  
گلے سے نہ لٹا لٹا انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔“ اور میری  
طرف دیکھ کر بولے۔ ”تعویذ پاس رکھو کی اس کے  
بعد تمہیں ڈر بھی نہیں لگے گا۔“

وہ چلے گئے ہم نے تعویذ گلے میں ڈال لئے۔ نہ  
کوئی واقعہ ہوا نہ آواز آئی اور ناں مجھے ڈر لگا تقریباً ایک  
ماہ کے بعد ہم نے قرآن پاک کا ختم کروایا کافی مہمان  
تھے ہمارے اپنے بھی آئے ہوئے تھے۔

ایک دن رہ کر جب سب واپس گئے تو میں گیٹ  
کے باہر کھڑی ان کو جاتا دیکھ رہی تھی جب وہ آنکھوں  
سے اوجھل ہوئے تو میں اور آصف واپس گیٹ سے اندر  
آنے والے تھے کہ ثمن کی چیخ کی آواز آئی۔ ہم پریشان  
ہو گئے ثمن ہمارے ساتھ باہر کھڑی تھی پھر اندر کب آئی  
ہم بھاگ کر اندر آئے تو ثمن درخت کے نیچے بے ہوش  
پڑی تھی پھر تو مجھے ہوش نہ رہا میں نے پاگلوں کی طرح  
رونا شروع کر دیا ایک بیٹا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب بیٹی بھی

ہاتھوں سے نکل رہی تھی آصف نے اسے اٹھایا  
اندر کمرے میں لے گئے۔ پھر فاروق کو کال کی تو اس  
نے پیر صاحب کو بلایا آدھے گھنٹے کے بعد پیر صاحب  
آگئے انہوں نے ثمن کی حالت دیکھی تو پریشان ہو گئے،  
میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”پیر صاحب میری  
بیٹی کو بچالیں خدا کے لئے۔“ میں رو رو کر ان کی منت  
کر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ ”کچھ نہیں ہوگا  
اب میں آگیا ہوں تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہونے دوں  
گا۔“ پھر انہوں نے ثمن کے گلے میں دیکھا تو تعویذ نہیں  
تھا۔ یعنی تعویذ غائب تھا انہوں نے باہر درخت کے نیچے  
چار پائی پر بیٹھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔

آصف ثمن کو لے کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔  
دو گھنٹے تک وہ پڑھتے رہے اچانک ثمن نے آنکھیں  
کھول دیں۔ تو پیر صاحب نے پوچھا۔ ”کیا چاہتی  
ہے تو۔“

ثمن نے بولنا شروع کر دیا ثمن کے اندر سے کسی  
اور عورت کی آواز آرہی تھی۔ ”میں سب کو مار دوں گی  
ان کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

پیر صاحب نے پوچھا۔ ”کیوں ایسا کر رہی ہے۔“  
اس نے کہا۔ ”اس بچن اور اس درخت پر ہمارا  
بمیرا ہے۔“ پھر بولی۔ ”اس نے درخت کا ٹاٹا اور ساتھ  
میرے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی میری دو بیٹیاں تھیں اور  
صرف ایک بیٹا تھا اس لئے میں نے ان کے بیٹے  
کو مار دیا۔ اب بیٹی کو بھی مار دوں گی پھر ان دونوں کو بھی  
زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

پیر صاحب نے کہا۔ ”تمہارا بیٹا کدھر تھا جب  
اس کی ٹانگ کٹی تو۔“

وہ بولی۔ ”درخت کے اوپر بیٹھا تھا۔“

”تمہارے بیٹے کی کتنی عمر ہے۔“

7 سال ہے۔ ”اب وہ چل نہیں سکتا۔“

پیر صاحب نے کہا۔ ”تو نے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دیا  
ان کے بیٹے کو مار کر لیا ہے اب ایسا کوئی کام نہ کرنا۔“

”کیوں نہ کروں گی۔“ پیر صاحب جو بات

کرتے وہ انکار کر دیتی۔

اس کی باتیں سن کر خوف کے مارے میرا ہر حال  
تھا میرا طلق خشک ہو چکا تھا میں مسلسل کانپ رہی تھی۔

پیر صاحب جب تھک گئے تو انہوں نے کچھ  
پڑھنا شروع کر دیا پھر جب پھونک ماری تو وہ چیختے لگی۔  
”مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔“

پیر صاحب نے کہا۔ ”اب تمہیں کبھی نہیں  
چھوڑوں گا۔“ وہ پیر صاحب کو خدا کا واسطہ دینے لگی۔  
”میں آج کے بعد کچھ نہیں کروں گی۔“

پیر صاحب نے اسے اس کے بچوں سمیت  
اپنے قبضے میں کر لیا۔

تو ثمن کو ہوش آ گیا وہ ابھی اور کہنے لگی۔

”پاپا آکس کریم کھاؤں گی۔“

میں نے اور میرے شوہر نے اس کی پیشانی  
چومی اسے سینے سے لگایا۔

پیر صاحب نے کہا۔ ”اب تم آرام سے  
رہو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ مگر میں نے کہا۔ ”اب میں اس  
گھر میں نہیں رہوں گی۔“ پھر ہم وہ گھر چھوڑ کر راولپنڈی  
آگئے کراہیہ کے مکان میں رہے پھر ایک سال کے بعد ہم  
نے اپنی جگہ لے لی اور اپنا ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر بنالیا  
پھر مجھے خدا نے ایک اور بیٹی عطا کی۔ جس کا نام ہم نے  
ایمان رکھا، یہ ہے میری بیٹی کیسی ہے بالکل میرے بیٹے  
اسفند کی طرح وہی خوب صورت چہرہ، وہی آنکھیں، اسی  
طرح صحت مند اب بھی مجھے اپنے خان شہزادے کی یاد  
آتی ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ پھر میں اپنی  
دوڑوں بیٹیوں کو سینے سے لگا لیتی ہوں۔

اور آپ کو پتہ ہے وہ پیارا سا بچہ کس کا تھا۔ وہ  
آپ کی اپنی بہن شازہ احوال کا بیٹا تھا۔ ”اس لئے میری  
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے بچوں کو سلامت رکھے۔  
آپ سے گزارش ہے کہ میری ثمن اور ایمان کے لئے بھی  
دعا کریں اللہ ان کو سلامت رکھے۔ آمین ثمن آمین۔“





# بلیک آئی لینڈ

شہزاد خان - صادق آباد

غیریت کا خوف سے چہرہ لبریز تھا، وہ گوشت کھانے میں اس قدر مصروف تھی کہ آسمان پر ٹھٹھانے والے ستارے بھی حیرت و استعجاب سے اسے دیکھ رہے تھے کہ اچانک.....

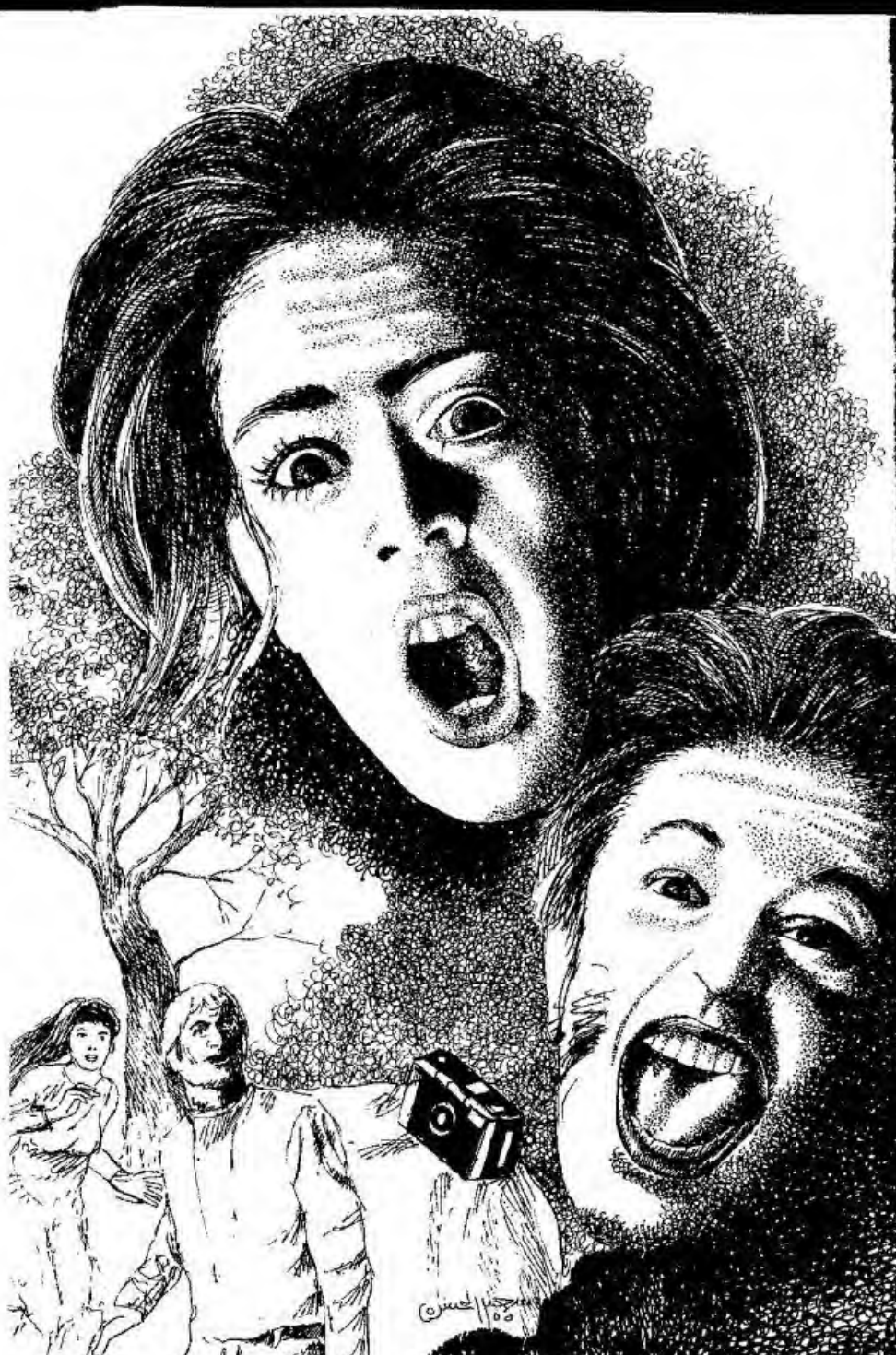
جسم دجاں پر پگھلی طاری کرتی اور رگوں میں خون ٹنڈ کرتی خوفناک اور ہولناک کہانی

**مئی 1985ء** کی ایک چمکدار صبح ہم لوگوں نے اپنا سفر شروع کیا تو ہم سب کے چہرے شجالی خوشی اور ایک بھرپور ایڈنڈر بھرے سفر سے لطف اندوز ہونے کے لئے تھمنا رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے عزیز واقارب اور بیوی بچوں سے ایک لمبے عرصے تک دور رہنے کا غم بھی ستارہا تھا۔ ہم سب جن میں میرے علاوہ میرے تین دوست اور ان کے ساتھ ساتھ چھ مزدور جنہیں ہم لوگوں نے بار برداری اور دوسرے کام کاج کے سلسلہ میں کچھ رقم دے کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا تھا۔ ہم چاروں دوست اپنے علاقے میں اچھے اور بہترین شکاری سمجھے جاتے تھے ہم نے اپنی زیادہ تر زندگی خوفناک جنگلوں میں خوشخوار دردندوں کا شکار کھیلنے گزاری تھی۔ شکار کے دوران کئی بار ہم موت کے منہ سے بچے تھے لیکن اس کے باوجود جان جو کھوں کا کام کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے تھے ایک روز باتوں ہی باتوں میں کسی دردناک جڑیرے پر جا کر شکار کھیلنے کا پروگرام بن گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک بڑی لالچ کے مالک کو بھاری رقم ادا کر کے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا اور کچھ ٹکڑے اور تجربہ کار مزدور بھی اس لالچ کے مالک کی مدد سے مل گئے۔

اور اس کے نتیجے میں اس روز ہم سب ایک بڑی سی

لالچ میں سوار ہو کر سمندر میں اپنے ان دیکھے سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ تلخ نگاہ سمندر کا نیلگوں پانی سفید سفید جھاگ اڑاتا شیشے کی مانند چمک رہا تھا اور اس میں سے مچھلیاں پکڑتے سفید سفید آبی پرندے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ لالچ میرے ایک دوست تیور علی کے ہاتھوں میں پانی پر اچھلتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم سب نے بھی لالچ چلانے کی ٹریننگ لے لی تھی کہ نجانے کیسے حالات سے سامنا کرنا پڑے یہ سوچ کر سب نے اچھی طرح اور ذمہ داری سے تربیت حاصل کر لی تھی تاکہ کسی ممکنہ حادثہ سے فوری طور پر بچا جاسکے اس کے ساتھ ساتھ ہم نے مزدوروں کو بھی تھوڑی بہت ٹریننگ دے دی تھی تاکہ وہ بھی اپنا شوق پورا کرتے رہیں۔

ہم سب خوش گپیوں میں مصروف تھے ہم نے کمر سے چلتے وقت اپنے سامان میں نقشہ، رسیوں کے بٹنل، گرم چادریں، چھریاں، چاقو، مٹی کے تیل کے کنسترو، ماچوں کے پیکٹ، کافی کی بوتلیں، نمک، مرچ غرض ضرورت کی ہر وہ چیز رکھ لی تھی جس کی ہمیں کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ کارٹوسوں کی بڑی بڑی پینیاں، رائفلیں اور ماڈرن وغیرہ اپنی ضرورت سے بھی زیادہ لالچ میں رکھ لئے تھے اس لئے ہم سب بے نگری سے سفر سے لطف



انداز ہو رہے تھے یوں محسوس ہوا ہاتھ جیسے ہم کسی پکنک پوائنٹ پر تفریح کی غرض سے جا رہے ہوں۔

نقشے کے مطابق ہم سب کی منزل سمندر میں موجود دور دراز کا ایک جزیرہ "بلیک آئی لینڈ" تھا۔ جس کے بارے میں ایک عام روایت تھی کہ یہ جزیرہ دنیا کے خوفناک ترین جزیروں میں سے ایک ہے۔ اس کے اندر آج تک کوئی شکاری یا سیاح نہیں جا سکا اور نہ ہی وہاں سے کسی قسم کی معلومات کوئی لاسکا۔ اس لئے یہ جزیرہ ابھی تک دنیا والوں کے لئے ایک سر بستہ راز ہی تھا ان لوگوں نے اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے انتخاب کیا تھا۔

شروع شروع میں جو بھی اس کا نام سننا اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ان چھ مزدوروں میں سے بھی چار مزدوروں نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر جب میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کافی ساری رقم کی جھلک دکھائی تو وہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہو ہی گئے۔ ہم نے ان مزدوروں کو کچھ معقول رقم پہلے ہی دے دی تھی تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو خبر دے دے۔ وہ سوچیں تاکہ انہیں بعد میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور اس سارے مرحلے کو بخوبی طے کرنے کے بعد ہم اپنے سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ اور بلیک آئی لینڈ کی جانب وہاں دوں تھے۔ اس دوران ہم سب نے باری باری لالچ کو چلایا تھا تاکہ دوسرے افراد بھی تھوڑا آرام کر سکیں اور تازہ دم رہیں۔ لیکن کرنے سے ہم سب کے چہروں پر بیہوشی تھی اور ہم آنے والے وقت سے بے خبر خوش گیلیوں میں مصروف تھے۔

شام کا چھٹپٹا ہوا سو پھیلنے لگا تھا آبی برتے قطاریں باندھے واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ آسمان پر کئی کئی آثار آوارہ بادل اٹھ لیا لیا کرتے پھر رہے تھے۔ سمندر کا پانی خاموش ہو گیا تھا اور غصے غصے سندرے آسمان پر ٹھٹھانے لگے تھے جن کے جھرمٹ میں چاند بھی کبھی کبھی اپنا روشن چہرہ نکال کر لالچ کے مسافروں کی طرف جھانک لیتا تھا۔ ہم سب نے ہلکا ہلکا کھانا کھا کر اپنے ہاتھوں میں چائے کے کپ قہام رکھے تھے آگ جلانے کے لئے ہم نے گیس سے چلنے والے چولہے کا بندوبست سب سے پہلے کیا تھا۔

تیسرے صاحب کیا خیال ہے ہم کب تک اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے؟ انضام احمد نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ اگر ہم بغیر رکے اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہے تو میرے خیال میں برسوں دوپہر تک ہم "بلیک آئی لینڈ" تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ تیسرے علی نے لالچ کا اسٹیرنگ گھماتے ہوئے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ لوگوں نے خواہوہ کیوں اس جزیرے کو منحوس اور آسیب زدہ مشہور کر رکھا ہے" میرے ایک دوست شان نے کندھے اچکاتے ہوئے لقمہ دیا۔ "انگو رکھنے ہیں دوستو! جو لوگ کسی کام کو سر انجام نہیں دے سکتے وہ ایسی ہی بے سود باتیں کر کے خود کو دھوکا دیتے ہیں۔" تیسرے علی نے جواب کیا۔

"بانی اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اس کا تو وہاں چل کر ہی پتہ چلے گا اس لئے جب تک ہم وہاں پہنچ نہیں جاتے اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنا فضول ہے۔" میں نے بھی دغل در معقولیات دیتے ہوئے کہا۔ اسی قسم کی ہنسی اور ہلکا ہلکا مذاق کرتے ہوئے ہم سمندر میں آگے کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔

ہمارے پاس فیڈل کا اسٹاک تھا اس لئے اس کی طرف سے تو ہم بالکل بے فکر تھے باقی خوراک کی طرف سے بھی ہم نے ہاتھ کھلا رکھا تھا اور ضرورت سے زیادہ ہی خوراک اسٹور کی تھی کہ نجانے کتنے روز ہمیں جزیرے پر رہنا پڑے۔ اور کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔

رات کے وقت سمندر کے پانی پر چاند کی سفید چاندنی بہت بھلی لگ رہی تھی رات دھیرے دھیرے اپنا سفر جاری رکھے اجالے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تیسرے علی نے لالچ کا اسٹیرنگ ایک مزدور کو تھا کہ کچھ ہدایات دیں اور خود ایک طرف بے کیبن کی جانب بڑھ گیا۔ ہم دیگر دوست پہلے ہی کیبن میں بچے ہوئے موٹے موٹے گدوں کے بستروں پر براہِ جان تھے اور آنے والے حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ تیسرے علی بھی ایک خالی بستر دیکھ کر ان پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر وہ بھی ہمارے ساتھ ہماری باتوں میں شامل ہو گیا اور باتیں کرتے کرتے ہم نیند کی آغوش میں کھو گئے۔

صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو سورج کافی نکل چکا تھا اور لالچ سمندر کے پر شور پانی پر اچھلتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم نے نقشے اور کپاس کے حساب سے دیکھا تو ہم اپنی منزل سے ایک دن کی دوری پر تھے۔ ہم نے باری باری ناشتہ کیا اور مزدوروں سے رات کے سفر کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ساری رات باری باری لالچ کو چلاتے رہے تھے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میں نے ایک مزدور کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ پکڑا اور اسے ناشتہ کرنے کا کہہ کر لالچ کی رفتار بڑھا دی۔

لالچ ایک جھٹکا لیتے ہوئے پانی کی لہروں پر اچھلی اور بندوق کی گولی کی مانند اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ابھی ہمیں سفر کرتے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ پانی کی لہروں میں کچھ کچھ حرکت ہونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لہروں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ لالچ پانی پر ڈولنے لگی اور اس کا اسٹیرنگ میرے ہاتھوں سے نکلنے لگا جسے میں نے مضبوطی سے قہام رکھا تھا مگر اس کے باوجود میرے ہاتھ اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ لہروں کے پر زور شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی ہم سب نے چیخے ہوئے ایک دوسرے کو قہام رکھا تھا اور پھر تیسرے علی کی ہدایات پر مزدوروں نے لالچ پر سے وزن کم کرنے کے لئے اپنا قاتلو سامان اٹھا اٹھا کر سمندر کے پانی میں پھینکنا شروع کر دیا کہ شاید وزن ہلکا ہونے سے لالچ کے اٹلنے کا خطرہ کم ہو سکے مگر موجوں نے اسے مزید اور جھٹک دینے شروع کر دیے۔

میں نے چیخے ہوئے انضام احمد کو آواز دی کہ کونکہ مجھ سے اب لالچ کا اسٹیرنگ کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا تھا اور میرے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ انضام احمد نے آہستہ آہستہ میرے قریب آن کر مجھ سے اسٹیرنگ لے لیا اور لالچ اسی رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کے چلنے کے انداز میں فرق آ گیا تھا پہلے وہ پرسکون انداز میں آگے بڑھ رہی تھی مگر اب وہ مینڈک کی طرح اچھلتی کودتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمیں اس انداز میں سفر کرتے مسلسل دو گھنٹے ہو گئے تھے مگر ان دو گھنٹوں کو ہم نے کس لذت سے گزرا تھا یہ ہم یا

ہمارا خدا ہی جانتا تھا۔

لالچ کے مسلسل جھٹکوں نے ہم سب کے جسموں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ہمارا انگ انگ درد سے ترپ رہا تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں ہمیں کم ہونا شروع ہو گئیں اور پھر یکدم سمندر کا پانی یوں ساکت اور پرسکون ہو گیا جیسے کسی اس میں طغیانی آئی ہی نہ ہو۔ سمندر کے پرسکون ہوتے ہی ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سورج اب ہمارے تین سروں پر آ گیا تھا اور ہمیں اب بھوک نے بھی ستانا شروع کر دیا تھا۔ ہم نے مزدوروں سے کہہ کر کھانا تیار کروایا اور پھر میرے ہو کر کھایا۔ موجوں سے لڑنے کی وجہ سے ہمیں بھوک بھی بہت لگی تھی اس لئے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانا کھا کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔

صبح سویرے ہم اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے اس لئے ہم وہاں تازہ دم ہو کر جانا چاہتے تھے جزیرے کے متعلق سننے والی عجیب و غریب باتیں اور قصے ہمارے ذہنوں میں گونج رہے تھے اور ہمارے دلوں کی جھڑکیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ لالچ اپنی پوری رفتار سے سمندر کے پانی پر اچھلتی بھاگی ہوئی جا رہی تھی کہ چانک پل محسوس ہوا جیسے وہ کسی بہنور میں پھنس گئی ہو اور پھر تیزی سے گھومتے لگی۔ لالچ میں موجود دوسرے افراد پریشانی کی کیفیت میں کھڑے سمندر کے پانی کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ "کیا ہوا یہ لالچ کو چکر کیوں آ رہے ہیں؟" شان نے قریب آ کر پوچھا۔

"میرے خیال میں ہم شاکر مچھلیوں کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں کیونکہ آپ لوگوں سے ملنے سے پہلے میں ایک بحری جہاز میں ملازمت کرتا تھا اور اکثر و بیشتر میں ان حالات سے واسطہ پڑتا رہا تھا اس لئے لالچ کو جس طرح کے جھٹکے لگ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں شاکر مچھلیوں کی بہتات ہے اس میں زیادہ گھبرانے والی بات نہیں ہے کیونکہ جب تک شاکر مچھلیوں کو تنگ نہ کیا جائے اس وقت تک یہ کچھ نہیں کہتی ہیں۔ ہاں اگر ان پر حملہ کرنے میں ہم باہل کریں گے اور اس کے نتیجے میں اگر ان میں سے کوئی زخمی ہو جائے تو پھر ہمیں ان کا لقمہ بننے



سے کوئی نہیں بچا سکتا ان سے بچاؤ کا کوئی طریقہ ہے کہ خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھا جائے اور کسی نہ کسی طریقے سے لالچ کو اس علاقے سے فوراً دور لایا جائے۔ ایک مزدور نے تمام تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات سننے ہی پر فوراً لالچ کو کنٹرول کرتے ہوئے حضور سے نکالا اور اس کی رفتار تیز کر دی۔

لالچ نے ایک جھوٹا لالچ اور میڈیک کی مانند اچھلتی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں ہم اس علاقے سے بہت دور نکل آئے۔ مسلسل چار پانچ گھنٹوں تک سفر کرنے کے بعد ہمیں دور بہت دور ایک سیاہ کیر کی نظر آئی ہم سمجھ گئے کہ یہ سیاہ کیر ہی "بلیک آئی لینڈ" ہے یہ دیکھ کر ہم سب نے ضروری سامان ایک ترتیب سے ایک جانب رکھنا شروع کر دیا ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ صرف وہی سامان جزیرے پر لے جایا جائے جس کی ہمیں اشد ضرورت پڑے گی تا تو سامان لیجانے سے خوفناک ادا سے سنبھلنا پڑتا۔

جوں جوں ہم اس کیر کی جانب بڑھتے جا رہے تھے تو ان لوگوں اس سیاہ لکیر کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سیاہ لکیر نے ایک وسیع جزیرے کی شکل اختیار کر لی۔ جزیرے کی سر زمین پر درختوں کی قطاریں دور سے ہی دکھائی دینے لگی تھیں۔ دور سے وہ ایک گھٹا اور گنجان نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لالچ نے جزیرے کی سر زمین کو چھوا اور جھوکا کھاتے ہوئے رک گئی۔ تیسوڑی نے جزیرے کے نزدیک پہنچنے ہی اس کی رفتار کم کر دی تھی اس لئے وہ پانی پر تیرتی ہوئی جزیرے کی زمین سے ٹکرا کر رک گئی۔ بعد میں اس نے لالچ کا انجن بند کر کے چابی مری جانب اچھل دی جسے میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بے خیالی میں اپنی پتلون کی سائیز والی جیب میں ڈال لیا۔ ہم نے پہلے تمام مزدوروں کو نیچے اتارا اور پھر سامان اٹھا کر انہیں پکڑانے لگے جسے وہ زمین پر ایک طرف رکھنے لگے۔

سارا ضروری سامان اتار کر ہم بھی لالچ سے نیچے آ گئے اور بڑے غور سے جزیرے کو دیکھنے لگے۔ جزیرے پر ایک پراسرادی خاموشی طاری ہوئی میں لگتا تھا جیسے صدیوں سے کوئی انسان اس طرف نہ آیا ہو۔ حتیٰ کہ کہیں سے کسی چند

پرند یا کسی درندے کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی شاید ایسا شام کا جھپٹا چھا جانے کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہو۔ پھر کچھ دیر میں ہم نے آپس میں فیصلہ کر کے رات میں ساحل سمندر پر بسر کرنے کے ارادے سے سامان میں سے مضبوط کپڑے کے خیمے لکائے جنہیں مزدوروں نے بڑی مہارت اور چالاکیت سے ساحل کی ریت پر کھونے کا ڈر لگا دیا۔ ہم نے اپنے ساتھ سفری بستر بھی لائے تھے وہ بھی انہوں نے جھٹ پٹ خیموں میں لگا دیے۔ پھر اطمینان سے رات کا کھانا کھایا اور سونے سے پہلے ہم نے احتیاط کے پیش نظر باری باری پہرہ دینے کی ڈیوٹیوں لگا دی تھیں تاکہ کسی ممکنہ خطرے سے فوری طور پر بچنا جاسکے۔

ہم چونکہ دس افراد تھے اس لئے ہم نے دو دو افراد کی ٹولیاں بنالیں اور ہر ٹولی کے ذمے دو گھنٹے جاگ کر پہرہ دینے کی ڈیوٹی لگائی اور اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی کہ ہر ٹولی کے افراد انتہائی چالاکیت اور ذمہ داری سے پہرہ دیں گے۔ اس کے باوجود کہ جزیرے پر ہمیں کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دی تھی لیکن پھر بھی ہم نے پہرہ دینے کے کام کو اہم جانا تھا۔ باری کے مطابق پہلی ٹولی میں دو مزدور ہاتھوں میں رافٹیں لے کر خیمے سے ذرا بہت دُور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے تھے اور ہم آرام کرنے کی غرض سے اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

چاند ایک بجے کے گولے کی مانند آسمان پر چمک رہا تھا ستارے سب سے سببے انداز میں زمین پر اس جانب دیکھ رہے تھے جس طرف ایک عجیب و غریب مخلوق اپنے بے ڈھنگے جسم کے ساتھ لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب بڑھتی جا رہی تھی اس کے لڑھکنے کے انداز کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے تیل کا ڈرم زمین پر لڑھکتا جا رہا ہو۔ یہ "چومنگٹا" تھی اس خوفناک اور کالے جزیرے کی انتہائی خطرناک مخلوق اس کے جسم پر بھورے رنگ کے گھنے بال تھے جو سر کنڈوں کی مانند لکڑی کے تھے اور اس کے پنجوں کی چھ چھ انگلیاں تھیں جن کے نشان اپنی لمبائی کی وجہ سے آگے سے کسی قدر مڑ گئے تھے اور اس کا چہرہ کینگر وکی شکل جیسا تھا اور ناک چوڑا اور انتہائی بھدا تھا اس کے جھروں کا گوشت منہ

کے دونوں اطراف سے باہر کی جانب نکلا ہوا تھا اور اس کے سائیڈوں سے لٹکے ہوئے پہلے پہلے دانت اس کی ٹھوڑی تک جمبول رہے تھے۔ اس کے چلنے کا انداز قدرتی طور پر لڑھکنے جیسا تھا اور ایک نظر میں وہ ایک گولے کی مانند ہی دکھائی دیتی تھی وہ تیزی سے لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب جا رہی تھی جیسے کوئی دور بیٹھا اسے ریوٹ کنٹرول سے چار رہا ہو۔

چاند آسمان پر دھیرے دھیرے اپنے سفر میں مصروف تھا۔ دونوں مزدور ہاتھوں میں پکڑی رافٹیں پتھر کے سہارے لگا کر باتوں میں مصروف تھے اور اپنے ہمسایہ کے انجام سے بے خبر اس جزیرے کی پراسراریت کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بیوقوفی اور توہم پرستی پر بھی ہنس رہے تھے جنہوں نے اس خوبصورت جزیرے کے متعلق خواہناؤ کی بے سرو پا اور جھوٹی باتیں پھیلا رکھی تھیں حالانکہ جب سے وہ لوگ اس جزیرے پر پہنچے تھے ابھی تک انہیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی تھی جسے دیکھ کر انہیں ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی باتوں کا یقین نہ ہوتا۔

ساتھ ساتھ وہ اس پہلو پر بھی غور کر رہے تھے کہ شاید بڑی قزاقوں نے یہاں کوئی خزانہ دفن کر رکھا ہو اور اسے محفوظ کرنے کے لئے اس قسم کی جھوٹی خبریں پھیلا دی ہوں تاکہ کوئی اس جزیرے پر آن کر ان کے خزانے کو حاصل نہ کر سکے۔ جزیرے پر ایک سکون کی سی کیفیت طاری تھی کہیں کہیں سے کسی چھتھر کے بولنے کی آواز سنائی دیتی تو ہل بھر کے لئے خاموشی کا طغیانیہ اور پھر وہی مسمیہ خاموشی چھا جاتی۔ ایک مزدور جو سامنے کے رخ بیٹھا جزیرے کے درختوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

اچانک باتیں کرتے کرتے اس کا منہ کھلے کھلا کھلا ہی رہ گیا اور اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹی رہ گئیں اس کی نظریں اس عجیب و غریب شے پر پڑی ہوئی تھیں جو ایک ڈرم کی طرح لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب ہی آ رہی تھی پہلے تو وہ اسے ایک خالی ڈرم ہی سمجھا مگر جب آٹا فانا وہ چیز ان کے نزدیک پہنچ کر ایک دم اچھل کر کھڑی ہوئی تو خوف و دہشت سے ان کے منہ سے جھپٹیں نکل گئیں۔ ان

کے سامنے ایک عجیب الخلقت شے تھی جس کی طرف دیکھتے ہی ان دونوں کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

خوف سے انہیں اپنے نزدیک رکھی بندوبست تک اٹھانے کا خیال نہ آیا۔ انہوں نے بھانسنے کے لئے قدم اٹھانے کا خیال نہ کیا۔ مگر ان کے قدموں نے تو زمین کو یوں ہتھامیا تھا جیسے کوئی مقناطیس لوہے کو پکڑتا ہے۔ ان کے چپٹے چلانے سے جزیرے کی خاموش فضا میں ان کی آوازوں کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی اور ان کے ٹکڑے چپٹے سے درختوں پر بیٹھے سینکڑوں پرندے سانس پر پکڑ پکڑاتے ہوئے باہر نکل کر آسمان پر اڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی خیموں میں سوائے ہوئے ہم لوگ بھی گھبرا کر باہر نکل آئے اور ہم نے بڑبڑاتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے حقیقت جانتا چاہی تو ہماری نگاہیں وہی حالت ہو گئی جو اس سے پہلے دیگر مزدوروں کی ہوئی تھی۔

ابھی ہم اپنے بچاؤ کی کوئی صورت سوچ ہی رہے تھے کہ اس بلا کا داؤ چل گیا اور اس نے اپنے نزدیک کھڑے ایک مزدور کے چہرے پر اپنا بھاری چھڑوے مار چھڑ گئے۔ ہی مزدور جو سکتے ہی اس حالت میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اچھل کر دوڑ جا کر اور یہ دیکھ کر وہ گریباں کی چپٹیں نکل گئیں کہ چھڑوے والے مزدور کا چھڑوہ سر علیحدہ علیحدہ جا کرے تھے یہ دیکھ کر سب نے اس عجیب و غریب بلا کی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

ہم نے دوڑ کر خیموں سے اپنی بندوبست نکالیں اور ان کا رخ اس بلا کی جانب موڑ کر گولیاں برسانا شروع کر دیں مگر اس سے پہلے کہ گولیاں اس بلا کے جسم کو چھوئیں اس بلا نے ایک لمبی چمٹا لگائی اور زمین پر گرے ہی اس کا جسم تیزی سے ایک لینڈنگ شکل میں تبدیل ہو گیا اور وہ توپ کے گولے کی مانند زمین پر لڑھکتی ہوئی ہماری جانب بڑھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ہم تیزی سے دائیں جانب ہو گئے۔ وہ تیزی سے آگے نکل گئی اور کچھ دور جا کر اس نے اپنا رخ بدلا اور بارہا ہماری طرف بڑھی۔

یہ دیکھ کر ہم نے دوبارہ اس پر گولیوں کی بارش کر دی مگر اس سے پہلے کہ گولیاں اس کے جسم کو چھوئیں وہ



کسی کوئی کی مانند ہمارے جسموں سے انگریزی ہم نے اپنے بچاؤ کی بھرپور کوشش کی مگر اس کے جسم کے شدید جھٹکے سے ہم سب اچھل کر دوڑ جا کرے اور بندھیں ہمارے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ ہمیں نیچے کرتے دیکھ کر وہ یکدم اچھل کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے ایک مزدور کو ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اس کے بالوں کو پکڑ کر ایک دھڑا دھڑکا دیا تو اس کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ ہو گیا اور اس میں سے نکلنے والی نسیں اور رگیں ہوا میں لہرائیں لگیں اور دھڑ ایک جانب جا کر اور زمین پر اس کے جسم کا خون تیزی سے پھیلنے لگا۔

اپنے ساتھی کا یہ بھیاں تک انجام دیکھ کر ہم سب کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا اور ہمیں اس جزیرے کے متعلق پچھلی ہوئی آئینی باتوں پر یقین آ گیا ہم اس وقت کوکوس رہے تھے جب ہم نے اس شخص جزیرے پر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے دوڑ کر دوبارہ اپنی بندھنوں کو اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اب وہ بلا ہمیں اس بات کا موقع کہاں دینے لگی تھی اس نے دوبارہ اچھل کر ایک اور ساتھی کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا یا مگر اب ہم سب ہوشیار ہو گئے تھے اس لئے ہم نے اوپر اوپر ہو کر خود کو اس کے حملے سے بچایا۔

مگر پھر بھی ایک بد قسمت مزدور اس کی گرفت میں آ ہی گیا جسے اس مخلوق نے جلدی سے پکڑ کر ایک بھرپور چھڑ اس کے چہرے پر دے مارا اور اس کے چہرے پر چھڑیوں پڑا جیسے کسی نا بد وقت نے اسے لوہے کا گردے مارا ہوا اس کا دایاں گال پھٹ گیا اور اس کی کھال ایک جانب الٹ گئی تھی وہ چیخا ہوا ایک جانب بھاگا مگر وہ اس کی چوٹوں سے بے نیاز اسے اپنی جانب ٹھٹھنے لگی اور اپنے قریب آتے ہی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر مخالف سمت میں کھینچ دیا یہ دیکھ کر خوف سے ہماری چیخیں نکل گئیں کیونکہ ایک زندہ شخص ہمارے سامنے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

ہم نے لرزے جسموں کے ساتھ اس طرف دوڑ لگا دی جہاں ہماری لالچ کھڑی تھی یہ تو شکر تھا کہ ہم نے اس کو مضبوطی کے ساتھ رسی سے نہیں باندھا تھا اس لئے اس کے نزدیک پہنچے ہی ہم سب اچھل اچھل کر اس میں سوار ہونے لگے میں نے جلدی سے جب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالنا

اس وقت جاگے جب سورج کی کرنیں لالچ کے عرشے پر پھیلنے لگی تھیں پہلے تو ہم بے خیالی میں آرام سے لیٹے سورج کو نکتے سے پھر جیسے ہی ہمیں رات والی خوفناک بلا اور وہ

خونی منظر یاد آیا ہم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور تیزی سے جزیرے کی طرف نظریں دوڑائیں تو ہمیں وہاں پھیلی ہوئی ہریالی نظر آئی جو کہ کل رات اندیرا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ جا بجا پھیلے ہوئے عجیب و غریب قسم کے عنابی اور پیلے پھول بھی دکھائی نہیں دیئے تھے جن کا سائز ایک پیالے جتنا بڑا تھا اور ان کا رنگ اوپر کی بجائے زمین کی طرف تھا یہ کم دیش چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور بچانے ان میں سے کون سی بھین بھین خوشبو نکل رہی تھی کہ اس کا احساس ہمیں اتنے فاصلے سے بھی بخوبی ہوا تھا اس کے فوراً بعد ہم نے جزیرے کے چاروں طرف بھی غور سے دیکھا شروع کر دیا کہ کہیں وہ عفریت دوبارہ ہماری تاک میں نہ چھپی ہو تھی مگر کافور دور تک دیکھنے کے باوجود بھی وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

ہم نے ہلکا بھلکا ناشتہ کیا اور پھر باقی بچ جانے والے مزدوروں کے ساتھ مل کر لالچ کو حیل کر دو بارہ ساحل تک لے آئے اور ایک رسی کی مدد سے قریب کے ایک درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا کہ کہیں لالچ کی مکمل جانے کی وجہ سے گھرے پانی میں نہ چلی جائے۔ ہماری رائیلس ابھی تک وہیں پڑی تھیں اور نیچے بھی اسی طرح اترنا وہ تھے اس بلا کا شکار ہونے والے ہمارے دونوں ساتھیوں کا بچا کھچا گوشت لگڑ لگڑ کھا گئے تھے اور اب وہاں صرف ہڈیوں کے کڑھانچے ہی بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے اپنی رائیلس قابو کیں اور پھر خیمہ اٹھا کر ان کو لینا اور احتیاط سے لالچ میں رکھوایا اور رائیلس ہاتھوں میں تھام کر جزیرے کے اندر داخل ہو گئے ہم نے چاروں مزدوروں کو اپنے اوپر نظریں جمائے رکھنے کا کہہ دیا تھا ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا دوبارہ نہ حملہ آور ہو جائے اس مانند میں ہم آگے بڑھتے جزیرے کے اندر داخل ہو گئے۔

جزیرے میں درختوں کی بہتات تھی اور جنگلی جھاڑیاں جبکہ راستے میں نظر آئیں گھبان درختوں کی وجہ

سے زمین پر اندر چڑھا ہوا تھا اب جیسے ہی ہم جزیرے کے اندر داخل ہوئے تو ہمیں اس میں پھرنے والے جنگلی جانور اور وحشت الارض بھی نظر آنے لگے۔

بڑا عجیب اور پراسرار جزیرہ تھا جس میں سرخ رنگ کے جانور کافی مقدار میں دکھائی دے رہے تھے وہ اپنی نخی نخی آنکھوں سے جھاڑیوں میں چھپے ہماری طرف دیکھ رہے تھے ان کا جسم خرگوش کی مانند اور چہرہ لی جیسا تھا ہم نے ایسے جانور پہلے ہی نہیں دیکھے تھے۔

ابھی ہم آپس میں باتیں کرتے اور لہو لہو دیکھتے تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ جزیرے کی زمین یوں ہلنے لگی جیسے کوئی دیوانہ مخلوق اس کو روندتی چلی آ رہی ہو ہمارے خوف سے رنگ فق ہو گئے ابھی ہم اپنے بچاؤ کی کوئی صورت سوچ ہی رہے تھے۔

اچانک ہمارے سروں پر موجود درختوں میں ہلچل ہوئی اور زمین پر یکدم تیز روئی پھیل گئی اور یہ دیکھ کر ہماری وحشت سے چیخیں نکل گئیں کہ ایک ڈائنوسارسل کا جانور اپنی اونٹ جیسی تھوڑی درختوں سے نکلے ہمارے سروں پر موجود تھا اس کا سر درختوں کے اندر آنے سے سورج کی روشنی زمین پر پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے دن کا سا جنگل کے اندر تک پھیل گیا تھا ہم نے اسے دیکھتے ہی ایک جانب دوڑ لگا دی ابھی ہم دس قدم ہی بھاگے ہوں گے کہ یکدم ہمارے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی اور ہم چیختے چلاتے ہوئے سر کے بل ایک گہرے کنوئیں میں گرے چلے گئے۔

یہ شام کے تقریباً پانچ بجے کا وقت ہوا جب چھ جنگلی ہاتھوں میں بھالے تھامے نکلے ہاتھوں جنگل میں یوں چلے جا رہے تھے جیسے وہ کانٹوں پر نہیں بلکہ کسی قالین پر چل رہے ہوں ان کے سروں پر کسی جانور کی اترنیوں کی بنی ہوئی رسیاں بندھی تھیں جن میں رنگ برنگے پٹے پڑے ہوئے تھے گالوں کو سفید رنگ سے رنگا ہوا تھا کالے چہروں پر سفید سفید دانت اور ٹھوڑیاں قدرے لمبی تھیں۔

چلنے کے ساتھ ساتھ وہ آپس میں ایک غیر مانوس زبان میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان میں سے کسی کے ہنسنے کی آواز بھی سنائی دے

جانی تھی۔ یہ سب "ہناوہنگو" قبیلے کے آنکڑوڑے جنہوں نے جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے لئے جنگل کے وسط میں ایک بہت بڑا اور گہرا کنواں کھود کر اسے جنگلی جھاڑیوں سے ڈھانپ رکھا تھا جس میں آنکڑوڑے جنگلی جانور بے دھیانی میں گر جاتے جنہیں بعد میں یہ لوگ نکال کر اپنی خوراک کے طور پر استعمال کرتے اس کے لئے وہ دوسرے تیسرے روز اپنی اپنی باری کے مطابق چکر لگاتے اور ایسا بھی بکھار ہی ہوتا تھا کہ انہیں مایوس لوٹنا پڑتا اور نہ زیادہ تر وہ شکار لے کر ہی واپس قبیلے میں لوٹتے۔

آج یہ چھ افراد اپنی باری کے مطابق خوراک کی تلاش میں جنگل کی جانب بڑھ رہے تھے اور انہیں اس بات کا پکا یقین تھا کہ اس بار بھی وہ ناکام نہیں لوٹیں گے۔

گڑھے میں گرے ہی، ہم سب ریت کی خالی ہوتی ہوئی بوریلوں کی مانند ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہوتے چلے گئے اندر کی زمین نرم ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی گہری چوٹ نہیں آئی یوں لگ رہا تھا جیسے گڑھے میں بارش کا پانی جمع ہونے کی وجہ سے زمین گیلی ہو رہی تھی۔ گڑھے کی گہرائی کم و بیش بارہ فٹ کے قریب تھی اور اس کی چوڑائی تقریباً چودہ فٹ کے نزدیک ہوئی۔ انہوں نے کچھ دیر بیٹھ کر اپنی سانسوں کو بحال کیا پھر گڑھے سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگے زمین پر جا بجا چھوٹی بڑی لکڑیاں بھی مٹھری پڑی تھیں جو جانوروں کے گرنے کے ساتھ ہی شاید نیچے گہری ہوں گی۔ تیسوڑی ایک ڈیڑھ فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی لکڑی اٹھا کر اس کی ٹوک سے گڑھے کی دیوار میں ایک سوراخ بنانے کا تقرباً چار انچ گہرا اور چوڑا سوراخ آسانی سے بن گیا دیوار پر چونکہ نرم تھیں اس لئے انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑی۔ یہ دیکھ کر ایک مزدور زمین پر جھک کر بیٹھ گیا جسے دیکھ کر تیسوڑی اس کی پیٹھ پر چڑھ کر مزید سوراخ نکالنے لگا وہ ایک ایک فٹ کے فاصلے سے سوراخ نکالتا جا رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں اس نے تین سوراخ نکال لئے اب مزدور اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور تیسوڑی اس کے کندھوں پر کھڑا مزید سوراخ نکالنے لگا اور مسلسل آدھا گھنٹہ محنت کرنے کے بعد وہ مزدور تین سوراخ نکال چکا تھا۔

چھ سوراخ نکالنے کے بعد وہ اچھل کر مزدور کے کندھوں سے نیچے کودا اور ہمیں باہر نکلنے کے لئے ہدایات دینے لگا اس تمام کارروائی میں ہم اس کا پلان سمجھ چکے تھے اس لئے اسے ہمیں باہر نکلنے کے طریقے کے متعلق زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی۔

ابھی ہم باہر نکلنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں گڑھے کے اوپر ایک شور سنانی دیا ایسے لگا جیسے بہت سے افراد کسی غیر مانوس زبان میں تیز تیز بول رہے ہوں اور پھر یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کچھ ہی دیر میں وہ آوازیں گڑھے کے اوپر آن کرک لگیں اور کچھ بھینک چروں نے ہمیں گڑھے میں دیکھ لیا۔

ابھی ہم اپنے بچاؤ کے بارے میں کوئی منصوبہ یہاں ہی رہے تھے کہ زمین پر درختوں کی چھال سے بنی ری آن گری اور ساتھ ہی ہمیں ایک ناکھ میں آنے والی زبان میں کچھ کہا جانے لگا۔ اور ہمیں یہ سمجھنے میں قطعی دیر نہ لگی کہ وہ ہمیں اس ری کے سہارے اوپر آنے کا کہہ رہے تھے ہم سب نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظروں ہی نظروں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے اس ری کی مدد سے باہر نکلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم سب گڑھے کے باہر تھے۔ باہر نکلنے ہی ہمیں وہاں جھٹک دھڑنگ وحشی دکھائی دیئے جن کے چہرے ہمیں دیکھتے ہی گل اٹھے تھے وہ اپنے بھالوں کی انتوں سے ہمیں ایک طرف چلنے کا اشارہ کر رہے تھے ہم ان کے کہنے کے مطابق اس طرف چلے گئے جس طرف وہ ہمیں لے جانا چاہ رہے تھے۔

جنگل میں اب شام کے سائے گہرے ہونے چلے جا رہے تھے اور ان کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے جنگل سے نکل جانا چاہ رہے ہوں۔ جنگل کے اندر بنے ایک تنگ سے راستے پر چلے ہوئے جیسے ہی ہم ایک موڑ مڑے ہمیں ایک درخت نظر آیا جس کے کنارے پر مزید دو وحشی ہاتھوں میں بھالے تھے یوں کھڑے ہمیں آتا دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی اہم ہونی چیز دیکھ لی ہو۔ ہم تیزی سے چلے ہوئے ان کے نزدیک پہنچ

گئے ہمیں آتا دیکھ کر وہ وحشی سے سناچنے لگے۔ وحشی ہمیں لئے دوڑے کے اندر داخل ہوئے ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہم حیرت سے وہاں پہلے ہوئے خیموں کو دیکھ رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی تہذیب یافتہ دنیا میں آگئے ہوں سب خیمے ایک ترتیب سے بنے ہوئے تھے ان کی بناوٹ اور ان میں استعمال ہونے والا سامان سب کا سب ایک جیسا ہی تھا۔ لیکن ایک بڑی سی جمو پڑی جس کا سانس سب سے بڑا تھا ایک بہت ہی اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھی جس کے اوپر ایک لکڑی پر ہرن کی کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی یہ غالباً اس قبیلے کے سردار کی رہائش گاہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے ہم چلتے ہوئے ہستی میں داخل ہو گئے۔

جیسے ہی ہم ہستی کے وسط میں پہنچے جمو پڑیوں سے بچے اور عورتیں نکل کر اپنے اپنے گھروں کے باہر جھونکے لگے۔ وہ سب جن کے ساتھ ہم یہاں تک پہنچے تھے ہمیں لئے ایک طرف بنے ہوئے جمو پڑے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک کافی کشادہ جمو پڑی تھی جس کے اندر گھبریل کے بستر بچے ہوئے تھے ایک طرف ایک مذکا اور دو آب خورے بھی رکھے تھے۔ وہ وحشی ہمیں جمو پڑی میں چھوڑ کر وہاں لوٹ گئے۔ ہم کچھ دیر بیوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگے۔ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

تمام وحشی وسط میں ایک بھینک اور کردہ شکل کی عورت کے آگے دوڑاؤ بیٹھے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسکول ٹیچر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو کوئی سبق پڑھا رہے ہوں۔ وہ بھینک شکل عورت نچالنے کوئی زبان میں اشلوک پڑھ رہی تھی جو ان سب کی سمجھ میں آنے سے قاصر تھی۔ عورت نے اپنے دائیں ہاتھ میں کسی جانور کی ٹانگ کی ہڈی تھامی ہوئی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک خرگوش پکڑا اور تھا جو خوف سے تڑپ رہا تھا وہ اپنی ٹوکاس کے دوران بار بار جھنجکوں کو اس خرگوش کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی جس کے جواب میں جنگلی اس خرگوش کو دیکھ کر چیختے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے ایک ہاتھ سے اس خرگوش کا سر اس کے دھڑے سے علیحدہ کر کے دوڑ پھینک دیا۔

یہ دیکھ کر تمام جنگلی خیموں کی حالت میں زمین پر گر گئے۔ انہیں اس طرح دیکھ کر عورت نے ہاتھ میں جھونکا ہوا خرگوش کا دھڑا اپنے ہاتھوں سے نونچا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں خرگوش کے جسم کو اپنے پیٹ میں نگل گئی تھی۔

وحشیوں میں موجود ایک بوڑھا شخص جو اس کی یہ تمام کارروائی کو بغور دیکھ رہا تھا اس کے خرگوش کھاتے ہی اس نے کسی پرندے کے سر کی بنی ہوئی ایک وصل اپنے جیب سے نکالی اور فوراً اپنے منہ سے لگا کر زوردار پھونک مار دی۔ اس سر میں سے ایک تیز تیز نما آواز لگی اور زمین پر پڑے ہوئے تمام وحشی یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اگر انہیں ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی تو ان پر قحط ٹوٹ پڑتی۔ عورت نے بوڑھے شخص کو کوئی بات کہی تو سب اس کی آواز سن کر اس جمو پڑی کی جانب متوجہ ہو گئے جس میں اس وقت ہم سب قید تھے۔

شمان نے اٹھ کر جمو پڑی کی دیواروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا وہ جنگلی گھاس پھوس سے تیار کی گئی تھیں لیکن کافی مضبوط لگ رہی تھی اس نے کوئی تیز دھار قسم کے آلے کے لئے جمو پڑی میں نظریں دوڑائیں لیکن اسے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس کا استعمال کر کے وہ دیوار میں کوئی سوراخ بنا سکیں۔ تیسوڑی اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے اس کے نزدیک آیا اور کہنے لگا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں خود اسی زلے پر سوچ رہا ہوں لیکن میں رات ہونے کا انتظار کروں گا تاکہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم یہاں سے فرار ہو سکیں۔ اس لئے ہمیں چاک و چوبند رہنے کے لئے ایک دو گھنٹوں تک آرام کر لینا چاہئے تاکہ بعد میں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔"

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک جمو پڑی کا دروازہ کھلا ایک وحشی ہاتھ میں دو گھنٹوں کے اندر داخل ہوا پرندوں کے صرف پر صاف تھے یا بھونٹے ہوئے جل گئے تھے مگر جسم ثابت ہی تھے یوں لگتا تھا جیسے انہیں زندہ ہی بھونٹا گیا ہو۔

یہ دیکھ کر ایکائیاں آنے لگیں۔ وحشی نے اشارہ



کرتے ہوئے پرندے ایک طرف رکھے اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ انہوں نے پرندوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور سستانے کے انداز میں زمین پر بیچھے پھریل کے بستر پر بیٹھ گئے۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں ایک سکون کی سی کیفیت طاری ہو گئی انہوں نے اٹھ کر جھونپڑی سے باہر جھانکا تو باہر انہیں صرف ایک وحشی بھلا تھا۔ وہ دروازے پر پہرہ دیتے نظر آیا اور وہ بھی نیند کی وجہ سے جھوم رہا تھا۔ قسمت ان پر مہربان تھی انہوں نے دو مزدوروں کو اس پر نظر رکھنے کا کہا اور خود تینوں جھونپڑی کے آخری حصے کی جانب بڑھ گئے وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ٹھوڑی سی تلاش سے انہیں جھونپڑی میں ایک نوکی لکڑی مل گئی جس کی مدد سے انہوں نے دیوار میں سوراخ نکالنا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں پختہ ہو کر سوراخ بنانے میں کامیاب ہو گئے جس سے ایک شخص با آسانی گزر سکے۔ لکڑی ایک طرف رکھ کر وہ باری باری اس سوراخ سے باہر کی جانب نکلے لگے۔

جھونپڑی کے باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں چلتے ہوئے ایک جانب چل پڑے اندھیرے میں چلتے ہوئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے ان کا ایک غلط قدم انہیں موت کی دواوی میں لے جاسکتا تھا۔ ٹھوڑی دور تک چلنے کے بعد انہیں دور پہاڑیاں نظر آئی جو اندھیرے میں جنات کی طرح دکھائی دے رہی تھیں وہ انداز سے لے لیکن ذرا تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھنے لگے وہ جلد از جلد اس قہیلے اور وحشیوں کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ وحشیوں کو غالباً ابھی ان کے فرار کا پتہ نہیں چلا تھا ورنہ وہ ان کی تلاش میں نکل پڑتے دیے بھی رات کا چھپلا پھر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی طرف سے بے فکر تھے کہ رات کی تاریکی میں وہ وہاں سے بھاگنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے صرف ایک وحشی کوئی ان کی چوکیداری کے لئے کافی سمجھا تھا۔

تقریباً گھنٹہ چلنے کے بعد پہاڑیاں نزدیک آ گئی

تھیں یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پہاڑیاں میلوں فاصلے تک پھیلی ہوئی تھیں وہ اب دوڑنے کے انداز میں چل رہے تھے نزدیک پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ پہاڑیوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں آگ میں دھکا دیا ہو اور اس پاس پڑے چھوٹے بڑے پتھر بھی گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ عجیب نے یہ کوئی سرزمین تھی اس قسم کے پہاڑ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا پہاڑیوں کا سلسلہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی نے سیاہ رنگ کی چادر تان رکھی ہو۔

زمین پتھر کی تھی لیکن انہیں بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہو رہی تھی وہ مسلسل آگے کی جانب بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ کافی دور تک بھاگنے کے بعد وہ بہت دور نکل آئے تھے اور پھر اپنے سامنے نظر آنے والی ایک غار کے اندر داخل ہو گئے۔ غار کے اندر عجیب طرح کا نقش پھیلا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں چمکاؤں کو مار کر محفوظ کر لیا گیا ہو سانس تک لینا دشوار ہو رہا تھا یہ دیکھ کر وہ پلٹ کر دوبارہ غار کے دھانے کے قریب ہو گئے اور یہاں انہیں مکلی ہوا کی وجہ سے سانس لینے میں آسانی محسوس ہو رہی تھی۔

ساتھ ساتھ سب کو یہ بھی فکر سرائی تھی کہ وحشیوں کو جیسے ہی ان کے فرار کا پتہ چلا وہ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور اس بار اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گئے تو انہیں موت کے منہ سے کوئی نہیں بچا پائے گا اور یہ سوچ سوچ کر ان کے سانس خشک ہو رہے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور اجالا پھیلنے تک انہیں اسی غار میں ہی پناہ لینا پڑی۔ نیند کو لوں دور تھی انہیں صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے سہے سہے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ آسمان پر آہستہ آہستہ سپیدہ نمودار ہونے لگا اور ٹھوڑی دیر بعد صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔

روشنی پھیلنے سے غار کے اندر کا منظر بھی واضح ہو گیا تھا۔ ایک تنگ سارا سہ اس کے اندر دو تک جاتا نظر آ رہا تھا اندر اندر تھیرا ہونے کی وجہ سے آگے تک دیکھنا ناممکن تھا۔ یہ سوچ کر کہ غار کے دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ شاید اندر موجود ہو انہوں نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ

کر لیا۔ وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے غار کے اندر کی جانب بڑھنے لگے۔ ٹھوڑا سا اندر جاتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ پانی میں چل رہے ہوں اور جیسے جیسے وہ اندر بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے پانی گہرا ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ برابر آگے بڑھتے رہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ کمر تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور چلتے جا رہے تھے۔

غار شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوئی جا رہی تھی انہوں نے بھی تجاہد کر لیا تھا کہ اب چاہے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے وہ وہاں نہیں جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ ٹھوڑی دیر میں انہیں آس پاس کا منظر صاف دکھائی دینے لگا شاید باہر سورج نکل آیا تھا۔ غار کی دیواریں سیلن زدہ تھیں جن پر بھی ہوئی سبز کائی کی تہہ میں جم گئی تھیں پتھریں اپنی پچھلے آثار انھوں سے انہیں حیرت سے یوں دکھ رہی تھیں جیسے انہوں نے کسی انسان کو پہلی بار دیکھا ہو۔ سبز کائی کی وجہ سے ان کے جسم بھی سبزی مائل ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے رہے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے غار کشادہ ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی وہ چند فرلانگ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ دور انہوں نے ایک دھماکے کی آواز سنی۔ یہ لگا جیسے کوئی وزنی چیز پانی میں کودی ہو اور وہ انھیں بچاؤ کے اس طرف دیکھنے لگے جس طرف سے وہ آواز سنائی دی تھی لیکن بغور دیکھنے کے باوجود بھی وہ کچھ نہ دیکھ پائے۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ پانی پر دوڑتی ہوئی وہ عجیب مخلوق ان کے سامنے تھی۔ مگر کچھ کی شکل کا ایک عجیب جانور جس کی چھٹائیں اور جسم کبری کے قد کے برابر تھا تیزی سے دوڑتا ہوا ان کی طرف بڑھتا آ رہا تھا اسے اس طرح اپنی جانب آتے دیکھ کر انہوں نے غار کے پچھلے حصے کی جانب دوڑ لگا دی لیکن اس جانور کی رفتار ان سے کہیں زیادہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ اسے اپنے اتنا نزدیک دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر زمین پر گر گئے اور یہ نیچے گر گئے ان کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا اور وہ مخلوق

تیزی سے بھاگتی ہوئی ان کے آگے سے نکل گئی اپنی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے وہ کافی دور جا کر دوبارہ پلٹی۔

لیکن اس عرصہ میں وہ پہنچل گئے تھے انہوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اٹھائے اور جیسے ہی وہ مخلوق ان کے نزدیک پہنچی انہوں نے ٹاک کر اپنے اپنے ہاتھوں میں تھامے پتھر اس پر دے مارے۔ پتھر کی کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح اڑتے ہوئے اس کے جسم سے ٹکرائے اس اچانک افتاد سے بلا گھبرا کر ایک لمحے کے لئے رکی اور دوسرے لمحے چپٹی ہوئی غار کے اندر بھاگتی چلی گئی اس کی دود سے کراتی ہوئی آواز کی بازگشت بہت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ہم سب نے سکون کا سانس لیا اور اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ساری رات ایک طرف تو اس عفریت کے دوبارہ آنے کا خوف اور دوسری جانب وحشیوں کے ڈھونڈ لے جانے کا ڈر سنا رہا اور رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر کے اچالے کی جانب بڑھتی رہی۔ خوف و ہشت سے کسی کی بھی ایک پل کے لئے آنکھ نہ لگ کی وحشیوں کو شاید ان کے فرار کا پتہ چل چکا ہوگا اور وہ بھوکے پیٹھریوں کے طرح ان کی تلاش میں نکل پڑے ہوں گے لیکن ان پہاڑیوں میں ابھی تک ان کے پیچنے کے کوئی آثار تک نظر نہیں آئے تھے اس لئے کسی قدر مطمئن تھے لیکن وہ ساری عمر اب ان پہاڑیوں میں بھی چھپ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے اس لئے ان کا اجالا پھیلنے ہی انہوں نے غار سے نکل کر دوسرے ٹھکانے کی جانب پیش قدمی کا سوچا۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ دن کی روشنی غار کے اندر تک آنے کی وجہ سے انہیں اس کے اندر ان کی جانب ایک سرنگ نظر آئی جس کا دہانہ تقریباً چار فٹ چوڑا ہوگا اس کے منہ کے آگے ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی نے بھاگتے ہوئے اسے ٹکرا کر دہانے سے دور ہٹا دیا ہے۔ اور وہ کچھ گھمے گھمے والی عفریت شاید بھاگتے ہوئے اس پتھر سے ٹکرائی ہوگی اور اس کی زوردار ٹکر سے ہی یہ پتھر سرنگ کے منہ سے سرک گیا ہوگا۔

بہر حال انہوں نے اس پر مزید سوچنے میں وقت



ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس سرنگ کی جانب بڑھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس سرنگ کے ذریعے وہ اس غار سے نکلیں اور محفوظ جگہ نکل سکیں گے اور یہی سوچ کر انہوں نے سرنگ کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

غار کے سوراخ سے اندر کی جانب ایک ایک فرد جبکہ داخل ہو گیا اندر جاتے ہی انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہوا دار کمرے میں آگئے ہوں کہیں سے تازہ ہوا اس کے اندر آرہی تھی۔ یہ اندر سے تقریباً بارہ فٹ چوڑی سرنگ تھی جس کے سامنے کے رخ ایک بڑا سا ہل دکھائی دے رہا تھا اس ہل میں سورج کی روشنی کے آنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں دھول کے سینکڑوں بلب ایک دم روشن کر دیئے گئے ہوں۔ اور اس ہل تک پہنچ کر محسوس کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔

ہال کے دائیں ہاتھ ایک اور راستہ دکھائی دے رہا تھا جس میں جانے کے لئے تین سیرمیاں پتھر رکھ کر بنائی گئی تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ذی روح یہاں رہتا رہا ہو لیکن اس دور دراز جزیرے میں بھلا کون سر پھرا ہوگا جو یہاں رہائش اختیار کرنے کا سوچیں۔ انہوں نے کچھ فیصلہ کیا اور اس نظر آنے والے راستے میں داخل ہو گئے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں چار پانچ تانے کے بڑے بڑے صندوق رکھے تھے جن کے رنگ گردش نکل و تہار کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے اور ان پر موٹے موٹے نقل پڑے ہوئے تھے جن پر کالی جی ہوئی تھی۔

صندوقوں پر یوں نقش و نگار کھدے ہوئے تھے جیسے بادشاہوں کے وقت میں ایسے صندوقوں پر ہوا کرتے تھے "خدا کی پناہ اگر میں بھول نہیں رہا تو کیا یہ وہی خزانہ ہے؟" انھیں احمد نے حیرت سے چہچہے ہوئے کہا۔

"تم کس خزانے کا ذکر کر رہے ہو؟" تیمور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ایک تاریخی ناول میں پڑھا تھا کہ ایک معزول بادشاہ نے جسے بغاوت کے ذریعے حکومت سے ہٹا دیا گیا تھا اس نے کسی نہ کسی طرح سے کچھ خزانہ ایک بحری

جہاز کے کپتان کے ساتھ ساز باز کر کے اس کے جہاز میں رکھوایا تھا اور خود بھی بدل کر اسی جہاز میں ایک ملازم کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا خزانہ دھات کی دس بارہ بیٹھیلیں میں چھپایا گیا تھا یہ اس لئے کیا گیا تھا تاکہ خزانہ باحفاظت محفوظ جگہ پہنچ سکے۔

ایک روز بادشاہ نے اپنے خاص نائب کو نہ چاہتے ہوئے بھی خزانے کی حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ دونوں خزانے والے کیمین میں موجود تھے کہ سمندر میں طوفان آگیا۔ جہاز کیمین کی مانند موجوں پر ڈولنے لگا مسافر پریشانی اور گھبراہٹ میں اپنے اپنے بجائے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر لگی ہوئی تھی کسی کو کسی کا خیال نہ تھا اور اسی افراتفری میں کیمین سے بحری خزانہ آدھٹکے اور جہاز پر چڑھ کر لوٹ مار چادی اور جو ساز و سامان نظر آیا اسے لوٹ کر اپنے چھوٹے سے بحری جہاز میں بھرنے لگے۔

خزانہ جہاز کے نیچے بنے ہوئے ایک خفیہ تہہ خانے میں چھپایا گیا تھا اس لئے ان کی نظروں سے اوجھل رہا اور عام طور پر دیکھنے میں نظر نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر تک خزانہ لوٹ مار کرتے رہے اور دوبارہ اپنے جہاز میں سوار ہو کر فرار ہو گئے۔

جہاز کے بچ جانے والے مسافروں میں راشد علی نام کا ایک جوڑا بھی تھا جو اپنی شادی کے بعد گھومنے پھرنے کے ارادے سے یورپ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ جہاز پر موجود تقریباً ہر مسافر ان بحری خزانوں کی لوٹ مار کا شکار بنا تھا۔

راشد علی خزانوں سے چھپتا ہوا نیچے بنے ہوئے تہہ خانے تک پہنچ گیا تھا اور اسے اس بات کا بالکل احساس تک نہ ہوا کہ وہ اس وقت ایک بہت بڑے خزانے کے قریب کھڑا ہے۔

تہہ خانے میں ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی دکھائی دی جس پر ایک پر پھڑ پھڑانی فاختہ کی تصویر تھی اور اس پر کراس کا نشان بھی بنا ہوا تھا اسے اس تصویر کے یہاں لگانے کا مقصد یہ تھا کہ خزانہ اس کے خیالی میں چھپا ہوا اس کے نزدیک پہنچ کر کھڑ گیا۔

ابھی وہ غور سے اس تصویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک جہاز کا ایک جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا ہو۔ لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لئے ہوا اور پھر یکدم ایک مہمیر خاموشی چھا گئی۔ یہ دیکھ کر راشد علی نے اس تصویر کو جھلکے سے دیکھا تو وہ ایک ڈھکن کی مانند پراٹھ گئی اور اس کے اندر ایک اور کمرہ بنا ہوا تھا جس میں جھانکنے سے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے اندر چھ سات جستی بیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں تاکہ اس کمرے کے اندر جانے کا کوئی اور راستہ مل سکے جلد ہی اسے اپنی بائیں جانب اسی طرح کا ایک دروازہ نظر آ گیا۔ اس نے اسے بھی اندر کی طرف دھکیلا تو وہ بھی ایک ڈھکن کی مانند پراٹھ گیا۔

دھونچ چڑھا اور چھ فٹ لمبا ایک راستہ اب اس کمرے کی طرف جانے کے لئے بن گیا تھا۔ وہ اس میں داخل ہوا تو سب بیٹھیلیں پر نقل پڑے ہوئے تھے اس نے آگے بڑھ کر ایک پتی کا جائزہ لیتا چاہا کہ اچانک جہاز ایک پینڈلم کی مانند ڈولنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ بیٹھیلیں میں شاید کوئی خاص چیز بند ہے انسانی فطرت دیکھیں کہ اسے اپنی بچانے کی بجائے پتلی کھول کر دیکھنے کا شوق چلانے لگا۔ حالانکہ جس کسی کی بھی وہ بیٹیاں ہوں گی وہ بھی شاید اب تک اپنی جان بچانے کی فکر میں جہاز سے نیچے چھپ چکی جانے والی کسی میں کو دچکا ہوگا۔

راشد نے تھوڑی سی تلاش سے ایک لوہے کا موٹا ڈنڈا حاصل کر لیا اور اس کی تین چار ضربوں سے تالا ٹوٹ کر لنگ گیا اس نے ڈنڈا ایک طرف پھینکا اور پتلی کا ڈھکن اوپر اٹھا دیا یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پتلی باب سونے کی اشرفیوں، ہیرے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھکن بند کیا اور دروازہ بند کر کے جلدی سے باہر نکل آیا اور سیدھا اپنے کیمین کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

اس نے تمام بات بیوی کو بتائی اور وہیں رہنے کا کہہ کر خود جلدی سے کیمین سے باہر نکل آیا اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا اور پھر جلد ہی اسے اپنے مطلب کے

آوی نظر آ گئے جن کی اسے تلاش تھی اس نے سات آٹھ ملازموں کو دولت کا لالچ دے کر اسے ساتھ ملا لیا تھا جس میں یہ طے پایا تھا کہ وہ ایک مضبوط کشتی کا بندہ دست کریں گے اور اسے چپکے سے پانی میں اتار کر لوگوں کی نظروں سے بچا کر خزانے والی بیٹھیلیں جہاز سے دور لے جا کر کسی جزیرے پر چھپا دیں گے۔ اور کچھ ہی دیر میں ان ملازموں نے ربڑ کی ایک کافی بڑے سائز کی مضبوط کشتی رسوں کے ذریعے سمندر کے پانی میں اتاری اور باری باری چھ بیٹھیلیں رسوں کی مدد سے کشتی میں اتارنے لگے۔ اس کام میں انہیں بمشکل ایک بڑھ گھٹنہ لگا ہوگا۔

جہاز پر ایک افراتفری کی ہی کیفیت طاری تھی ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی پڑی ہوئی تھی اس ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خاموشی سے اپنا کام مکمل کر لیا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی۔ پھر وہ سب بھی باری باری کشتی میں اترتے گئے اور جب تمام افراد کشتی میں پہنچ گئے تو وہ جلدی جلدی چھوڑ کر کچلا تے ہوئے کشتی کو جہاز سے دور لہجانے لگے۔

اسی اثناء میں انہوں نے دیکھا کہ جہاز اب سامنے سے سمندر کے پانی کی جانب جھٹکنے لگا تھا جس سے اس کے عرشے پر بھاگتے ہوئے افراد کیمین کی طرح سمندر کے کنارے پانی میں گرنے لگے۔ اور جہاز کچھ بہ لگہ سمندر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور وہ سب بے بسی کی تصویر بنے اسے دیکھ رہے تھے۔

جہاز کافی بڑا تھا اس لئے اپنے وزن کی مناسبت سے تیزی سے غرق ہو رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سمندر ان کی نظروں کے سامنے اسے یوں نکل گیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اب وہ تھے اور ان کے سامنے بے کراس پھیلا ہوا سمندر تھا۔ انہوں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور کشتی کو باری باری چھوڑ کر مدد سے آگے دھکیلنے لگے۔

ملازموں نے یہ عقلمندی ضروری تھی کہ اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان جو کہ بندوؤں میں تھا وہ رکھنا نہ بھولے تھے ایک گتے کے کارٹن میں بہت سے خوراک کے

ڈبے اور کافی مقدار میں منرل و اثری بوتلیں تھیں۔ وہ چونکہ بحری جہاز کے ملازم تھے اس لئے سمندر میں کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ کشتی پانی کی لہروں سے ٹھٹھکی ہوئی ایک جانب جھومتی تھی۔

راشد علی نے اپنی بیوی کو بھی کشتی چلانے کا طریقہ سمجھا دیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس وقت سمندر میں ہیں اور کبھی وقت نامساعد حالات کا سامنا ہو سکتا ہے اس لئے ہر کسی کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

وہ کشتی چلانے والے ایک ملازم کے پاس آن کر بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ”کیا خیال ہے ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

”میرے خیال میں ہم کوس آئی لینڈ کی مغربی پٹی کے نزدیک سے گزر رہے ہیں“ اس ملازم نے کہا اس پر نظریں جماتے ہوئے بڑے بوقوع سے جواب دیا۔

”کوس آئی لینڈ“ یہ کوئی جگہ ہے؟ راشد نے دوبارہ پوچھا۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بحری جہاز کے کپتان گزرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس جزیرے پر جاہجا مقناطیس کے پہاڑ ہیں اور اگر بھولے بھٹکے سے کوئی جہاز اس جزیرے کے نزدیک سے گزرے تو وہ مقناطیسی پہاڑ اسے اس طاقت سے اپنی طرف کھینچتے ہیں کہ وہ آتی زور سے ان پہاڑوں سے ٹکراتا ہے کہ پاش پاش ہو جاتا ہے اور لوہے میں بھاری بھر کم جہاز ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر سمندر کے پانی پر بھج جاتا ہے اور اگر وہ بھی اب اس وقت کسی لوے والی چیز میں سفر کر رہے ہوتے تو اس وقت تک ہماری ٹوٹی ہوئی لائیں سمندر کی مچھلیاں کھا رہی ہوتیں۔ فابری کشتی ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ ہیں۔“ ملازم نے چہو چلاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

اس کی یہ بات سن کر راشد علی حیرت اور ہشت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اس نے ملازم کی بات سن کر اس پر فوراً یقین کر لیا کیونکہ وہ ان راستوں پر آتا جاتا تھا اس لئے غالباً جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوگا۔

اب رات کا اندیرا پھیلنے لگا تھا اور آسمان پر بادل چھانے لگے تھے یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش ہونے لگے گی وہ اپنے بچاؤ کی ترکیب کرنے لگے کھلی کشتی میں سوار کھلے سمندر میں اور لوہے سے بارش ان کے لئے کافی مشکلات پیدا کر سکتی تھی وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا تک رہے تھے کہ بارش نہ پڑے۔ اور شاید وہ گھڑی قبولیت کی ہوگی کہ اچانک ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی پھر چند ہی منٹوں میں بادل یوں آسمان سے غائب ہو گئے جیسے وہ انہیں خوفزدہ کرنے کے لئے آسمان پر نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اور اطمینان سے بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات دیکھتے دیکھتے اپنا سفر ختم کر دی تھی اور دریا پر سہارے اپنی چمک کھو رہے تھے صبح کا سپیدہ آستہ آستہ اپنی پوجھل آنکھیں کھول رہا تھا۔ کشتی کو باری باری چلاتے انہیں کوئی ممکن محسوس نہ ہو رہی تھی اور خوراک کا بھی انہیں بہت فائدہ ہوا تھا جس کے کھانے سے انہیں اپنے جسم کو اتنا لگدے تھے اور وہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔

انہیں اس بات کی بے انتہاء خوشی تھی کہ ان کے ہاتھ ایک بہت بڑا خزانہ لگ گیا تھا جو ان سب کی قسمت بدل سکتا تھا اگر کسی طرح زندہ سلامت وہ سب اپنے اپنے وطن لوٹ گئے تو ان کی ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔ اس بات کو سوچتے ہوئے وہ اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ آپس میں ملے کر کے انہوں نے خوراک کو احتیاط سے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اگر ان کے پاس خوراک ختم ہوگئی تو انہیں بے بسی کی موت مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ صبح کا سپیدہ نمودار ہوتے ہی انہیں دور بہت دور ایک سیاہ لکیر نظر آئی اسے دیکھتے ہی ان سب کے منہ سے خوشی سے جھپٹیں نکل گئیں وہ سمجھ گئے کہ دور نظر آنے والی سیاہ لکیر کسی جزیرے کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔ انہوں نے تیزی سے کشتی کو اس جزیرے کی جانب چلانا شروع کر دیا جیسے جیسے وہ اس سیاہ لکیر کے نزدیک ہوتے چارے تھے ویسے ویسے سیاہ لکیر چوڑی ہوتی جا رہی تھی اور بہت

جلد انہیں اس پر لگے ہوئے درخت نظر آنے لگے۔ جزیرے پر سیاہ چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ہزاروں سال کی گردش میل و نہار کے باعث ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا جنہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ قریب جانے پر انہیں چٹانوں کے عقب میں عجیب و غریب قسم کے درخت نظر آئے جو انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔

وہ جلدی جلدی کشتی کو چلاتے اس جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھتے گئے کچھ ہی دیر میں کشتی نے جزیرے کے ساحل کی زمین کو چھوا اور کنارے سے ٹکرا کر رک گئی۔ کشتی کو ایک دہری کی مدد سے ایک بڑے سے پتھر سے مضبوطی سے باندھ کر ملازموں کی مدد سے خزانے کی جھیلوں کو ساحل پر اتارا گیا۔ خوراک کے بچے ہوئے ڈبوں کو بھی ایک طرف رکھ دیا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ڈبوں سے خوراک نکالی اور پیٹ بھر کر کھایا اور پانی پی کر کچھ دیر آرام کیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور جزیرے کی ریت پر دھوپ میں لیٹنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر تک آرام کرنے کے بعد اب وہ آستہ پیش آنے والے حالات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ اس پہلو پر بھی سوچ رہے تھے کہ اتنے بڑے خزانے کو اپنی دنیا میں کس طرح لے جائیں گے۔ یہ سوچ کر سب سے پہلے انہوں نے اس خزانے کو کسی محفوظ جگہ چھپانے کا فیصلہ کیا اور پھر سب پھیل کر چٹانوں میں نظر آنے والے غاروں کی طرف بڑھ گئے۔ غار اندر سے خالی تھے اور ان میں کسی قدر سیلن سی ہو رہی تھی غالباً ایسا سمندری طوفانوں کے آنے سے سمندر کا پانی چٹانوں کو روندنا ہوا ان غاروں تک پہنچنا ہوگا جن کی وجہ سے یہ غاریں سیلن زدہ ہوگئی تھیں اور ان کی دیواروں پر سبز کائی جم گئی تھی لیکن اس کے برعکس غار اندر سے کافی کشادہ اور ہوادار تھے کیونکہ وہاں کسی قسم کی ٹھنکن کا احساس تک ہوتا تھا انہیں یہاں آکر کافی سکون محسوس ہوا۔ انہوں نے ایک غار منتخب کیا اور اپنا سامان لا کر اس میں ایک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ غار کے باہر چمکیلی دھوپ اپنے پر چھایا لے ہوئے تھی۔

کچھ دیر تک سستانے کے بعد راشد علی غار سے نکلا اور باہر کا جائزہ لے کر دوبارہ اندر داخل ہوا اور اپنے ساتھ تین ملازموں کو لے کر دوبارہ باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ انہیں چوکس رہنے کا کہہ گیا تھا۔ بیوی کو اس نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسے کہہ گیا تھا کہ ان کی واپسی تک دوسرے ملازموں کی مدد سے آگ جلا کر ڈبوں کا کھانا گرم کر کے رکھے کیونکہ ٹھنڈا کھانا کھا کر وہ تنگ آ گئے تھے۔ اسی لئے اس نے اسے اپنے ساتھ بھیج دیا۔

جزیرے پر نظر آنے والے درختوں کے نزدیک پہنچ کر انہیں اس پر لگے ہوئے عجیب و غریب پھل نظر آئے جن کی شکل امرود کی طرح اور رنگ بنتر تھا جن میں ہلکی سی پیلے رنگ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ ”الیوا“ کے درخت تھے جو ایک جنگلی پھل ہے جس کا ذائقہ کیلا لیکن مزیدار تھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے ایک پھل توڑ کر منہ میں ڈالا تو اس کا ذائقہ انتہا پرانہ تھا جتنا وہ سوچ رہے تھے یہ دیکھ کر انہوں نے بہت سے پھل توڑ کر اپنی اپنی جیبوں میں بھر لئے اور انہیں غار کی طرف لوٹ گئے۔

پہلے تو انہوں نے سوچا تھا کہ جزیرے پر محسوس پھر کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ کوئی جنگلی خرگوش وغیرہ نظر آ گیا تو اسے شکار کر کے تازہ گوشت حاصل کر سکیں گے تاکہ بند ڈبوں کا کھانا کھا کر منہ کا ذائقہ تبدیل ہو گیا تھا لیکن اب ان پھلوں کو کھانے کے بعد انہوں نے سوچا کہ اس میں اپنے دیگر ساتھیوں کو شال کرنا چاہئے یہ سوچ کر انہوں نے جزیرے پر گھومنے کا پروگرام ملتوی کر کے واپس غار میں جانے کی کٹھالی تھی۔

خزانہ انہوں نے غار میں بنے ہوئے ایک کمرہ نما جگہ میں چھپا دیا تھا کہ اگر وہ زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اس خزانے کو اپنے ساتھ لے جائیں گے ورنہ اگر کبھی کوئی بھولے بسرے اس جزیرے پر آچکا تو شاید قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو جائے اور وہ یہ خزانہ حاصل کر لے۔ جزیرہ اتنا لمبا چوڑا نظر نہ آ رہا تھا کہ ان پر درختوں کی بہتات اور ہریالی بہت تھی۔ کسی قسم کا موڈی جالور بھی ابھی تک نظر نہ آیا تھا شاید وہ پورا جزیرہ نہ دیکھ



پائے تھے اور نہ ہی تمام غاروں میں بھانک سکے تھے۔

جزیرے پر پہنچے ہوئے انہیں دس بارہ روز ہو گئے تھے اس دوران دوسرے سمندری طوفان بھی آئے تھے لیکن غاروں کی وجہ سے انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا اس دوران وہ پہرہوں ایک اونچی چٹان پر بیٹھ کر دور سمندر میں دیکھا کرتے تھے کہ شاید بولے بھٹکے سے کوئی بحری جہاز اس طرف آنے لگے تو وہ اپنے اسٹیبلشمنٹ کے لئے بلائیں اور ساتھ ہی خزانہ بھی اپنے ساتھ لے جائیں مگر ہر روز گھنٹوں بیٹھے رہنے کے باوجود انہیں اب تک کوئی جہاز نظر نہیں آیا تھا۔

دوسری صبح کا سورج ان کے لئے خوشی کی نوید لے کر آیا کیونکہ جیسے ہی راشد علی غار سے نکلا تو دور سمندر میں اسے ایک جہاز نظر آیا جس کی چٹنی سے نکلنے ہوئے دھوئیں کو وہ دور سے ہی دیکھ رہا تھا اس نے جلدی سے ایک بلند چٹان پر چڑھ کر اپنی پیش اتاری اور زور زور سے اسے فضا میں ہلانے لگا اور شاید جہاز کے عرش پر کوئی دور بین سے جزیرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ جہاز نے اپنا رخ جزیرے کی طرف موڑ لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بین وقت پر غار سے نکلا اگر اسے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو اس جزیرے پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے وہ سب اپنی جان دے دیتے اسے اس بیسی مدد پر حیرت ہو رہی تھی۔

جہاز آہستہ آہستہ جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا اسے عرش پر ایک دو افراد کو کھڑے صاف نظر آ رہے تھے جو ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلار رہے تھے اس نے زوردار آواز سے اپنے دیگر ساتھیوں کو پکارا اور جزیرے پر سناٹا ہونے کی وجہ سے اس کی آواز اس کے ساتھیوں کے کانوں تک با آسانی پہنچ گئی اور وہ سب ایک کر غار سے باہر نکل آئے اور یہ دیکھ کر ان کی خوشی سے ہاتھیں کھل گئیں کہ ایک درمیانے سائز کا بحری جہاز ان کے سامنے تھا۔

راشد علی پہلے ہی ساحل پر کھڑے جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاز کنارے سے ڈراما وار ہی رک گیا تھا اور ایک رسی کی بنی ہوئی اس کے اندر سے باہر لٹکا دی گئی۔ جہاز سے دو افراد

کران کی جانب بڑھنے لگے اور یہ دیکھ کر ان کی سٹی کم ہو گئی کہ وہ شکل سے بحری قزاق دکھائی دے رہے تھے اور ان کے چہروں سے خفاش جک رہی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنی دائیں آنکھ پر کالی پٹی باندھ رکھی تھی نزدیک آ کر وہ کچھ پوچھنے لگے جواب میں انہوں نے انہیں تفصیل سے تمام حالات بتائے اور ان سب باتوں میں جان بوجھ کر خزانے والی بات سرے سے گول کر گئے یہ بات انہیں ہتا کر اتنے بڑے خزانے سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تھے انہوں نے سوچا کہ اگر وہ زندہ بچ گئے تو کسی طرح دوبارہ واپس آ کر خزانہ نکال کر اپنی دنیا میں لے جائیں گے۔

لیکن ان بحری قزاقوں کو بتانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بحری قزاقوں نے ان کی رام کہانی سننے کے بعد ان سب کی بھرپور تلاشی کی اور ان کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر جا کر ان کا سامان بھی قبضے میں کر لیا۔ سارا کچھ جاتا دیکھ کر انہوں نے ان کی منت سماجت کر کے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہا۔ انہیں بے ضرر سمجھتے ہوئے اور ان کے اس طرح منت سماجت کرنے پر شاید انہیں ترس آ گیا تھا اور وہ انہیں اپنے ساتھ جہاز پر لے جانے پر رضامند ہو گئے۔ جہاز اپنی منزل میں طے کرتا ہوا اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ جہاز سے اترتے وقت قزاقوں نے انہیں کچھ رقم دے دی تھی تاکہ وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ انہوں نے ان کی اس مہربانی پر شکریہ ادا کیا اور اپنی اپنی منزل کی طرف بڑھ گئے۔

راشد علی اپنے آبائی ملک مصر پہنچ گیا جہاں کچھ عرصہ زندگی کی بہاریں دیکھ کر وہ دونوں میاں بیوی ایک متحدری بنیادی کے شکار ہو کر اپنے خاں حقیقی سے جا ملے اس دوران راشد علی نے وہ تمام واقعات تفصیل سے ایک ڈائری میں تحریر کر دیئے تھے اور ساتھ ہی جزیرے پر خزانے کی موجودگی کا بھی ذکر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آڑی ترجیحی کلبوں سے ایک نقشہ بھی بنا دیا تھا۔ قزاقوں سے بات چیت کے دوران اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس جزیرے کا نام ”بلک آئی لینڈ“ یعنی ”کالا جزیرہ“ تھا۔ اس کی لکھی ہوئی ڈائری اس کے ایک دوست

کے ہاتھ لگی جوان دونوں میاں بیوی کی آخری رسومات کے لئے پہنچا تھا۔ اور بعد میں اس نے وہ ڈائری اپنے ایک ناول نگار دوست کو دے دی تھی کیونکہ وہ اس میں لکھے ہوئے تمام واقعات کو جھوٹا ہی سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے اس ڈائری میں بنے ہوئے نقشہ کو بھی غور سے دیکھنا گوارہ نہ کیا اور اس طرح یہ قصہ ایک داستان کی صورت میں بدل گیا اور خزانہ حاصل کرنے کی کسی نے کوشش تک نہ کی۔

مگر آج اس خزانے کو یہاں دیکھ کر مجھے ناول میں لکھی ہوئی تحریر یاد آگئی۔ افضال احمد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے ان کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو نہ بچاڑے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ سب اس کی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ یہ تک بھول بیٹھے تھے کہ وہ اس وقت کس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ باتوں کے دوران انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور یہ بھی خبریت رہی کہ ابھی تک شاید دشمنوں کو ان پہاڑیوں تک پہنچنے کا خیال تک نہ آیا تھا اور نہ اب تک وہ ان تک پہنچ کر انہیں پکڑ چکے ہوتے۔

غار میں تاریکی پھیلنے لگی تھی اور انہیں بھوک بھی ستر رہی تھی تو دور اور شان نے باہر جھانکا تو دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور انہیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی کوئی جانور یا پرند نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے غار سے باہر نکل کر کھانے کے لئے کوئی جھاڑی دلچسپی پھل وغیرہ یا کوئی جنگلی خرگوش کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ مدت کا اندھیرا پھیلنے سے ایسا ناممکن تھا۔

وہ ابھی واپسی کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک جانب چند قدم دور انہیں تین چار جھاڑیاں نظر آئیں جن پر کچھ لگا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ ان پر آلو بخارہ کی شکل کے پھل لگے ہوئے تھے جن کا رنگ گہرا زرد تھا اور ان پر سیاہ دھاریاں بنی ہوئی تھیں نہانے کی قسم کے پھل تھے۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کیونکہ وہ عجیب و غریب پھل کھانے کے لئے ان کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اگر وہ زہریلے پھل ہوئے تو؟ یہ سوچ کر وہ لرز کر رہ گئے۔ لیکن بھوک بھی ستر رہی تھی انہوں نے ایک دوسرے

کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے تیسروں نے ایک پھل توڑا اور اپنے دانتوں سے اسے تھوڑا سا کاٹا پھل کا چھلکا موٹا اور سیلا تھا اسے اپنے منہ میں کھائیں اس کا احساس ہوا تھوڑی دیر تک تو اسے بول محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی لیون کھایا ہو لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند لمحوں کے بعد اس کے منہ کا ذائقہ یوں بدل گیا جیسے اس نے شہد منہ میں اٹھ لیا ہو۔ یہ بات اس نے شان کو بتائی وہ بھی حیرت اور خوشی سے اس پھل کو دیکھنے لگا۔ میرے تسلی دینے پر اس نے جلدی جلدی بہت سے پھل توڑ کر اپنی جیبوں میں بھر لئے۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں اپنی جیبیں پھلوں سے بھر لیں اور واپس غار کی جانب پیش قدمی کی۔

غار میں آ کر ہم نے وہ پھل اپنے دیگر ساتھیوں میں بانٹ دیئے۔ انہوں نے بھی حیرے حیرے لے لے کر وہ پھل کھائے۔ ہم سب قدرت کے اس عجیب و غریب پھل اور اس کے ذائقے پر عجب عجب شکر کر رہے تھے۔ رات ہم نے اسی غار میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور حفاظت کے لئے دو اثر لوگو مقرر کرتے ہوئے لیجان کر سو گئے۔

صبح تک ہم کھوئے بچ کر سوئے رہے اور پھر اچانک غار میں پانی گرنے کے شور سے یکدم ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دور کہیں آبشار کا پانی غار کے اندر گر رہا ہو۔ ہم حیران تھے کہ اگر یہ آبشار ہی ہے تو اس کی آواز رات کو ہمیں کیوں سنائی نہ دی تھی۔ ہم نے اس طرف اپنی نظریں کھائیں جہاں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی تو دور ہمیں ایک سفید نشان جس کا سائز تقریباً ایک فٹ بال جتنا معلوم ہو رہا تھا دکھائی دیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ وہ اس سرنگ کا دہانہ ہوگا جو دور کی وجہ سے ہمیں چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم نے سکون کا سانس لیا اور مطمئن ہو گئے پھر ہم نے رات کے بچے ہوئے پھلوں کو اپنے معدے میں اتارا اور جلدی سے اس دہانے کی جانب پیش قدمی کی۔

دن کی روشنی پھیلنے کے باوجود غار میں گہما گہما اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور جا بجا پتھر بھی ہمارے پاؤں سے



نکمر ہے تھے ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہے تھے اور یہ احتیاط ہی ہمارے کام آگئی کہ اچانک ایک موڑ مڑتے ہی ہمیں یکدم رکنا پڑا ہمارے سامنے ایک بہت بڑی کھائی تھی جس کا پائت کم و بیش بیس فٹ کے قریب ضرور ہوگا۔ اگر ہم احتیاط سے کام نہ لیتے تو اس وقت ہمارے جسم گوشت کے ٹکڑوں میں تقسیم ہونے ہزاروں فٹ گہری کھائی میں پڑے ہوتے۔ ہم نے کھائی کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ شاید کہیں سے کوئی راستہ دہانے کی جانب جانے کے لئے مل جائے مگر مدغم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں سے بھی کوئی رختہ یا پانی دکھائی نہ دی جس کے سہارے ہم اس کھائی کو پار کر کے دہانے کی جانب بڑھ سکتے۔

انہی ہم بھی سوچ رہے تھے کہ اچانک غار کے اس دہانے کی طرف سے بہت سی ٹلی چلی آوازوں کا شور سنائی دیا جہاں سے ہم اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر خوف و وحشت سے ہماری سانسیں رک گئیں ہم فرما سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ اسی قبیلے کے وحشی ہیں جو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اس غار تک آچکے ہیں۔ ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے ابھر ابھر نظریں دوڑائیں اور پھر ہمیں سامنے دائیں رخ ایک تنگ راستہ اندر جاتا دکھائی دیا ہماری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں حجب ہو چکی تھیں اس لئے کچھ سوچے بنا ہم نے اس تنگ راستے کی جانب دوڑ لگادی۔

یہ تقریباً بیس یا بیس تنگ دھڑنگ وحشی تھے جنہوں نے درختوں کے پتوں سے اپنے جسموں کو ڈھانپ رکھا تھا اور چہروں پر سرخ اور پیلے رنگ سے دھاریاں بنائی ہوئی تھیں ان کے ہاتھوں میں زہر پھینکنے والی نکلکیاں تھیں اور چہروں پر خباثت چھائی ہوئی تھی ان کی حرکات سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کی تلاش ہے اور اگر وہ اسے مل گیا تو وہ اسے کاچا چا جائیں گے۔ ان میں شامل ایک بوڑھا جس کے ہاتھ میں پرندوں کی کھوپڑیوں کی بنا ہوئی ایک ملا لنگ رہی تھی تیزی سے کچھ سوگھتا ان سے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کا رخ سیدھا غار کی طرف ہی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے غار میں سے ان کی خوشبو آ رہی ہو

اور پھر دوسرے وحشیوں کو لئے غار کے اندر داخل ہو گیا۔ غار میں موجود پھلوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے کوئی یہاں ٹھہرا ہو یہ دیکھ کر اس بوڑھے نے وحشیوں کو اپنی زبان میں کچھ کہاتے سن کر ان میں سے تین وحشی غار کے اندر طے کئے بھٹایا وحشی وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہ وحشی بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے اور انہیں کچھ کہاتے سن کر وہ بھی تیزی سے دوڑتے ہوئے غار سے باہر نکل گئے۔

تنگ راستہ مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا لیکن ہم بنا جادے کے سیدھے بھاگتے چلے جا رہے تھے تقریباً ایک میل تک دوڑتے رہنے کی وجہ سے ہمارے سانس دھونکی کی مانند چل رہے تھے لیکن ہمیں جانوں کی فکر تھی اس لئے اپنے بچاؤ کے لئے بھاگتے رہنے میں ہی عافیت تھی اور ہم جلد از جلد اس علاقے سے دوڑ نکل جانا چاہتے تھے۔

وحشی چونکہ اس علاقے کے باشندے تھے اس لئے ہمیں فکر تھی کہ کہیں وہ ہماری پوسھتے ہوئے ہمارے پیچھے نہ آ رہے ہوں۔ لیکن اتنی دیر بھاگتے رہنے کے باوجود انہی تک ہمیں سرنگ میں بھاگتے ہوئے صرف اپنے قدموں کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ وحشیوں کی طرف سے تسلی ہوتے ہی ہم نے کچھ آرام کرنے کا سوچا تا کہ دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کر سکیں۔

سرنگ میں اب سامنے سے تازہ ہوا کے چھوٹے آنے لگے تھے یہ دیکھ کر ہم خوشی سے ناچنے لگے کہ شاید اب ہم باہر نکلنے کے قریب تھے اور اس سرنگ کا دہانہ کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ یہ دیکھ کر ہم نے آرام کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور دوبارہ بھاگنے لگے۔ جلد ہی ہمیں اپنے اندازے کی داد دینا پڑی ہمارے ایک موڑ مڑتے ہی بائیں جانے ایک دو فٹ چوڑا اور تین فٹ اونچا سوراخ تھا جس کے باہر سے تازہ ہوا کے چھوٹے آ رہے تھے۔ ہم تیزی سے بھاگتے ہوئے اس سوراخ کے نزدیک پہنچے اور ایک ایک کر کے اس سے باہر آ گئے۔

سرنگ سے باہر آتے ہی ہمارے سامنے سرسبز میدانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس میں جا بجا جنگلی پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ

ایک ہی درخت پر کئی قسم کے پھل لگے ہوئے تھے جن میں سے کچھ کی شکل لہو تری، کچھ چوکور اور کچھ گول تھے اور ان کا سائز بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا اور رنگ میں بھی مشابہت نہ تھی ہماری معلومات کے مطابق پیندکاری تو ہم نے ہی تھی جس سے ایک درخت پر دو قسم کے پھل لے سکتے ہیں لیکن اس دور دراز علاقے میں اس طرح کے درختوں پر کس نے پیندکاری کی ہوگی یہ بات کچھ سے بالاتر تھی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ایک نزدیک کے درخت سے کچھ پھل توڑے اور انہیں کھلا اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ ان کا ذائقہ یوں لگا جیسے ہم نے تازہ روٹی کا ٹوٹا منہ میں ڈال لیا ہو۔ ہم قدرت کے اس کرشمہ پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ دنیا میں کہیں ایسے درخت بھی پائے جاتے ہیں جن کے پھلوں کا ذائقہ روٹی کی طرح کا ہو۔ بحر حال حقیقت ہمارے سامنے تھی اور ہم اس حقیقت کو جھٹکا نہیں سکتے تھے۔

ہم نے جلدی جلدی بہت سے پھل توڑے اور انہیں اپنی جھولیوں اور جیسوں میں بھر لیا۔ ان پھلوں کی وجہ سے کم از کم ہماری بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا ورنہ اس دیرانے میں ہمیں خوراک کہاں سے دستیاب ہوتی۔ خزانہ ہم نے وہیں غار میں ہی محفوظ کر دیا تھا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو دوبارہ واپس آ کر اسے لے جائیں گے مگر اس وقت تو اپنی جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے اس خزانے کو کہاں سمجھتے پھرتے اس لئے ہماری جانیں اس خزانے سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔

میدانوں میں مگی ہری بھری گھاس بہت بھلی لگ رہی تھی اور دور تک ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کا قالیق زمین پر بچھا دیا ہو۔ ہم جلد از جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہتے تھے کیونکہ جس طرح ہم اس سرنگ کے راستے یہاں نکل آئے تھے اسی طرح وہ وحشی بھی کس وقت ہمارے سروں پر پہنچ سکتے تھے۔ ہم کچھ دیر تک کھڑے چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتے رہے لیکن دور دور تک دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں ہم خود کو چھپا سکیں۔

اس عرصہ میں سورج ہمارے سروں پر آ پہنچا تھا اور ہم ابھی تک اس شیش و شیش میں تھے کہ کہاں جائیں۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے دیگر ساتھیوں کی تھی جو اپنے پیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ کر ہمارے ساتھ آئے تھے اور تمام مشکلات کو جھیلنے میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پھر ایک فیصلہ کرتے ہوئے ہم ناک کی سیدھ میں ایک جانب بڑھ گئے ہم نے سوچا کہ دیکھتے ہیں یہ میدانوں کا سلسلہ کہاں تک چلتا ہے اگر نصیب میں زندگی لکھی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں موت کے من میں نہ جانے دے گی۔

تین گھنٹوں تک پیدل چلتے رہنے سے ہماری حالت تلی ہوئی تھی پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے دل چاہتا تھا کہیں گر کر لمبی تان کر سو جائیں لیکن یہ سب کچھ صرف سوچنے کی حد تک ہی ٹھیک تھا کیونکہ اس وقت ہم بارود کے ڈھیر پر بیٹھے تھے وہ وحشی کسی بھی وقت ہمارے سروں پر پہنچ کر ہمارا نینو دا بکتے تھے اس لئے مسلسل چلنا ہماری مجبوری تھا آپس میں باہم صلاح و مشورہ سے ہم وقفے وقفے سے آرام بھی کر لیتے تھے تاکہ ہمارے جسم چست و تازہ رہیں۔

مسلسل دو دن اور دو راتوں تک سفر کرنے سے ہمارے پاؤں میں چھالے بن گئے تھے جو چلتے میں ہمیں تکلیف دے رہے تھے ایک جگہ سے گزرتے ہوئے ہمیں عجیب شکل کے پودے دکھائی دیئے جن کے زور رنگ کے پتے تھے ہم نے کچھ سوچتے ہوئے وہ پتے توڑ کر اپنے زخموں پر باندھ لئے ظاہر ہے ان دیرانوں میں ہمیں مرزم کہیں سے کئی اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ جہاں جہاں زخموں پر پتے باندھے تھے وہ زخم اس طرح بھرنے لگے جیسے کبھی ہوئے ہی نہ ہوں۔ ہم نے بہت سے پتے توڑ کر اپنے ساتھ لے لئے کہ شاید ان کی پھر بھی ضرورت پڑ جائے ان عجیب پتوں نے ہمارے زخموں کو پل بھر میں ٹھیک کر دیا تھا اور ہمیں اپنے زخموں میں ایک خشک کا احساس ہو رہا تھا ہم خدا کی طرف سے اس بروقت مدد کا شکر ادا کر رہے تھے۔

چلتے چلتے ہم ایک ایسے علاقے سے گزرے

جہاں ہمیں ایک اور عجوبہ نظر آیا ہم حیرانی سے ان بلی نما جانوروں کو دیکھ رہے تھے جو اپنے سروں پر ایک نوکدار ہینک لئے اچانک نمودار ہوئے تھے ان کی تعداد کم از چالیس پچاس کے قریب تھی ان کا رنگ خاکستری اور نیلا تھا اور ان کی آنکھیں گول کی بجائے بیضی تھیں اور ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں سرمہ لال دیا ہو۔ بڑی عجیب نسل کے جانور تھے جو اس باس موجود چھوٹے چھوٹے پودوں پر لگے اسروہ کی شکل کے پھل یوں رغبت سے کھا رہے تھے جیسے وہ ان کا سن پسند کھا جا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے منٹوں میں بہت سے پودے اچاڑ دیئے اور بھر جی تیزی کے ساتھ ان کے سامنے آئے اسی تیزی کے ساتھ واپس دوڑ گئے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ کر نیند سے جاگے ہوں۔

”خدا کی پناہ! میں نے تو اس قسم کے جانوروں کے متعلق کہیں نہیں پڑھا شاید یہ نسل اس علاقے میں ہی پائی جاتی ہو چونکہ یہ علاقہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں اس لئے کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔ شان نے جبر جبری لیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! میں بھی یہی کہنے والا تھا میں خود اس قسم کے جانور پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

ٹھوڑی دیر تک سستانے کے بعد ہم دوبارہ چلے گئے اس دوران ہم وقفے وقفے سے اپنے پیٹ کی آگ بھی بجھاتے رہے تھے اس لئے زخموں کے پھر جانے اور پیٹ پھر جانے کی وجہ سے ہماری رفتار تیزی سے کم ہوتے ہوئے چھوٹے ٹیلوں کی بجائے وہ چھوٹی چھوٹی میالے رنگ کی ٹیلیاں تھیں جن میں جابجا سانپوں یا نیولوں کے بل بنے ہوئے تھے ہم ان سے دور دوری رہے اس سرزمین پر کب اور کیا واقعہ ہو جائے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ شام کے سامنے گھر سے ہو چلے تھے دور دور تک کوئی زری روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سورج مغرب میں غروب ہوتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے تاجے کی کوئی چمک دار پلیٹ کسی نے آسمان پر جڑی ہو چل کر ٹھکن سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا ابھی تک ہم ایک دوسرے کی بہت بندھا تے چلتے رہے تھے لیکن اب ہمیں محسوس ہوا تھا کہ رات کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی مناسب ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا ورنہ ہم ان

دیرانوں میں ہی اڑیاں بڑھ کر گڑ گڑ کر موت کو گلے لگا لیں گے۔ ابھی ہم اسی جگہ پر سوچ رہے تھے کہ تیرہویں کی نظر نیچے زمین پر پڑی تو اس کے ہوش اڑ گئے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جی ہاں! زمین کا رنگ شام کے سامنے پھیلتے ہی سیاہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام زمین سیاہ رنگ میں بدل گئی اس پر اُسے ہونے چھاڑ دیا اور اپنی رنگت سبز سے سیاہ میں بدل چکے تھے۔ زمین کا رنگ سیاہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا مزید بڑھ گیا تھا اور ہمیں چلنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ ابھی ہم آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ہماری نظروں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا ہمیں یوں لگا جیسے زمین پر آگے ہوئے پودے چلنے لگے ہوں اور زمین پر بڑے پتھر ادھر ادھر لڑھکتے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زلزلہ آنے والا ہو لیکن ایسا صرف چند لمحوں تک ہی ہوا اور پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔

موت کی سی خاموشی ہمیں اپنے دلوں کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی اور پھر ہمیں اس پراسرار خاموشی سے وحشت ہونے لگی ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ ہم دھاڑیں مار مار کر روئیں اور کوئی ہمیں جپ کر دے والا بھی نہ ہو۔ مگر ایسا ہم صرف سوچ سکتے تھے کیونکہ عملی طور پر ہم ایسا کرنے سے معذور تھے کیونکہ باوجود ہزار کوشش کے ہم منہ تک نہ کھول پائے ہمیں ایسا لگا جیسے کسی پراسرار طاقت نے ہم سب کے منہ پر کوئی ٹیپ لگا دی ہو۔

ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ انہوں نے دور سے بھیڑیوں کے چیخنے کی آوازیں سنیں بہت سے بھیڑیے مل کر چیخ رہے تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہوانے انہیں ان کی موجودگی کا پتہ دے دیا ہو۔ ہم خوف سے تھوک نچلتے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب کچھ ہی لمحوں میں ہم موت کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ خوفناک ویرانہ اور خوفناک بھیڑیے اور وہ سب خالی ہاتھ۔ ہمارے انجام کا اندازہ لگانا مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور کچھ ہی دیر میں خوفناک بھیڑیوں کا ایک غول دوڑنا ہوا ہمارے سامنے نمودار ہوا اور جیسے ہی انہوں نے ان پر حملہ کرنا چاہا یکدم نیلے رنگ کا

دھواں اُٹا ہوا ہمارے سامنے آ گیا۔

دھواں میں ایک عورت کی شبیہ واضح نظر آرہی تھی جسے دیکھتے ہی بھیڑیے دم بجا کر بھاگ گئے۔

ہم سب حیرت سے اس دھواں کو اور اس میں نظر آنے والی مخلوق کو دیکھ رہے تھے جس نے برکت پہنچ کر ہمیں بھیڑیوں کی خوراک بننے سے بچا لیا تھا۔ ”چنگل کھوری اس سرزمین پر خوش آمدید کہتی ہے یہ جیروں کی سرزمین ہے یہاں پر جیروں ہونے والا ایک دردناک عذاب کا شکار ہوتا ہے یہ ”شگورن“ کا علاقہ ہے۔ میں بھگتے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتی ہوں جنہیں مصیبت میں دیکھا تو مدد کے لئے آچکی“ اس نے ان کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

لیکن افضال کی نظریں اس کے پیروں پر پڑی ہوئی تھیں جس نے زندہ کچھڑوں کو جیروں کی طرح اپنے پیروں میں پکڑ رکھا تھا اور جب وہ وقفے وقفے سے پاؤں پر زور دیتی تو پل بھر کے لئے پھوٹے اپنی گردنیں باہر نکالتے اور دوبارہ اندر کر لیتے یہ سب دیکھ کر افضال احمد نے شان کو اور تیرہ کو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ منظر دکھایا۔ یہ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ ہمیں دھوکا دیا جا رہا ہے اور قصہ کچھ اور ہے ہم نے جلدی سے اپنے اپنے گھٹے میں پہنچے ہوئے تھوید کا رخ اس مخلوق کی جانب کیا تو وہ چپٹی چلائی یکدم غائب ہو گئی اور ہم نے سکون کا سانس لیا۔

رات کافی گہری ہو چلی تھی ہم نے کھوم پھر کر کوئی جائے پناہ تلاش کرنا چاہی تو دور میں ایک عجیب شکل کا مکان بنا ہوا دکھائی دیا ایک نظر میں یوں لگتا تھا جیسے کوئی اونٹ بیٹھا ہو ہوا مکان کا رنگ گہرا سیاہ تھا اس لئے شاید ہمیں پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ اس عجیب و غریب مکان کا کوئی دروازہ ہی نہ تھا سامنے کے رخ و داخلی دروازے پر دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے ستون بنے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ سے دھاریاں بنائی گئی تھیں غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ دھاریاں نہیں بلکہ سفید رنگ کے سانپ تھے جو ستونوں پر لیٹے ہوئے تھے ایسا اس وقت محسوس ہوا جب انہیں وہ دھاریاں ملتی ہوئی محسوس ہوئیں تھیں۔

ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آیا مکان میں جانے کا رسک لیا جائے یا نہیں سے لوٹ جایا جائے اور کوئی اور ٹھکانہ تلاش کیا جائے۔ ابھی ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ وہ سیاہ مکان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور اس کے اندر سے وہی عفریت ”چنگل کھوری“ برآمد ہوئی اس کے چہرے پر خبیث جھانک ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں کا رنگ گہرا سرخ تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ خونخوار بلا ابھی ابھی تازہ خون پی کر آئی ہو اس کی ہاتھوں سے خون کے قطرے بھی ٹپک ٹپک رہے تھے اس کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ انہیں دیکھ کر غصے سے تلملارہی ہو۔

وحشی غار سے نکلے ہی سیدھے جنگل میں جانے والے راستے پر بھاگتے چلے گئے وہ جلد از انہیں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں بہت پہلے ہی تلاش کر لیتے لیکن انہیں ان کے فرار ہونے کا پتہ بہت دیر بعد چلا جب ہمارے وار وحشی انہیں دیکھنے کے لئے جھوپڑی میں داخل ہوا۔ جھوپڑی میں انہیں نہ پا کر اس نے شور مچایا اور پھر سارے ٹیلے میں ان کے فرار کی خبر پھیل گئی اور بیس بائیس خونخوار وحشی ان کی تلاش میں نکل پڑے وہ انہیں تلاش کرتے کرتے کالی پہاڑیوں تک جا پہنچے تھے لیکن انہیں وہاں نہ پا کر وہ واپس جنگل کی طرف بھاگ گئے اور انہیں غار کے اندر رہی ہوئی سرنگ کا خیال نہ آیا اور نہ اگر وہ اس کے ذریعے با آسانی ان تک پہنچ سکتے تھے۔

جنگل طویل ہونے کی وجہ سے انہیں بہت تیزی سے سفر کرنا پڑ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر انہیں جنگل میں تلاش نہ کر سکے تو سیدھے ساحل پر جا کر چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور وہیں سے انہیں شکار کر کے اپنے قبیلے کے لئے خوراک کا بندوبست کریں گے۔ ”چنگل کھوری“ کو دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے ہم اس کو اس طرح اپنے سامنے یوں اچانک دیکھ کر ٹھنک کر رک گئے۔ پھر اچانک ایک خیل نکلتے آتے ہی تیور نے دوبارہ تھوید کی جانب ہاتھ بڑھایا دیکھتے ہی ایک ایک پتھر زوردار آواز سے اس کے دائیں ہاتھ پر پڑا وہ ٹکڑا کر پیچھے کی جانب بھاگا اور یہ جھٹکتا ہی اس کے لئے فائدہ مند



ثابت ہوا اور ایک گول کڑا جس کے چاروں طرف تیز دھار دندانے بنے ہوئے تھے اس کی کمر سے شاخیں شاخیں کی آواز نکلتا ہوا اس کے پیچھے نظر آنے والے درخت کے تنے میں بیوست ہو گیا۔

اس عفریت نے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر وار کر دیا تھا شان نے قریب پڑا پتھر اٹھا اور تاک کر اس عفریت پر دے مارا پتھر اڑتا ہوا سیدھا اس کی پیشانی پر لگا اس نے ایک جھٹکا کھاتے ہوئے خود کو سنبھالا اور اپنا دایاں ہاتھ ان کی جانب کر کے ایک جھٹکا دایاں کے ہاتھ سے جن کی انگلیاں سانپوں کی مانند لہرا رہی تھیں شعلے اگتی ہوئی ان کی طرف بڑھیں۔

یہ دیکھ کر ہم سب نے خود کو ان سے بچایا اور بھاگتے ہوئے سامنے نظر آنے والے مکان کے کھلے حصے سے اندر داخل ہو گئے۔

جنگل میں پوری طرح تلاش کر لینے کے بعد تمام وحشی ساحل پر موجود درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ گئے وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کا شکار آخر کار نہیں سے ہی واپس جائے گا ان میں موجود ایک بوڑھے وحشی نے قضائیں کچھ سوچتے ہوئے انہیں ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانا چاہا جسے وہ تمام سن کر پریشان ہو گئے۔ بوڑھا جیسے جیسے تفصیل بتاتا تھا ویسے ویسے وہاں موجود وحشی خوف و وحشت سے آنکھیں پھاڑے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ بوڑھے نے انہیں بتایا کہ ”فرار ہونے والوں کی تلاش میں جانے والے افرار کے متعلق وہاں کے قبیلے کے سردار نے اسے خبردار کیا تھا کہ اگر وہ سب ناکام لوٹتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ ان کے بیوی بچوں کو بھی زندہ آگ میں جھونک دیا جائے گا تاکہ سورج و پیمانہ کی جینٹ لے کر ان کے قبیلے پر آئندہ والی معصیت نہ مل سکے اس لئے ان کی اور ان کے گھر کے دیگر افرار کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ جیسے جیسے کر کے فرار ہونے والے افرار کو تلاش کر کے واپس قبیلے میں لے جائیں۔“ ..... بوڑھے نے لمبا سانس لیتے ہوئے بات ختم کی۔ بوڑھے کی اسی بات نے ہی ان سب وحشیوں کا خون خشک کر دیا تھا اس لئے انہوں نے ان سب کی واپسی تک

نہیں انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا جس میں داخل ہوتے ہی ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی تیز رفتار گھومتی ہوئی چکی پر بیٹھ گئے ہوں ہم سب نے سنبھلنے کے لئے ابھی قدم جمائے ہی تھے کہ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہم سب سروں کے بل اُلٹے پاتال میں گرے چلے گئے ہمارے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں لیکن جیسے جیسے ہم نیچے گرتے جا رہے تھے کمرے میں بے پناہ شور مچنے لگا جس میں ہم سب کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔ کافی دیر تک نیچے گرنے کے بعد چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی ہم پانی میں جا گرے۔ پانی اس قدر مضبوط تھا کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی برف کے کارخانے میں داخل ہو گئے ہوں اور سردی سے ہمارے دانت جتنے نکلے اور اسی کیفیت میں ہماری آنکھیں پوچھل ہوئے نکلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم پرینڈ کا غلبہ طاری ہوا اور ہم سب کسی مردہ سانپ کی طرح پانی کی سطح پر تیرنے لگے شاید ہماری زندگی کا چراغ بجھ گیا تھا۔

دن کا ابالا پھیلنے ہی میں ہوش آ گیا لیکن اب ہم پانی کی بجائے ایک سرسبز علاقے میں تھے ہمارے کپڑے پھینکے ہوئے تھے لیکن اب ہمیں سردی محسوس نہ ہو رہی تھی ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور کچھ دیر تک نیند کی سی کیفیت میں ادھر ادھر دیکھتے رہے لیکن اپنے سامنے کے منظر پر نظر پڑتے ہی ہمارے ہوش ٹھکانے آ گئے ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہاں دیکھ رہے تھے۔

ہمارے سامنے پرگلا کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے موٹے تنے کے ساتھ ایک دودھیا رنگ کا اور نیلا دھاری دار اڑوا دھا لپٹا ہوا تھا وہ جس درخت کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اس کے نیچے ایک پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی جس کی شکل گول تھا بلکہ نامی اس کے درمیان ایک ذرو رنگ کا پتھر کا پیالہ رکھا تھا جس کے کناروں میں دودھ کنڈے لگے ہوئے تھے ان کنڈوں کے ساتھ ایک سفید رنگ کی زنجیر بندھی ہوئی تھی جس کا ایک سر درخت کے پیچھے کی جانب جاتا دکھائی دے رہا تھا اڑوا دھا گردن جھکائے پیالے میں دیکھ رہا تھا جس

میں بجائے کہاں سے دودھ بھر بھر کر آ رہا تھا جسے وہ پینے میں مگن تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ ایک چھپا کا ہوا اور ”چنگل کھڑی“ پھر ان چنگلیں۔ ”اس سے پہلے کہ تم اس اڑوے کو ختم کرو جس میں میری جان ہے میں تم سب کو جلا کر بھسم کر دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ان کی طرف اپنی انگلیاں جھنجکیں۔ ہزار رنگ کی لہریں تیزی سے ان کی جانب بڑھیں اور سیدھی تیبو علی کے سینے پر پڑیں اسے یوں لگا جیسے کسی نے لوہے کی گرم سلاخی اس کے سینے میں دھنسا دی ہوں۔

وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا یہ دیکھ کر شان اور افضل نے بھاگ کر اسے تھامنا چاہا لیکن وہ کسی ریت کی خلی ہوئی ہوئی پوری کی مانند ان کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے تھے یوں لگتا تھا جیسے اسے انتہائی تکلیف ہو رہی ہو۔

شان نے جلدی سے اس کے سینے کو مسلتا شروع کر دیا اور میں نے اس کے پاؤں کے تکیاں تلوے سلنے لگا۔ وہ عفریت در کھڑی تھیں لگا رہی تھی اور ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی یہ دیکھ کر شان نے جلدی سے تیبو علی کے گلے سے تعویذ اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اللہ کا نام لے کر اس کا رخ اس بلا کی جانب کر دیا۔ شاید قدرت کو ہماری بے بسی پر رحم آ گیا تھا اس لئے جیسے ہی اس نے تعویذ کا رخ اس کی طرف کیا ایک سفید ہلاسا پھراتا ہوا اس عفریت کی جانب بڑھا اور سیدھا اس عفریت کے گلے میں جا کر فٹ ہو گیا مگر یہ دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ اسی طرح ایک طرف کھڑی تھیں لگا رہی تھی۔

اور پھر ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح شان کے دماغ میں آیا کہ اس کی جان تو سامنے موجود اڑوے میں پوشیدہ ہے یہ خیال فوراً آتے ہی اس نے تعویذ کا رخ دوبارہ اس اڑوے کی جانب کر دیا اور اسی طرح ایک گول پتھر تیزی سے گھومتا ہوا گیا اور اس بار اڑوے کے منہ پر جا کر فٹ ہو گیا۔

اڑوہا جو دودھ پینے میں مصروف تھا اچانک اڑاؤ سے گھبرا گیا اور اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور گول کڑے

نے اس کی گردن میں فٹ ہوتے ہی تنگ ہونا شروع کر دیا اور فوراً تھیں تک پہنچی کہ اس کا سار ایک رات تک ہو گیا اور اڑوے کی گردن پچک کر رہ گئی اور دوسری طرف ”چنگل کھڑی“ یہ دیکھ کر چیختی چلائی اس کی طرف بھاگی مگر چند قدم دور آ کر لہر آ کر گر گئی اور اس نے اپنی گردن کو یوں پکڑا ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن کو کسی مضبوط شکنے میں پکڑ رکھا ہو۔ اس عرصے میں افضل کی کوشش رنگ لائی اور تیبو علی نے ایک سانس لیا اور اپنی آنکھیں کھول دیں اور جیسے ہی اسے سامنے کا منظر نظر آیا اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر افضل نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور پھر اسے وہاں بیٹھ جانے والے واقعات سے آگاہ کیا۔

اس عفریت کی موت کا سن کر تیبو علی نے اطمینان کی سانس لی اور شان کی بہادری پر اسے مبارکباد دی جس نے برکت مجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اور ان کی جانوں کو اس عفریت کی وحشت کا شکار ہونے سے بچایا۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے ساحل کی جانب جانے والے راستے کی تلاش میں تھے تاکہ وہاں سے کسی جہاز کی مدد سے اپنے ملک روانہ ہو سکیں مگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں کیونکہ چاروں طرف سرسبز زمین پھیلی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا جس پر چل کر ہم ساحل کی طرف جا سکیں۔

پھر یہ فیصلہ کر کے کہ وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کسی جانب پیش قدمی کی جائے اللہ تعالیٰ کوئی سبب ضرور پیدا کرے گا یہ سوچ کر سب نے مشرق کی سمت سفر شروع کر دیا چلتے چلتے شام ہو گئی اور ایک جگہ سنانے کے بعد ہم دوبارہ چل پڑے اسی طرح مزید دو تین گھنٹے چلتے کے بعد سامنے یوں لگا جیسے کوئی درختوں کے جھنڈ ہیں ان پر نظر پڑتے ہی ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کی جانب بڑھے جیسے جیسے ہم نزدیک ہوتے جا رہے تھے ویسے ویسے درختوں کے آثار واضح ہوتے جا رہے تھے۔ قریب جا کر ہم نے دیکھا کہ ان درختوں کے درمیان میں ایک تالاب بنا ہوا تھا۔ ہم خوش خوشی اس کی طرف دوڑے کہ شاید اس میں پانی موجود ہو لیکن یہ دیکھ کر ہماری خوشی باپوی میں بدل گئی کہ



اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکٹ بیٹ

پاؤڈر



تبت پریکٹ بیٹ پاؤڈر

گرمی دانوں سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس

وہ ایک سوکھا تالاب تھا جس میں جا بجا جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ان میں جنگلی چوہے دوڑتے پھر رہے تھے۔ سب اپنی قسمت کو کوسے ہوئے پلٹ کر درختوں کے نیچے آن کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سنانے کا سوچ کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ رات کا چھپلا پہر ہوگا جب شان کے پیٹ میں اچانک درد اٹھا اور وہ ہڑ ہڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں نکل رہی تھیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں فٹ بال چمیک دی ہو جو ادھر ادھر لڑھکتی پھر رہی ہو اس کی سسکاریاں اچانک چیخوں میں بدل گئیں اور اس کے اس طرح چیخنے سے اس پاس لیٹے دوسرے افراد بھی اٹھ گئے وہ اچانک اس ناگہانی اُفتاد پر یوگھلا کر شان کی طرف دیکھنے لگے جو بری طرح چیخ رہا تھا۔ شان بار بار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انتہائی کرب کی حالت میں ہو۔

یہ دیکھ کر تیمور بھاگ کر اس کی جانب بڑھا اور اس کے پیٹ کو بڑکڑا لے گا اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گول مٹول شے اس کے پیٹ میں کودتی پھر رہی ہو اسی دوران شان پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی ہم نے جلدی سے اسے ایک درخت کے نیچے لے جا کر لٹا دیا اس کا پیٹ اسی طرح پھول اور پچک رہا تھا کہ تیمور نے کچھ سوچ کر جیسے ہی دونوں ہاتھوں سے اسے دوپونچ کر دیا شان کا منہ ایک لمحے کے لئے کھلا اور ایک دھواں سا اس کے منہ سے نکل کر فضا میں ایک شہیہ کی صورت میں اُٹھنے لگا جلد ہی اس نے ایک وجوہ کی شکل اختیار کر لی۔

وہ ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا پتلا تھا جس کا رنگ رات کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا اور اس کی گول گول آنکھیں بنام چٹلیوں کے ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھیں جنہیں دیکھ کر وحشت طاری ہوتی تھی۔ ”مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تم نے شہرین کے علاقے میں گھسنے کی جرأت کیسے کی؟“ اس پتے کے منہ سے ایک پتلی آواز نکلی۔

ہم سب سکتے کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے یہ سنتے ہی جیسے ہوش میں آگئے ہم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے درختوں کے باہر کی طرف

